انٹرنیشنل

چیف ایڈیٹر: وحشی سعید

ادب نامہ (مع گوشہ عمر مجید مرحوم)

عمر مجید (مرحوم)

۱۸ ستمبر ۱۹۴۰ تا ۲۳ دسمبر ۲۰۰۸

Kashmir Treasures Collection, Srinagar

CC-0. In Public Domain. Digitized by eGangotri

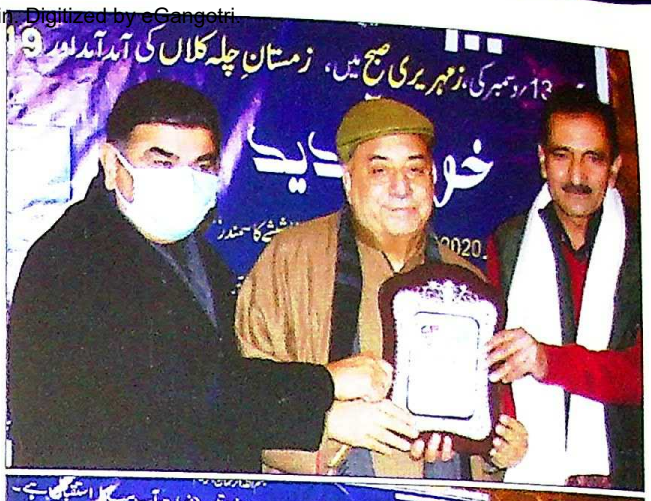

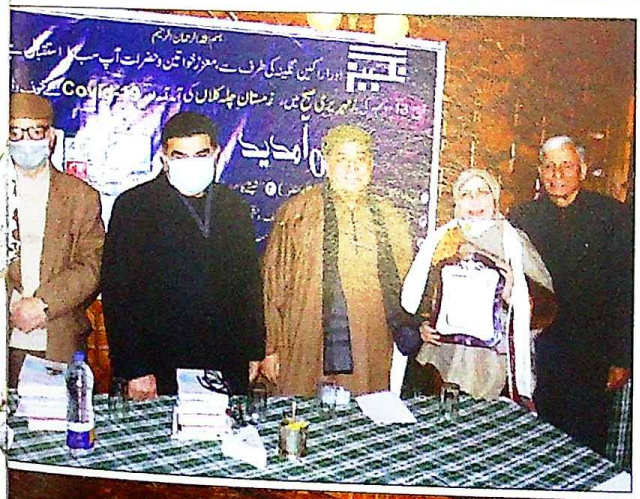

Kashmir Treasures Collection, Srinagar

CC-0. In Public Domain. Digitized by eGangotri.

بیاد والدین سارہ ترنبو و محمد عبداللہ ترنبو (مرحومین)

نگینہ انٹرنیشنل

اشاعت کا ترپنواں سال

جلد: ۵۳ ؛ شمارہ : ۱

جلد : 53 شمارہ : 1 (جنوری تا جون 2021ء)

چیف ایڈیٹر : وحشی سعید (9419012800)

مینجنگ ایڈیٹر : ظہور ترنبو (8715823301)

ایڈیٹر : مجید ترنبو

ایڈیٹوریل بورڈ :

نور شاہ 09906771363

مظفر ایرج 09596255405

ڈاکٹر اشرف آثاری 09419017246

صدر دفتر : پوش کرن نگر، سرینگر 190010

ترسیل زر اور خط و کتابت : ہوٹل شہنشاہ پیلس، بلیوارڈ، سرینگر 190001 کشمیر

ای میل : nagina968@gmail.com

موبائل نمبر : 09419012800

اس شمارے کی قیمت : -/350 روپے

ٹائپ سیٹنگ : محمد فاروق بٹ (9419968112)

پرنٹر پبلشر ایڈیٹر وحشی سعید نے الفجر پرنٹنگ پریس سرینگر سے چھپوا کر ''پوش'' کرن نگر سرینگر (کشمیر) سے شائع کیا۔

نگینہ میں چھپنے والی تخلیقات میں واقعات و کردار اور مقامات فرضی ہیں۔ ان کے ساتھ کسی بھی طرح کی مطابقت محض اتفاقیہ ہو سکتی ہے جس کے لئے ادارہ کسی بھی طرح ذمہ دار نہیں۔ معیار کو برقرار رکھنے کے لئے ضمیمے یا گوشے شائع کرنے سے بھی معذرت طلب کی جاتی ہے۔

سرپرست : ایس میٹ چیریٹیبل ادبی ٹرسٹ سرینگر

نگینہ انٹرنیشنل کے جزیات

بات سے بات	(اداریہ)	۳
حمد و نعت	اشرف عادل	۴
حمدیہ نعت	ظفر اقبال ظفر	۵
غزل	ظفر اقبال ظفر	۵
بیاد مرحوم شمس الرحمٰن فاروقی ۔ ۔		
اَن مٹ لکیر	علیم صبا نویدی	۶
قطعات	طلحہ تابش	۶
شمس الرحمٰن فاروقی اور شب خون	سیفی سرونجی	۷
ایک روشن دماغ تھا نہ رہا	ظہیر خان	۱۳
بیاد مرحوم عرش صہبائی ۔ ۔		
ایک نیر تاباں ڈوب گیا	سید خورشید کاظمی	۱۶
عرش صہبائی کی تخلیقات ایک نظر میں	(ادارہ)	۱۸
گوشۂ مرحوم عمر مجید ۔ ۔		
ایک سچا کہانی کار ایک سچا دوست	بشیر دادا	۱۹
انجمن میں بھی میسر رہی خلوت اُس کو	ڈاکٹر اشرف آثاری	۲۰
عمر مجید ۔ ایک حساس فنکار	دیپک بدکی	۲۴
عمر مجید کا خط جاوید آذر کے نام	(ادارہ)	۲۸
کیا خوب آدمی تھا اللہ مغفرت کرے	نور شاہ	۳۰
وہ زندہ ہے	رؤف راحت	۳۳
عمر مجید ۔ مریض عشق	ڈاکٹر نذیر مشتاق	۳۴

Kashmir Treasures Collection, Srinagar

CC-0. In Public Domain. Digitized by eGangotri.

آہ! عمر مجید	سلیم ساغر	۳۶
عمر مجید ۔ فن اور شخصیت	طارق شبنم	۳۷
عمر مجید کی افسانہ نگاری	ڈاکٹر ریاض توحیدی	۴۱
عمر مجید میری یادوں کے آئینے میں	مشتاق مہدی	۴۵

مضامین

غبار خاطر کا اسلوبیاتی تناظر	ڈاکٹر قسیم اختر	۴۷
مظہر امام ۔ شخصیت اور شاعری	ڈاکٹر احسان عالم	۵۴
قاضی نذر الاسلام	کرشن بھاوک	۵۹
وحشی سعید بحیثیت ناولٹ نگار	عرفان رشید	۶۶

منظومات ۔ ۔ ۔ (۷۳ تا ۸۵)

غزلیں : مظفر ایرج، کرشن کمار طور، حسن رضا اطہر، ذکی طارق، احمد نثار، مسلم نواز، شارق ریاض، ضرر وصفی، رفعت آسیہ شاہین، ڈاکٹر آفاق فاخری، آمنہ نقشبندی، حسن امام فدائی

نظمیں : ڈاکٹر شبنم عشائی، سمیع القاسم۔

افسانے ۔ ۔

بہ رضائے صنم	اشتیاق سعید	۸۶
یہ کیسے رشتے ۔ ۔ ؟	وحشی سعید	۹۴
تہی دست	ڈاکٹر شاہد جمیل	۹۸
گھروں میں بنتے مکان	ڈاکٹر علی عباس	۱۰۵
خراشیں	پرویز مانوس	۱۰۷
تیرے انتظار میں	محمد قمر سلیم	۱۰۹
اوقات	ایثار کاشمیری	۱۱۳
اُمید	زبیر قریشی	۱۱۷
بھولی	کے اے عباس ترجمہ : استوتی اگروال	۱۱۸

افسانچے ۔ ۔

ایک خط، بڑا پاپ، موت، پتھر کا دیوتا، بھکارن ۔ ۔	احمد رشید	۱۲۳

انشائیے ۔ ۔

بیوی اور گاڑی	زنفر کھوکھر	۱۲۵
شوہر دل بہار	ظہیر خان	۱۳۰

ڈرامہ ۔ ۔

جانے والے	نور شاہ	۱۳۱

تبصرہ و تعارف

لفظ لفظ داستان	ڈاکٹر نیلوفر ناز نحوی	۱۳۴
خالد حسین ممتاز کیوں؟	محمد اقبال لون	۱۳۷
شیشے کا سمندر	زاہد ظفر	۱۴۱
تنکے	ہارون ریشی	۱۴۴
کرب زار	معراج احمد معراج	۱۴۷
ادبی جھلکیاں	نور شاہ	۱۴۹

مکتوبات ۔ ۔ ۔ (۱۵۵ تا ۱۶۰)

نسیم عزیزی، نذیر فتح پوری، ذکی طارق، ظفر اقبال ظفر، ڈاکٹر کرشن بھاوک، ضرر وصفی، رومانی، شارق عدیل، احمد کلیم فیض پوری، ڈاکٹر آفاق فاخری، رینو بہل۔

Kashmir Treasures Collection, Srinagar

CC-0. In Public Domain. Digitized by eGangotri.

اداریہ

سن ۱۸۸۸ء میں مہاراجہ پرتاپ سنگھ کے دورِ اقتدار سے پہلے کشمیر، جموں اور لداخ کے خطوں میں اپنی اپنی مقامی اور مادری زبانیں اپنا کردار نہایت نفاست سے نبھا رہی تھیں۔ لیکن یہ زبانیں اپنے اپنے علاقہ جات اور اپنے اپنے لوگوں تک محدود تھیں۔ ان تینوں زبانوں کو ایک دوسرے کے قریب لانے، ایک دوسرے کی بقا اور سلامت کے لئے اور ان خطوں میں اپنی اپنی زبانوں میں پوشیدہ علم و ہنر کو ایک دوسرے سے آشنا کرنے کے لئے ایک ایسا لائحہ عمل اپنانے کی ضرورت محسوس کی گئی جو ان خطوں کو مضبوط سے مضبوط تر بنانے میں ایک اہم رول ادا کر سکے۔ لہٰذا ان خطوں کو ایک دوسرے کے زیادہ قریب لانے کے لئے مہاراجہ پرتاپ سنگھ کے دورِ اقتدار میں اُردو زبان کو سرکاری زبان کا درجہ دیا گیا اور اُس دور میں یہ ایک رابطہ کی زبان بن کر تینوں خطوں اور ان خطوں میں رہنے والے مختلف لوگوں میں ایک نئی آواز بن کر گونجنے لگی۔ رفتہ رفتہ اُردو زبان کے پھلنے پھولنے کی راہیں ہموار ہوتی گئیں اور اس طرح وقت کی رفتار کے ساتھ اُردو زبان جموں، کشمیر اور لداخ میں بود و باش رکھنے والے مختلف ذاتوں، قبیلوں، نسلوں اور لسانی گروہوں کے درمیان نہ صرف رابطے کا کام سرانجام دینے لگی بلکہ یہ رنگا رنگ ثقافتوں، تہذیبی شناختوں، تمدنی اثاثوں، مذہبی عقیدوں سے تعلق رکھنے والے افراد کے جذبات و احساسات کی آئینہ دار بنتی گئی۔ مختلف زبانیں بولنے والے شعراء، ادباء، تاریخ دانوں، صحافیوں اور قلم کاروں نے اُردو زبان کو اپنی تخلیقی صلاحیتوں کا ذریعہ بنایا اور اسے اپنا خون جگر پلانے لگے۔ اُردو ریاست کے تینوں خطوں میں ایک وحدت کی علامت بن کر اُبھر آئی۔

وقت کا پہیہ ہمیشہ کی طرح گھومتا رہا۔ اقتدار آتے اور جاتے رہے لیکن اُردو زبان کی ضرورت بڑھتی گئی۔ اس زبان کی اہمیت میں اضافہ ہونے لگا اور اس نے علمی، تعلیمی اور ادبی شناخت بن کر پورے جموں کشمیر اور لداخ کو اپنی کھلی بانہوں میں سمیٹ لیا۔ جب آزادی کا سورج آکاش کی بیکراں وسعتوں سے اُبھرا اور چاندنی نے پوری دھرتی کو اپنے آغوش میں سجا لیا تو اُردو زبان کو ریاست کی سرکاری زبان اور آئینی سطح کا درجہ حاصل ہوا۔ ارض کشمیر سے تعلق رکھنے والے بڑے بڑے اور معتبر ناموں نے اُردو زبان و ادب کے اُفق پر اپنا ایک مقام بنا لیا۔ تب سے آج تک یہ سلسلہ جاری ہے۔

''یوٹی'' بننے کے بعد بھی اُردو کو سرکاری زبان ہونے کا درجہ برقرار ہے لیکن اب اُردو کے ساتھ ساتھ کشمیری، ڈوگری، انگریزی اور ہندی زبانیں بھی سرکاری زبان کے زمرے میں لائی گئی ہیں۔ سرکاری زبانوں کا کینوس بڑھنے کے باوجود اُردو زبان کی اہمیت، افادیت اور ضرورت کو ہرگز ہرگز نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کیونکہ اُردو ایک رابطے کی زبان ہے اور اس تعلق سے اُردو زبان اپنا ایک اہم کردار نبھاتی آ رہی ہے اور نبھاتی رہے گی۔ اُردو زبان کی آبیاری میں ہی مادری اور مقامی زبانوں کی بہتری پوشیدہ ہے۔

(وحشی سعید)

☆ ☆

Kashmir Treasures Collection, Srinagar

CC-0. In Public Domain. Digitized by eGangotri.

اشرف عادل
7780806455

حمد

طور پر جلوہ ترا برق و شرر میں تو ہی تو
دور تک موسیٰ کے پاکیزہ سفر میں تو ہی تو

شام کے ڈھلتے ہوئے سایوں میں تیرا ہی دوام
ہر گجر میں تو ہی تو نور سحر میں تو ہی تو

ہر سفر تیری طرف ہر موڑ پر موجود تو
تو تھکن میں منزلوں کی رہ گزر میں تو ہی تو

سانس لینا ورنہ اس دنیا میں ہے کس کی مجال
تیرے جلوے ہر نظر میں ہر بشر میں تو ہی تو

ناز کی بزم جہاں کی کوئی سمجھا ہی نہیں
شیشہ سازی میں تو ہی تو شیشہ گر میں تو ہی تو

بارشوں میں ترا جلوہ دھوپ میں تیرا کرم
سرخوشی میں تو ہی تو ہے چشم تر میں تو ہی تو

لفظ بھی کرتے ہیں اب اوراق پر حمد و ثنا
شکر ہے اس حمد کے زیر و زبر میں تو ہی تو

نعت

آتا ہے کبھی ذہن میں سرکار کا عالم
کیا ہوتا ہے پھر مجھ سے گنگار کا عالم

آنکھوں میں مری حسرت دیدار کا عالم
گلیوں میں تری عالم انوار کا عالم

اُلفت بھی صداقت بھی ندامت بھی حیا بھی
اللہ رے ہمارے شہہ ابرار کا عالم

جائیں گے مدینے تو بشارت بھی ملے گی
دنیا میں ہی دیکھیں کبھی گلزار کا عالم

جب نعت اُترتی ہے مرے قلب و جگر پر
لہجے کا اثر پوچھ نہ اشعار کا عالم

یہ آنکھ بھٹکتی ہے تری دید کی خاطر
آ دیکھ ذرا اس دل بیمار کا عالم

Kashmir Treasures Collection, Srinagar

CC-0. In Public Domain. Digitized by eGangotri.

ظفر اقبال ظفرؔ
7379512431

حمدیہ نعت

جس شخص کے سینے میں ہے ایمان کی خوشبو
اللہ اُسے بخشے گا عرفان کی خوشبو

دنیا کی ہر اِک شے کو فنا ہونا ہے لیکن
باقی جو رہے گی تو وہ ہے قرآن کی خوشبو

جنت کے چمن زار سے ہے افضل و برتر
سرکارِ دو عالم کے گلستان کی خوشبو

جس نے بھی سنی شوق سے آیاتِ کریمہ
کانوں میں بسی اُس کے ہے وجدان کی خوشبو

اللہ کے محبوب کا جو ذکر ہے اس میں
جانے کی نہیں نعت کے دیوان کی خوشبو

وہ نوعِ بشر کیلئے ہے سایۂ رحمت
جائے گی بھلا کیسے یہ فیضان کی خوشبو

اللہ کی نعمت کا بہت ذکر ہے اس میں
ہر سو ہے ظفرؔ سورۂ رحمٰن کی خوشبو

غزل

سانس لینا کوئی آسان کہاں ہوتا ہے
عمر بھر خوشیوں کا امکان کہاں ہوتا ہے

زخم چہرے کے تو کہتے ہیں کہانی ساری
عکس آئینے کا بے جان کہاں ہوتا ہے

بیچ دیتا ہے چراغوں کی لویں جو اپنی
وہ بشر صاحب ایمان کہاں ہوتا ہے

رفتہ رفتہ مجھے کرتی ہے یہ دنیا برباد
میری بربادی کا اعلان کہاں ہوتا ہے

اُس کو معلوم ہے یہ زخم لگے ہیں کیسے
آئینہ دیکھ کے حیران کہاں ہوتا ہے

توڑنی پڑتی ہیں زنجیریں تمناؤں کی
آدمی ہونا بھی آسان کہاں ہوتا ہے

اُس کی خوشبو بھی ہے سرگوشی بھی ہے آہٹ بھی
گھر ظفرؔ میرا یہ ویران کہاں ہوتا ہے

Kashmir Treasures Collection, Srinagar

CC-0. In Public Domain. Digitized by eGangotri.

علیم صبا نویدی
09840361399

اَن مٹ لکیر

(ایک سانیٹ بہ زبان شمس الرحمٰن فاروقی)

مجھ کو پہچان نئے عہد کا سرمایہ ہوں
مجھ سے قائم ہے ہر اِک دور کے ماتھے کی پھبن
ہے معطر مری سوچوں سے زمانے کا بدن
ہر نظارہ مری آنکھوں سے جنم لیتا ہے
میرا احساس اندھیروں کو مٹا دیتا ہے
مرے افکار نے روکا کئی طوفانوں کو
مری چاہت نے منور کیا ارمانوں کو
کتنے ارمانوں کی سوغات لئے آیا ہوں

مجھ سے پہلے بھی کئی آئے تھے میری ہی طرح
مجھ میں جو کچھ بھی ہے پوشیدہ وہ اوروں میں نہیں
مجھ سا روشن کوئی چہرہ یہاں چہروں میں نہیں
مٹ گئے کتنے یہاں بجھتی لکیروں کی طرح

میں صحیفہ ہوں کئی صدیوں پڑھا جاؤں گا
غالبؔ و میرؔ کی دنیاؤں میں چھاجاؤں گا

طلحہ تابش
9044676517

قطعات

نذر شمس الرحمٰن فاروقی

بھلا سکے گی نہ دنیا کبھی بھی شمس تجھے
کہ تیرا ذکر کرے گا زمانہ صدیوں تک
سدا مہکتا رہے گا تمہارے فن کا چمن
فضا میں گونجے گا تیرا فسانہ صدیوں تک

ہزار حیف کہ دنیا سے اُٹھ گیا آخر
عروسِ اردو کی زلفیں سنوارنے والا
فسردہ بزم ادب ہے کہ اب نہیں وہ بھی
لہو سے گلشن اردو نکھارنے والا

تند موجوں کا کب اسے ڈر تھا
وہ خود اپنے میں اِک سمندر تھا
شخصیت ہی نہ تھی سحر انگیز
اس کا فن بھی بڑا تناور تھا

کبھی نہ ماند پڑے گی چمک و دمک اُس کی
کہ آسمانِ ادب کا اِک آفتاب تھا وہ
اُسی کے فیض سے روشن تھے کتنے ہی مہتاب
یہ بات سچ ہے کہ اِک صاحب کتاب تھا وہ

Kashmir Treasures Collection, Srinagar

CC-0. In Public Domain. Digitized by eGangotri.

سیفی سرونجی
9425641777

شمس الرحمٰن فاروقی اور شب خون

کسی بھی ادبی رسالہ کی اہمیت اور اس کا معیار ایڈیٹر کی قابلیت اور صلاحیت پر منحصر ہوتا ہے۔ نیاز فتحپوری کا دبدبہ صرف اس لئے تھا کہ نیاز فتح پوری ایک عالم فاضل اور نہایت ہی قابل شخصیت کے مالک تھے۔ آج ادبی دنیا میں جو چند معتبر ادبی رسائل نکل رہے ہیں ان میں شب خون کی اہمیت اور معیار اعلیٰ درجہ کا صرف اس لئے تسلیم کیا جاتا ہے کہ اس کے ایڈیٹر شمس الرحمٰن فاروقی جیسے دانشور نقاد نکالتے ہیں۔ جس طرح ہر پرچہ میں ایڈیٹر کی بھی کچھ مختلف تحریریں شائع ہوتی ہیں اور ان تحریروں کو پڑھ کر اس کی شخصیت، علمیت اور قابلیت اُجاگر ہوتی ہے، اس کے تبصروں سے، اداریوں سے اور دیگر ادبی و تحقیقی مضامین سے، اسی طرح شمس الرحمٰن فاروقی کی قابلیت، شخصیت اور علمیت ان کے ہر مضمون اور ہر تحریر میں نمایاں ہے، چاہے وہ اداریے ہوں یا وہ کسی اور نوعیت کے مضامین ہوں۔ ان کے ایک ایک لفظ سے ان کی ساری علمیت اور قابلیت نمایاں ہو جاتی ہے، یہی وجہ ہے کہ ادبی دنیا میں ان کا رعب اور ان کی قابلیت کی دھاک اس طرح بیٹھی ہوئی ہے کہ کسی چھوٹے موٹے شاعر ادیب اور نقاد کا تو ان کے دربار میں گذر تک نہیں ہوتا اور ان کے سامنے کسی کو منہ کھولنے کی ہمت ہی نہیں ہوتی، اس لئے کہ شمس الرحمٰن فاروقی کی عالمانہ نظر اتنی گہری ہوتی ہے کہ کوئی بھی ادبی موضوع ہو، کوئی واقعہ ہو، یعنی تاریخی، ادبی اور زبان سے متعلق کوئی بھی لسانی خامیاں یا کوئی پہلو ہو، اُن کی نظر سے پوشیدہ نہیں رہتا اس لئے کہ وہ کئی زبانوں پر نہ صرف یہ کہ عبور رکھتے ہیں بلکہ ان کا مطالعہ اتنا وسیع ہے کہ باریک سے باریک اور نازک سے نازک معاملات میں بھی وہ اپنے علمی دلائل سے اس طرح بحث کرتے ہیں جیسے اس موضوع پر انہوں نے برسوں تحقیق کی ہو۔ شب خون میں چند کالم ایسے ہوتے ہیں جو دیگر ادبی رسائل میں نظر نہیں آتے، مثلاً سوانحی گوشوں کا انتخاب اور کسی بھی شعری یا ادبی موضوع پر ان کے مدلل جواب جو وہ شب خون کے مکتوبات کے کالم میں دیتے ہیں جنہیں پڑھ کر بڑے سے بڑے نقاد شاعر ادیب نہ صرف حیران رہ جاتے ہیں بلکہ ان کی قابلیت کے آگے سرِ تسلیم خم کر دیتے ہیں۔ اگر کسی شعر پر کسی نے غلطی سے کوئی اعتراض کر دیا تو اس کے جواب میں شمس الرحمٰن فاروقی سو دو سو سال پرانے شاعروں کے درجنوں اشعار اردو کے ہی نہیں فارسی کے بھی سند کے طور پر پیش کر دیتے ہیں اور اعتراض کرنے والے کی قابلیت کا بھانڈا پھوڑ دیتے ہیں اور وہ اپنی خفت مٹانے کے لئے سوائے شرمندگی کے کچھ نہیں کر پاتا۔ شب خون کے یہی چند صفحات فاروقی صاحب کی قابلیت اور شخصیت کا سب سے بڑا ثبوت ہوتے ہیں۔ ورنہ شب خون کی عام تحریریں مثلاً غزلیں، نظمیں، افسانے اتنے خشک ہوتے ہیں کہ قاری بجائے حظ اٹھانے کے بور ہو کر انھیں ایک طرف رکھ دیتا ہے۔ جہاں ایک طرف شمس الرحمٰن فاروقی صاحب کی تحریروں نے ''شب خون'' کو اعلیٰ معیار بخشا ہے وہیں دوسری طرف ایسے ایسے خشک مضامین، نظمیں، غزلیں اور افسانے چھاپ کر قاری کو بھی الجھن میں مبتلا کر دیا ہے، اس لئے شب خون کے بارے میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ رسالہ پڑھے

Kashmir Treasures Collection, Srinagar

CC-0. In Public Domain. Digitized by eGangotri.

لکھے شاعروں، ادیبوں کے لئے ہی وجود میں آیا ہے اور ویسے بھی بڑے بڑے لوگوں نے ادب کو بھی مخصوص پڑھے لکھے لوگوں کیلئے ہی قرار دیا ہے۔ جوش ملیح آبادی نے ایک بار لکھا تھا کہ میرؔ، غالبؔ کچھ نہیں بلکہ عوامی شاعر نظیرؔ اکبرآبادی بڑا شاعر ہے لیکن چند برسوں میں ہی پتہ چل گیا کہ میرؔ، غالبؔ کیا ہیں اور نظیرؔ اکبرآبادی کیا ہیں۔ کہنے کا مطلب صرف یہ ہے کہ ادب پڑھے لکھے لوگوں کے لئے ہی زیادہ سمجھا گیا ہے اور شمس الرحمٰن فاروقی اسی نظریے کو پیش کرنے میں کوشاں رہے ہیں ان کے نزدیک ادب سے ذرا بھی دلچسپی رکھنے والے کو پڑھا لکھا ہونا بہت ضروری ہے اور شب خون اس کی زندہ مثال ہے۔ شب خون کے وہ کالم جن میں فاروقی صاحب کی علمیت اور ان کے گہرے مطالعہ کی جھلکیاں دکھائی دیتی ہیں، وہ کالم ہیں شب خون کے خطوط اور ان میں فاروقی صاحب کے ریمارکس جو ان کے رسالہ شب خون میں سب سے زیادہ پڑھے جانے والے سب سے زیادہ معلوماتی ہوتے ہیں۔ دوسرا کالم سوانحی گوشے جن میں وہ دنیا کی ان عظیم ہستیوں کے کچھ خاص پہلوؤں کو اجاگر کرتے ہیں جن سے اردو والے ناآشنا ہیں اور شب خون کے وہ اداریے جن میں کوئی نہ کوئی بات ایسی ضرور ہوتی ہے جسے اگر اردو والے پڑھتے رہیں تو ان کی شاعری ان کی سوچ اور ان کی تحریروں میں یقیناً ایک نمایاں تبدیلی آجائے مثلاً شب خون کے شمارہ نمبر ۲۱۵ میں Kinfried Noth 1995 کا ایک اقتباس پیش کیا ہے جس کی چند سطریں یہاں پیش کی جارہی ہیں۔

''علامت: علوم کے میدان میں علامت ایک ایسی اصطلاح ہے جس پر معنی اور معنویت کے بہت سے بوجھ لادے گئے ہیں۔ اگر وسیع ترین مفہوم میں دیکھا جائے تو علامت یعنی Symbol اور نشان یعنی Sign میں کوئی فرق نہیں۔ اس مشکل کے باوجود کہ علامت کی اصطلاح بذات خود ایک مبہم اصطلاح ہے لیکن اس کی جو تعریفیں باریکی کے ساتھ بیان کی گئی ہیں ان کو تین شقوں میں تقسیم کرسکتے ہیں۔ اول تو یہ کہ علامت رسومیاتی قسم کا نشان ہے۔ دوسرے یہ کہ علامت تصویری قسم کا نشان ہے اور تیسری شق یہ کہ علامت معنی خیز اور معنی کی طرف اشارہ کرنے والا نشان ہے۔ آخری دو تعریفوں کی روشنی میں علامت کو جمالیات اور ثقافتی مطالعات کے میدانوں میں کلیدی تصور کی حیثیت حاصل ہے۔ اِن میدانوں میں علامت کا مفہوم کچھ اور معنی کو بھی محیط ہے۔ مثلاً لفظی نشان کے طور پر علامت یا علامتی نشان کے طور پر علامت (مثلاً 0 علامت ہے عدم کی) یا ٹریڈ مارک کے طور پر علامت (کوئی Logo) ہے۔ جھنڈے (Banner) اور مہر (Signet) کے طور پر علامت اور پھر آیت (Emblem) کے طور پر علامت۔ یعنی علامت اس تصویر کو بھی کہیں گے جس سے کوئی مخصوص معنی مستفاد ہوسکتے ہیں۔ (مثال کے طور پر اگر کسی تصویر میں ہڈیوں کا ڈھانچہ ہاتھ میں ہنسیا لئے ہوئے دکھایا گیا ہے تو یہ علامت ہے موت یا موت کے فرشتے کی) علامت کی ایک اور شق تمثیل (Allegory) بھی ہے''

اس اقتباس کی روشنی میں یہ بات وثوق سے کہی جاسکتی ہے کہ فاروقی صاحب اپنے شب خون کے لئے کیسا قاری چاہتے ہیں۔ اس میں چھپنے والے شاعروں، ادیبوں کی بات تو دوسری ہے شب خون کے قاری کو کتنا ذہین ہونا چاہیے یہ بات فاروقی صاحب کے اداریوں میں، ان کے مضامین اور مکتوبات کے جوابات میں محسوس کی جاسکتی ہے

Kashmir Treasures Collection, Srinagar

CC-0. In Public Domain. Digitized by eGangotri.

کہ شب خون کے قاری کو علامت، استعارات اور دنیا کے دیگر علوم فنون کی پوری معلومات ہونا چاہیے۔ وہی ادب کی بات کریں، وہی مضامین اور دیگر علمیات، لسانیات یا دیگر موضوعات پر گفتگو کریں ورنہ شاعری کا بوجھ اپنے کاندھوں پر بلاوجہ لادنے سے کوئی فائدہ حاصل نہیں۔ ان کے اسی نظریے کو دیکھتے ہوئے بیشتر کم پڑھے لکھے لوگوں کو تکلیف ہوتی ہے اور وہ مخالفت پر اُتر آتے ہیں لیکن ان سے مقابلہ کرنے کیلئے جس قابلیت کی ضرورت پڑتی ہے وہ کسی میں نظر نہیں آتی تو گھٹیا ہتھکنڈوں پر اتر آتے ہیں حالانکہ ان تمام باتوں سے شمس الرحمٰن فاروقی کی شخصیت پر کوئی اثر نہیں پڑتا ویسے بھی وہ ہر کس و ناکس کا نوٹس نہیں لیتے نہ کسی کو جواب دیتے، یہی اُن کی علمیت اور قابلیت کی نمایاں پہچان ہے، ویسے حسب ضرورت شب خون میں اس طرح کے خطوط کے جواب میں وہ ایک دو سطروں میں ہی اتنا کچھ کہہ دیتے ہیں کہ پھر کسی کو یہ ہمت نہیں ہوتی کہ وہ کچھ لکھ سکے وہ سامنے والے کو اپنے علمی دلائل سے اس طرح مطمئن کرتے ہیں کہ اسے ان کی بات تسلیم کرنا پڑتی ہے چاہے وہ مسئلہ زبان کا ہو یا کسی پرانے سے پرانے شاعر کے شعر کا ہو یا کسی افسانے یا مضمون کا ہو۔ شب خون کے شمارہ نمبر ۲۱۷ میں گیان چند جین کا ایک خط شائع ہوا ہے۔

''فروری ۱۹۹۸ء کے شب خون میں آپ نے مجھ صغر الشعرا کی غزل کو سب سے پہلے جگہ دے کر مجھے نوازا بھی اور محجوب بھی کیا۔ میں اس مقام کے لائق نہیں۔ غزل میں کتابت کے چند سہو در آگئے ہیں۔ ساتویں شعر میں ''مغلوب'' دراصل ''مفلوج'' اور آخری شعر میں ''زمن'' کی جگہ ''چمن'' ہونا چاہیے۔ آپ نے عنوان دیا ہے ''جنت سے جنت تک''، ''قیامت سے قیامت تک'' کی یاد آگئی۔ میرے نزدیک نہ ہندوستان جنت ہے نہ امریکہ۔ میں نے اس غزل کا ایک مصرع اصلاً یوں کہا تھا :

ہوئی ہے جنتِ ارضی بھی میرے واسطے دوزخ

لیکن نئے مستقر کو دوزخ کہنا ناشکرا پن معلوم ہوا۔ اسے بدل کر ''بے رس'' کر دیا۔ میں نے اس قماش کی ایک اور غزل میں یہ دو شعر کہے ہیں :

یہاں خوشیاں ہی خوشیاں ہیں، سمجھتا تھا دل سادہ
یہاں آکر طبیعت رہتی ہے افتادہ افتادہ
دکھائے سیمیاگر کی طرح کیوں سبز باغ اتنے
نئی دنیا! فقط اک خواب ہی نکلا ترا وعدہ

بریں وجوہ یہ عنوان میرے عندیے کا عکاس نہیں۔

آپ نے اپنے تجزیے کے آخر میں لکھا ہے:

''معائب سخن کی وہی اہمیت ہے جو مقدمہ شعر و شاعری اور ہماری شاعری کی یعنی ان کتابوں سے اختلاف ممکن، بلکہ ضروری ہے۔ لیکن.....الخ.....(ص ۳۳)

''آپ کی سیر چشمی سے شہ پاکر میں بھی آپ کے عالمانہ مضمون سے کہیں کہیں اختلاف رکھتا ہوں لیکن ایسے مقامات کم ہیں'' (گیان چند جین)

یہ خط امریکہ میں مقیم مشہور نقاد گیان جین کا ہے جن کا مقام و مرتبہ بھی سب کو معلوم ہے۔ اس خط میں گیان چند جین نے ایک چھوٹے سے عنوان سے متعلق صرف اتنا لکھا تھا کہ آپ نے جنت سے جنت تک کا عنوان کیوں لگایا جب کہ یہ عنوان میرا لکھا ہوا نہیں ہے لیکن شمس الرحمٰن فاروقی صاحب نے گیان چند جین صاحب کو بہت خوبصورت طریقے سے اس عنوان کی اہمیت کو سمجھا دیا اور ساتھ میں

Kashmir Treasures Collection, Srinagar

CC-0. In Public Domain. Digitized by eGangotri.

نوٹ بھی لگا دیا وہ لکھتے ہیں۔

''عنوان ہمارا لگایا ہوا تھا، اُسے ہم نے ایک طرح سے شاعر کی طرف سے طنزیہ اشارہ بتایا تھا، ہندوستان کو جنت نشان کہتے ہی تھے اور امریکہ خاص کر کیلیفورنیا کو دنیا میں جنت کہا جاتا ہے''

اس طرح کے سینکڑوں مسائل علمی، ادبی، لسانی اور دیگر علوم وفنون سے متعلق فاروقی صاحب کے جوابات ایسے ہوتے ہیں کہ بڑے سے بڑے عالم فاضل کو بھی ان کی بات تسلیم کرنا پڑتی ہے۔ اس وقت اردو دنیا میں ایسے کتنے ایڈیٹر ہیں جو فاروقی صاحب جیسی صلاحیت رکھتے ہوں۔ اب ظاہر ہے جس رسالہ کے ایڈیٹر شمس الرحمٰن فاروقی ہوں گے اس کا معیار کیسا ہوگا اور کیسا ہونا چاہیے۔ آج ہندوستان میں درجنوں اردو رسائل نکلتے ہیں اور ان رسائل میں چھپنے والے مضامین، اداریے، تبصرے پڑھ کر ہی اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ وہ کس نوعیت کے ہوتے ہیں۔ اردو رسائل کی ان دنوں ایک ایسی ہوڑ جاری ہے کہ ہر ایڈیٹر جلد سے جلد شہرت حاصل کرنا چاہتا ہے اور ایک دوسرے پر سبقت لیجانے کی کوشش میں کئی ایڈیٹروں کی صلاحیتوں کا بھانڈا بھی پھوٹ جاتا ہے۔ اس لئے کہ صرف رسالہ نکالنے سے ہی بڑا شاعر ادیب نہیں ہوجاتا لیکن آج کل ہر ایڈیٹر کے پاس تبصرے کے لئے درجنوں کتابیں آتی ہیں اور وہ ان پر چھوٹے موٹے مضامین اور تبصرے لکھ کر نقادوں کی فہرست میں شامل ہونا چاہتا ہے اور دو چار سال ادھر ادھر سے قرض لے کر یا اپنی ذاتی پونجی لگا کر ایڈیٹروں کی فہرست میں شامل ہوجاتا ہے لیکن ایک اچھے رسالہ کے لئے ایڈیٹر کو اتنی معلومات ہونا چاہیے کہ وہ کسی کے ادبی مقام ومرتبہ کو سمجھنے کے ساتھ ساتھ عالمی ادب پر بھی اس کی گہری نظر ہو، تاکہ وہ یہ دیکھ سکے، سمجھ سکے کہ اردو زبان کے علاوہ دیگر زبانوں کے ادب میں کیا کچھ لکھا جارہا ہے اور کیسا لکھا جارہا ہے اور پھر اس میں تجزیہ کرنے کی یہ صلاحیت ہونا چاہیے کہ یہ اچھا ہے، یہ برا ہے اور یہ ساری صلاحیتیں مل کر شمس الرحمٰن فاروقی میں یکجا ہوگئیں ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے رسالہ 'شب خون' میں عالمی ادب سے متعلق مضامین اور دیگر تحریریں شائع ہوتی رہتی ہیں اور فاروقی صاحب کے اداریے ان کے مضامین اور مخصوص شخصیات پر گوشوں کی اشاعت اس کا زندہ ثبوت ہیں۔ کبھی وہ کسی اداریے میں لکھتے ہیں کہ انگریزی ادب میں جس طرح تبصرے کتابوں پر آتے ہیں اگر اس طرح کے تبصرے ہندوستانی ادیبوں اور شاعروں کی کتابوں پر آنے لگیں تو لوگ تبصروں کے لئے کتابیں پہنچانا ہی بند کردیں، اس لئے کہ ان میں سچ کو برداشت کرنے کی ہمت ہی نہیں ہے، ہر مصنف، شاعر، ادیب اپنی کتاب پر صرف اپنی تعریف پڑھ کر خوش ہوتا ہے، حالانکہ یہ خوشی کتنی عارضی ہوتی ہے اس بات کو محسوس کیا جاسکتا ہے۔ اسی طرح فاروقی صاحب سوانحی گوشوں کے کالم میں سینکڑوں برس پرانے انگریزی عربی، فارسی، فرانسیسی اور دیگر زبانوں کے بڑے بڑے ادیبوں شاعروں کی مختلف اور بڑی معنویت لئے ہوئے پوشیدہ گوشوں کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ شب خون کے شمارہ نمبر ۲۱۷ میں جیمس جوائس اور سیموئل بیکٹ کا ایک مختصر واقعہ شائع ہوا ہے، ملاحظہ ہو:

''جیمس جوائس جن دنوں پیرس میں مقیم تھا اور اپنے ناول Fennegans wake پر کام کررہا تھا۔ سیموئل بیکٹ وہاں پہلے سے موجود تھا اور بیکٹ کا اس سے ربط ضبط کسی عقیدت مند شاگرد اور حاضر باش کی طرح کا تھا۔ جوائس کی آنکھیں اس وقت بہت خراب ہوچکی تھیں اور وہ اپنا ناول روزانہ بیکٹ کو املا کراتا تھا۔ ایک دن املا کے دوران کسی نے

Kashmir Treasures Collection, Srinagar

CC-0. In Public Domain. Digitized by eGangotri.

دروازے پر دستک دی۔ بیکٹ اپنے انہماک کے باعث دستک کو سن نہ سکا تھا لیکن جواب میں جب جوائس نے اسی عام املائی لہجے میں کہا ''آجاؤ'' (Come in) تو بیکٹ نے گمان کیا کہ یہ بھی املا کا حصہ ہے اور اس نے وہ فقرہ یعنی Come in بھی ویسے ہی لکھ دیا۔ بعد میں جب جوائس نے املا کئے ہوئے اوراق بیکٹ کی زبانی سنے اور بیکٹ نے Come in پڑھا تو جوائس نے چونک کر پوچھا ''یہ کیا ہے''؟ بیکٹ نے جواب دیا کہ آپ ہی نے لکھوایا تھا۔ پھر اس نے بتایا کہ فقرہ Come in جوائس نے کس وقت بولا تھا۔ جوائس کچھ دیر تک چپ چاپ غور کرتا رہا، پھر بولا ''ٹھیک ہے اسے رہنے دو''

لکھنے کو تو یہ واقعہ ایک معمولی واقعہ ہے کہ املا بولتے وقت ایک لفظ (Come in) تھا جو بے خودی میں لکھنے والا لکھ گیا۔ لیکن اس واقعہ کی تہہ میں کتنی معنویت اور کتنی گہرائی چھپی ہوئی ہے اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ ایک مرتبہ کسی بادشاہ کو ایک اچھے منشی کی ضرورت پیش آئی تو اس نے اپنی پڑوسی ریاست سے ایک منشی کو بلوانے کے لئے اس کی تحریر نمونے کے طور پر منگوائی۔ اتفاق سے جس منشی کو بلوایا گیا تھا وہ اتنا تنگ دست تھا کہ اپنے نمونے کی تحریر میں بھی ایک لفظ ایسا لکھ گیا کہ گھر میں آٹا نہیں ہے، نمونے کی تحریر لکھتے وقت اس کے گھر میں فاقہ تھا اور بچے اس سے یہی کہہ رہے تھے کہ گھر میں آٹا نہیں ہے، وہی تحریر اس نے نمونے کے طور پر اس بادشاہ کو بھیجدی۔ یہ تحریر پڑھ کر اس بادشاہ نے لکھا کہ جب تمہارا منشی ہی خوش حال نہیں ہے تو تمہاری رعایا پر کیا گذرتی ہوگی۔ بعد میں کیا ہوا اس تفصیل میں نہیں جانا، کہنے کا مطلب صرف یہ ہے کہ جس طرح ایک لفظ آٹا نہیں ہے اور جس طرح جیمس کا بولا ہوا لفظ Come in آگے چل کر ایک تاریخ بن گیا اسی طرح شمس الرحمٰن فاروقی صاحب کے اداریے، ان کے پیش کئے ہوئے سوانحی گوشے اور خطوط کے کالم میں دیئے گئے مختصر نوٹ اس بات کا ثبوت ہیں کہ اگر ایک لفظ بھی فاروقی صاحب نے غلط لکھ دیا تو وہ مستند تسلیم کرلیا جاتا ہے۔ جس طرح جیمس کے ناول میں لفظ Come in غلطی سے لکھ دیا گیا تھا لیکن وہی مستند بن گیا اس لئے کہ یہی تو اہل زبان ہوتے ہیں جن کی زبان سے نکلا ہوا ایک ایک لفظ سند کی حیثیت رکھتا ہے بلاشبہ شمس الرحمٰن فاروقی صاحب کی شخصیت ایسی ہے کہ برسوں پہلے شاید میر تقی میرؔ نے ان کے لئے ہی یہ شعر کہا تھا:

سارے عالم پر ہوں میں چھایا ہوا
مستند ہے میرا فرمایا ہوا

لیکن آج شمس الرحمٰن فاروقی ہمارے بیچ نہیں رہے۔ وہ ایک عہد ساز شخصیت تھے۔ ان کے جانے سے اردو دنیا میں جو خلاء پیدا ہوئی ہے اور جو نقصان ہوا ہے اس کی بھرپائی ممکن نہیں ہے۔ اس کے ساتھ ہمیں ذاتی صدمہ بھی پہنچا ہے، چونکہ 'انتساب عالمی' کو ہمیشہ سے ہی شمس الرحمٰن فاروقی صاحب کی سرپرستی حاصل رہی ہے۔ اللہ ان کی مغفرت فرمائے، آمین۔

☆ ☆

Kashmir Treasures Collection, Srinagar

CC-0. In Public Domain. Digitized by eGangotri.

ظہیر خان
00923213842177

شمس الرحمٰن فاروقی
ایک روشن دماغ تھا نہ رہا

ہندوستان کے شہر الہٰ آباد سے میرا تعلق ہے میں نے اپنی تعلیم اسی شہر سے مکمل کی۔ ''جمنا کرسچن کالج'' کا شمار الہ آباد کے بہترین کالجوں میں ہوتا تھا۔ میں نے انٹرمیڈیٹ یہیں سے پاس کیا۔ انٹر کا آخری سال تھا سن 1965 کا تھا کالج میں فنکشن تھا سارے طالب علم اور اساتذہ کالج ہال میں موجود تھے۔ اسٹیج پر پرنسپل صاحب (مسٹر اوڈین) اور ان کے برابر میں ایک صاحب سفید شیروانی اور چوڑی دار پاجامہ میں ملبوس، خوبصورت چہرہ، چہرے پر ہلکی سی مسکراہٹ لیے تشریف فرما تھے معلوم یہ ہوا کہ یہ صاحب مہمانِ خصوصی ہیں دہلی سے تشریف لائے ہیں اور اسی کالج کی پیداوار ہیں یعنی سابق طالب علم ہیں۔ دہلی میں کسی اچھے ادارے میں برسرِ روزگار ہیں۔ لیکن اصل مسکن الہٰ آباد ہی ہے۔ پروگرام ہوتے رہے اور بعد میں مائک پر اعلان ہوا کہ اب مہمانِ خصوصی اور اس کالج کے سابق طالب علم جناب شمس الرحمٰن فاروقی صاحب آپ لوگوں سے خطاب فرمائیں گے (یہ اعلان انگریزی زبان میں ہوا تھا)۔ پہلے تو میں یہی سمجھا کہ کوئی شاعر وائر ہیں اس لیے کہ لباس سے تو یہی لگ رہا تھا۔ مگر جب فاروقی صاحب نے انگریزی زبان میں اپنی تقریر کا آغاز کیا اور ایسی دھواں دار تقریر کی کہ بس نہ پوچھیں سارے طالب علم ششدر رہ گئے کہ شیروانی پہن کر بھی اتنی اچھی انگریزی بولی جا سکتی ہے۔ ہال میں مکمل خاموشی، شمس الرحمٰن فاروقی کا موضوع تھا انسان دنیا میں کس طرح ترقی کرتا ہے اور ترقی کرنے کے لیے اسے کن کن مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ بقول مرزا غالب ؎

دام ہر موج میں ہے حلقۂ صد کام نہنگ
دیکھیں کیا گزرے ہے قطرے پہ گہر ہونے تک

پروگرام ختم ہونے کے بعد میں نے بہت کوشش کی کہ فاروقی صاحب سے ملاقات کی جائے مگر ممکن نہ ہو سکا اس لیے کہ پرنسپل صاحب مسلسل ان کے ساتھ تھے اور ہم طالب علم ان سے بہت خوف کرتے تھے۔

انٹر پاس کرنے کے بعد انجینئرنگ کالج گیا تعلیم مکمل کی اور پاکستان آ گیا۔ اکثر کسی اخبار یا رسالے میں جب کبھی شمس الرحمٰن فاروقی صاحب کا نام دیکھتا تھا تو بہت خوش ہوتا تھا۔ الہ آباد کا کرسچن کالج یاد آنے لگتا تھا۔

شمس الرحمٰن فاروقی الہٰ آباد سے ایک علمی اور ادبی رسالہ ''شب خون'' بڑی پابندی سے شائع کیا کرتے تھے رسالہ پاکستان میں بھی بڑے ذوق وشوق سے پڑھا جاتا تھا۔ اس رسالے کی سب سے خاص بات یہ تھی کہ فاروقی صاحب نے نئے شاعروں اور ادیبوں کو زیادہ سے زیادہ موقع فراہم کیا تھا۔ ان کا کہنا تھا کہ نئی نسل ہی آنے والے کل کے معمار ہوں گے۔ فاروقی صاحب ان نئے لکھاریوں پر تنقید بھی کیا کرتے تھے، مگر وہ تنقید برائے اصلاح ہوا کرتی تھی تا کہ ان لکھاریوں کی بہترین نشو ونما ہو سکے۔ فاروقی صاحب کی کلیات اور چند دیگر کتابیں بھی کراچی کے رنگِ ادب پبلی کیشنز نے شائع کی

Kashmir Treasures Collection, Srinagar

CC-0. In Public Domain. Digitized by eGangotri.

جس کی ادبی حلقوں میں خوب پزیرائی ہوئی۔

آج صبح میرے بیٹے نے یہ دل دوز خبر سنائی کہ شمس الرحمٰن فاروقی صاحب کا الٰہ آباد میں انتقال ہوگیا۔ موت کا مزہ تو ہر کسی کو چکھنا ہے مگر کسی عظیم شخص کا دنیا سے گزر جانا، خاص طور پر ادبی دنیا سے اور پھر ایسی شخصیت جس کا نعم البدل بھی بظاہر نظر نہ آرہا ہو، تو تکلیف تو ہوتی ہے ۔فاروقی صاحب ہمہ جہت شخصیت کے مالک تھے ادب کے وہ میدان جس کے فاروقی صاحب بہترین شہسوار تھے اچانک خالی ہوگئے۔

ایک روشن دماغ تھا نہ رہا

شمس الرحمٰن فاروقی کا دور ادبی حلقوں میں دورِ فاروقی کہا جاتا ہے فاروقی صاحب دنیا سے کیا رخصت ہوئے ایک عہد کا خاتمہ ہوگیا ،ایک دور اپنے اختتام کو پہنچا، اب دیکھئے کون ہوتا ہے حریفِ مئے مرد افگنِ عشق۔

کتابیں تو ان کی بہت ساری ہیں، میں کس کس کا ذکر کروں ''تفہیم غالب''، ''شعرِ شور انگیز''، ''ارمغانِ شمس الرحمٰن فاروقی''، تین درجن سے زائد کتابوں کی ایک طویل فہرست ہے۔ فاروقی صاحب کی کلّیات تو بہت ضخیم ہے۔ ایک غزل کے صرف دو اشعار پر اکتفا کر رہا ہوں ؎

مجبور ہوا وقت کی تنگی سے میں ورنہ
یہ آخری بازی یوں ہی ہرنی تو نہیں تھی
بے صرفہ و بے شہرہ سہی عمر ہماری
ناجنسوں میں یوں کٹ کے گزرنی تو نہیں تھی

شاعر یا ادیب دنیا سے رخصت ہو جاتے ہیں مگر اپنے پیچھے جو کلام چھوڑ جاتے ہیں اگر اس میں جان ہے تو صدیاں گزر جانے کے بعد بھی وہ زندہ رہتا ہے۔ بقول میر تقی میرؔ ؎

جانے کا نہیں شور سخن کا مرے ہرگز
تا حشر جہاں میں مرا دیوان رہے گا

شمس الرحمٰن فاروقی اردو ادب کو جو قیمتی سرمایہ دے کر گئے ہیں وہ کبھی فراموش نہیں کیا جاسکے گا۔ اہلِ علم و ادب ہمیشہ اس سے مستفید ہوتے رہیں گے۔

شمس الرحمٰن فاروقی کو اللہ تعالیٰ نے ان کی زندگی ہی میں بہت عزت اور شہرت سے نوازا کم ادیب اور شاعر ہی ایسے خوش قسمت ہوتے ہیں فاروقی صاحب کو جن جن اعزازات سے نوازا گیا اس میں بھارت کا ''پدم شری ایوارڈ'' پاکستان کا سرکاری اعزاز ''امتیازِ پاکستان''، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی ڈائریکٹوریٹ کی اعزازی ڈگری غرضیکہ اعزازات کی ایک طویل فہرست ہے مگر یہ سارے اعزازات اگر ترازو کے ایک پلڑے میں ڈال دیے جائیں اور دوسرے پلڑے میں ان کی شخصیت کا صرف ایک پہلو رکھ دیا جائے تو شخصیت کا پلڑا بھاری ہوگا ان کی عظیم شخصیت کے آگے سارے اعزازات ہیچ ہیں فاروقی صاحب سے کسی اعزاز کی وابستگی خود اس اعزاز کے لیے بہت بڑا اعزاز ہے۔ اللہ تعالیٰ آخرت میں بھی اسی طرح انہیں عزت بخشے، آمین۔

میں ذکر کر رہا تھا کراچی کا کہ جب کبھی فاروقی صاحب کا نام کسی اخبار یا رسالے میں دیکھتا تو بہت خوش ہوتا تھا اور کبھی یہ سننے میں آتا کہ فاروقی صاحب کراچی تشریف لائے تھے اور واپس بھی چلے گئے تو مجھے قلق ہوتا کہ میں ان سے ملاقات کا شرف حاصل نہ کر سکا۔ معروف افسانہ نگار علی حیدر ملک صاحب کی رہائش میرے گھر کے قریب ہوا کرتی تھی میں نے ان سے اصرار کیا کہ اب جب کبھی فاروقی صاحب کراچی آئیں تو مجھے ضرور بتا دیجئے گا۔ اور ایک دن ملک صاحب کا فون آیا کہ فاروقی صاحب بہت ہی مختصر دورے پر کراچی آرہے ہیں اور آج شام آرٹس

Kashmir Treasures Collection, Srinagar

CC-0. In Public Domain. Digitized by eGangotri.

کونسل میں خطاب فرمائیں گے۔ میں نے سارے کام چھوڑے اور آرٹس کونسل پہنچ گیا۔ فاروقی صاحب کا خطاب شروع ہو چکا تھا۔ اسٹیج پر وہی چہرہ جسے ہم نے آج سے 45 سال قبل الٰہ آباد میں دیکھا تھا 'جب آتش جوان تھا'۔ میر تقی میرؔ کی شاعری پر تبصرہ فرما رہے تھے۔ ڈیڑھ گھنٹہ کی تقریر صرف اور صرف میری تقی میرؔ کی شاعری کے اردگرد گھومتی رہی۔ ایسا لگتا تھا جیسے فاروقی صاحب فاروقی صاحب نہیں ہیں بلکہ میر تقی میرؔ کا انسائکلو پیڈیا ہیں۔ ہال سامعین سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ کچھ احباب ایسے بھی تھے جو کرسیوں سے محروم تھے مگر ادبی جذبے سے سرشار ہمہ تن گوش تھے۔

تقریر ختم ہونے کے بعد میں نے اسٹیج پر جا کر الٰہ آباد اور کرسچن کالج کا حوالہ دیا، بہت خوش ہوئے گلے لگا لیا یہ کہہ کر کہ ''یار تم تو اپنے گرا ہیں ہو۔ اور سناؤ کراچی میں کیا کر رہے ہو'' میں نے تفصیلاً اپنی مصروفیات بیان کی۔ خوش ہوتے رہے اور غور سے میری باتیں سنتے رہے۔ اپنی کتاب ''کئی چاند تھے سرِ آسماں'' تحفتاً مجھے دی اپنی دستخط کے ساتھ جو میرے لیے اعزاز ہے۔

موقع کو غنیمت جانتے ہوئے کیوں نہ تھوڑی سی گفتگو اس ناول کے بارے میں بھی ہو جائے مگر اس سے قبل ناول نگار کے بارے میں بھی کچھ باتیں ہو جائیں تو بہتر ہے۔ حالانکہ میں اپنے آپ کو قطعی اس کا اہل نہیں سمجھتا۔ صورتِ حال حیرت انگیز ہے کہ جو احباب فاروقی صاحب کے مخالف ہیں وہ بھی تسلیم کرتے ہیں کہ فاروقی صاحب دورِ حاضر کے اُردو اہلِ قلم میں جینئس کی حیثیت رکھتے ہیں۔ موقع کی مناسبت سے مجھے عالم تاب تشنہ کا ایک شعر یاد آ گیا۔

ہم اپنے عشق کی اب اور کیا ضمانت دیں
ہمیں ہمارے رقیبوں نے معتبر جانا

تحقیق، تنقید، تشریح، شاعری اور افسانہ نگاری کے بعد اب اس جینئس کا ادبی میدان میں ایک نیا کارنامہ ''کئی چاند تھے سرِ آسماں'' کی شکل میں منظرِ عام پر آیا ہے۔ بظاہر یہ ناول ہے مگر اور ناولوں سے قدرِ مختلف اور پہلو دار ہے اس کے تمام کرداروں کا تعلق تاریخ سے ضرور ہے۔ مگر فاروقی صاحب ''اظہارِ تشکر'' کے زیرِ عنوان فرماتے ہیں کہ ''یہ تاریخی ناول نہیں ہے''

مصنف کا خیال ہے کہ :

> ''اسے اٹھارویں انیسویں صدی کی ہند اسلامی تہذیب اور انسانی اور تہذیبی و ادبی سروکاروں کا مرقع سمجھ کر پڑھا جائے تو بہتر ہوگا''

مندرجہ بالا سطور پر علی حیدر ملک صاحب کا تبصرہ کیا خوب ہے :

> ''یہاں دو باتیں قابلِ غور ہیں اوّل یہ کہ مرقّع کوئی ادبی صنف نہیں ہے، دوئم یہ کہ ہر ناول کسی نہ کسی تہذیب اور انسانی و تہذیبی سروکاروں کو ہی پیش کرتا ہے یہ بات بہر حال طے ہے کہ 'کئی چاند تھے سرِ آسماں' کا شمار ناول ہی کے زمرے میں ہوگا''

آٹھ سو سے زائد صفحات پر مشتمل یہ ضخیم ناول اکہتر چھوٹے بڑے ابواب میں تقسیم کیا گیا ہے تاریخی ناول عموماً کسی ایسے اہم ترین واقع کی یاد دلاتے ہیں جن کی کوئی تاریخی حیثیت ہوتی ہے اور جو اُس عہد کے حکمران یا فوجی جرنیلوں کے کارناموں سے تعلق رکھتی ہے اور یہی لوگ اس ناول کے اصل کردار اور ہیرو ہوتے ہیں۔ فاروقی صاحب نے اپنے ناول 'کئی چاند تھے سرِ آسماں' میں اس روایت سے انحراف کیا ہے اور ان شخصیات کو بطور کردار پیش کیا ہے جو ثانوی درجے کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ناول میں کردار اچھے خاصے ہیں اصل کردار وزیر خانم کا ہے

Kashmir Treasures Collection, Srinagar

CC-0. In Public Domain. Digitized by eGangotri.

جو سارے ناول کی جان ہے۔ اگر آپ کو یہ ناول کہیں سے دستیاب ہو جائے تو ضرور پڑھئے گا مگر اس بات کا خیال رہے کہ ناول پڑھنے میں عجلت نہیں کرنی ہے، سکون سے پڑھنا ہے۔ اب یہ ابن صفی کا کوئی جاسوسی ناول تو ہے نہیں جسے آپ ایک رات میں ختم کرلیں۔ اس کے لئے آپ کو اپنی کئی قیمتی راتیں قربان کرنی پڑے گی۔ تبھی تو وزیر خانم تک آپ کی رسائی ممکن ہو سکے گی۔

دورِ حاضر کے اُردو اہل قلم میں Genius کی حیثیت رکھنے والے شمس الرحمٰن فاروقی کا تعلق اسی شہر سے ہے جو میری جائے پیدائش ہے اور اسی کالج سے ہے جہاں سے میں نے تعلیم حاصل کی ہے۔ آخر اس Genius سے میری کوئی نسبت تو ہے نا ۔ ۔ !

☆ ☆

وحشی سعید کے افسانوں کے بارے میں

وحشی سعید کے افسانوں میں جو چیز سب سے پہلے متوجہ کرتی ہے وہ ان کا تنوع ہے۔ موضوع یا پلاٹ کے لحاظ سے بھی اور تکنیک کے لحاظ سے بھی ان افسانوں میں یک رنگی نہیں ہے۔ یہ بات وحشی سعید کو آج کے افسانہ نگاروں میں ممتاز کرتی ہے۔ یہاں کچھ افسانے براہ راست، سادہ اور کم وبیش روایتی بیانیہ کی مثال پیش کرتے ہیں تو کئی افسانوں میں تمثیل یعنی Allegory کا انداز اختیار کیا گیا ہے۔ تمثیل سے میری مراد یہ ہے کہ ان افسانوں میں جو بنیادی بات کہی گئی ہے اُس کے لئے کسی اور بات کا پیرایہ اختیار کیا گیا ہے۔ بادشاہ، فوجی افسر، صوفی فقیر، ناگ دیوتا، راون، دریودھن، فرعون، موسیٰ ۔ ۔ ۔ اس طرح کے فرضی یا حقیقی کرداروں کے ذریعے بات کو ذرا پردے میں رکھ کر بیان کیا گیا ہے لیکن یہ پردے اُتنے بھاری نہیں ہیں کہ قاری انہیں اُٹھا نہ سکے یا کم از کم ان کے پیچھے جھانک نہ سکے۔ کچھ افسانے علامتی اور تجریدی انداز کے ہیں۔ یہاں بات کو ذرا اور پیچیدہ کر کے کہا گیا ہے لیکن افسانہ نگار کے مافی الضمیر تک پہنچنے میں کوئی مشکل نہیں ہوتی۔ ''انتظار اور میں'' یا ''قاتل مقتول'' جیسے افسانوں کو پڑھ کر کسی تنگی یا غیر ضروری اُلجھن کا احساس نہیں ہوتا بلکہ ایک طرح کی فرحت ہی ہوتی ہے کہ تجرید اور افسانہ ایک دوسرے سے کچھ بہت الگ بھی نہیں ہیں۔

اس تنوع کے باوجود ان افسانوں میں ایک معنوی وحدت بھی ہے۔ جو احساس یا تجربہ ان افسانوں کی سطح سے ذرا نیچے لیکن واضح طور پر رواں نظر آتا ہے وہ جبر اور استبداد اور انسانوں کے ایک طبقے کا دوسرے طبقوں پر ظلم اور ان کا استحصال ہے۔ ناجائز قبضہ، اقتدار کی بھوک اور کبھی کبھی خود انسان کا ظالم اور جاہل ہونا اور جان بوجھ کر نیکی اور انصاف کی جگہ باطل اور کور ضمیری کو اختیار کرنا۔ زندگی کے یہ تجربے وحشی سعید کے افسانوں کو ہمارے زمانے کے المیے کی تصویر بنا دیتے ہیں۔

وحشی سعید کے یہ افسانے ہمیں زندگی کے بارے میں زیادہ حساس بناتے ہیں اور بظاہر روزمرہ کی زندگی سے دور ہونے کے باوجود ہمیں انسان کی موجودہ صورت حال میں شریک کرتے ہیں۔ کہیں کہیں تو یہ افسانے اس قدر اثر انگیز ہیں اور افسانہ نگار کے درد کا اتنا پُر قوت اظہار کرتے ہیں کہ بچپن کی سنی ہوئی کہانیاں یاد آجاتی ہیں۔ جس طرح ان کہانیوں کے کردار اور واقعات ہمارے لئے بالکل حقیقی اور قریبی تھے، کچھ اسی طرح یہ افسانے بھی ہمیں حقیقی اور قریبی معلوم ہوتے ہیں۔

شمس الرحمٰن فاروقی

الٰہ آباد، اگست ۲۰۱۶ء

Kashmir Treasures Collection, Srinagar

CC-0. In Public Domain. Digitized by eGangotri.

سید خورشید کاظمی
9144941907

ایک نیّرِ تاباں ڈوب گیا

اُردو ادب اور خاص کر اُردو شاعری پر سات دہائیوں سے اپنے منفرد انداز میں روشنی بکھیرتا ہوا ایک درخشندہ ستارہ عرش صہبائی ۲۶ر دسمبر ۲۰۲۰ء کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے غروب ہوگیا۔ عرش صہبائی جو ۱۹۳۰ء کو صوبہ جموں کی تحصیل اکھنور کے ایک نہایت پسماندہ گاؤں باختن میں پیدا ہوئے تھے، ۹۰ برس کی عمر میں اپنے ان گنت شاگردوں، مداحوں اور قدردانوں کو سوگوار کر گئے۔ تعلیمی مدارج سے گزرنے کے بعد وہ ۱۹۵۵ء میں ریڈیو کشمیر جموں میں ملازم ہوگئے اور ملک کی بیشتر ریاستوں میں کام کرنے کے بعد بالآخر ۱۹۸۸ء میں بحیثیت Administrative Officer ریٹائر ہوگئے۔

عرش زمانہ طالب علمی سے ہی شعر کہنے لگے تھے۔ اس شوق کو اُن کے ماسٹر مولوی عبداللہ نے ہوا دی۔ ان کا پہلا شعری مجموعہ ۱۹۵۱ء میں ''شکست جام'' کے نام سے منظر عام پر آیا۔ ان کی پہلی کاوش ہی اتنی بارآور ہوئی کہ ملک کے اُس وقت کے معتبر ادیبوں، شاعروں اور نقادوں نے انہیں سراہا۔ اہل ادب اور اہل زبان نے بعد میں دیکھا کہ عرش کا کلام دن بہ دن ترقی پر گامزن ہوا۔ وہ اپنا ایک الگ انداز بیان رکھتے ہیں۔ اس کا انہیں بھرپور احساس تھا، تبھی تو وہ کہتے ہیں :

میرا انداز سخن ہی میری پہچان ہے عرش
اس قدر بھیڑ میں بھی ہے میری آواز الگ

شرر فتح پوری نے کہا تھا کہ :

''اس دور میں آپ غزل کی آبرو ہیں اور اپنے اسلوب کے واحد تخلیق کار''

ایک اور شاعر اخگر پانی پتی نے ان الفاظ میں عرشؔ کے بارے میں کہا :

'' ۔ اب رہی بات آپ کی شاعری کی، تو موصوف نے اپنے بحر افکار کی تہوں سے ایسے عمدہ سیپ تلاش کئے ہیں جن کے شکم سے نایاب اور تابناک موتی نکلے ہیں۔ ایسے موتی جن کی چمک نہ صرف آنکھوں کو خیرہ کرتی ہے بلکہ اُن کی قدرت، اُن کی انفرادیت دل و دماغ کو ایک روح پرور طمانیت عطا کرتی ہے ۔ ۔ ''

دعوے کے ساتھ کہا جاسکتا ہے کہ اگر عرشؔ کی شاعری کا عمیق گہرائی سے تجزیہ کیا جائے تو یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ وہ یقیناً تعریف اور توصیف کے قابل ہیں کیونکہ انہوں نے اُردو شاعری کو نئی زمینیں اور نیا آہنگ عطا کیا ہے جس کا اعتراف داغؔ دہلوی کے شاگرد عزیز جوشؔ ملسیانی نے ''شکست جام'' کے مطالعہ کے بعد کیا تھا اور کہا تھا :

'' ۔ ۔ ۔ ۔ شگفتہ زمینیں تلاش کرنے میں اور مشکل زمینوں میں بھی اچھے اشعار نکالنے میں ان کی کوشش قابل ستائش ہے ۔ ۔ ''

یہ آج سے ستر برس پہلے کی بات ہے۔ تب سے لے کر آج تک عرشؔ کس اونچے مقام پر پہنچے ہیں، اس کا بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ اُن کا شعر ہے ۔

جناب عرشؔ کی یہ اہلیت تھی جس کے سبب
انہوں نے قطرے سے خود کو ہے آبشار کیا

وہ تمام موضوعات زیر آسماں جن کا تصور کیا جاسکتا ہے، جیسے حسن و عشق،

Kashmir Treasures Collection, Srinagar

CC-0. In Public Domain. Digitized by eGangotri.

ہجرووصال، غم وآلام، دردوکرب، ہمت وحوصلہ، ملکی وغیرملکی انتشار، اندرونی وبیرونی خلفشار، سیاسی اُتھل پتھل اور سیاسی قلابازیاں، پرانی قدروں کی پامالی، رشتوں کی بے قدری، غریبوں کا استحصال، سکون ودوستی کا فقدان، خلوص ووفا کی کمی، سازشیں، خوف وہراس وغیرہ، سب کا ذکر عرشؔ کے کلام میں دیکھا جاسکتا ہے۔ ایک مضمون جوان کی شاعری کا پسندیدہ ہے، وہ ہے زندگی۔ چونکہ انہوں نے ہرحال میں، ہر جگہ اس کا بڑے انہماک سے مطالعہ کیا ہے اس لئے کہا جاسکتا ہے کہ زندگی اُن کے اعصاب پر سوار رہی ہے۔ شرون کمار ورما نے اپنے الفاظ میں کہا ہے :

"۔۔ اس نے زندگی کو ایک متحرک، مجسم، تبسم معتبر اکائی کے روپ میں پیش کیا ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ عرشؔ نے زندگی سے عشق کیا ہے۔ یہی کم بخت اس کی محبوبہ ہے۔ زندگی نے اسے چرکے بھی دئے ہیں اور جھٹکے بھی، روشنی بھی دی ہے اندھیرے بھی۔ اپنے حسن کا جادو بھی جگایا ہے۔ اپنی کثافت کا شکار بھی، لطافت سے اس کی جھولی بھی بھری ہے اور تلخیاں بھی دی ہیں۔ عرشؔ نے اس کے ہر غمزہ، ہر ادا، ہر وار کو برداشت کیا ہے لیکن اُس نے اپنے عشق میں کمی نہیں آنے دی"

عرشؔ کی زندگی پریشانی اور بدحالی میں گزری ہے جس کا بیان اور اعتراف انہوں نے کھل کر اپنے کلام میں جابجا کیا ہے۔ اپنی ملازمت کے دوران انہوں نے اپنی ہی نہیں بلکہ اوروں کی بھی، خاص طور پر غریبوں، مزدوروں اور اُن لوگوں کی زندگی کا بغور مطالعہ کیا ہے جن کا اس بھری پُری دنیا میں کوئی پرسان حال نہیں۔ اپنے بارے میں وہ کہتے ہیں :

زندگی مجھ سے کیا بسر ہوتی زندگی نے کیا بسر مجھ کو

زندگی گزری ہے میری مسئلوں کے درمیاں
زندگی کے مسئلے میری طرح سمجھے گا کون

زندگی تو عمر بھر برہم رہی ہم سے مگر
جس طرح چاہا ہے ہم نے اس طرح چاہے گا کون

ایضاً ۔

میں نے تمام عمر گزاری ہے اس کے ساتھ
اس زندگی سے بڑھ کر کوئی خوب رو نہیں

زندگی کے سلسلے میں عرشؔ کی ہر غزل میں ایک دو شعر ضرور ہوتے ہیں جس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ہر صورت میں وہ زندگی کو جیے ہیں اور اُسے وہ اپنی محبوبہ جانتے ہیں۔ زندگی کے تعلق سے انہوں نے ایک سو پچاس اشعار کی غزل کہی ہے جو اُن کے ایک شعری مجموعہ میں شامل ہے۔

عرشؔ صہبائی کے کلام میں سادگی، گہرائی، گیرائی، نفاست، زبان کی سلاست اور فصاحت، ان کا اپنا سب سے مختلف اندازِ بیاں اور وہ سب کچھ دیکھنے کو ملے گا جو کہ ایک معتبر شاعر کا اثاثہ ہوتے ہیں اور اُسے وہ مرتبہ اور مقام ملتا ہے جس کا وہ حقیقی طور پر حقدار ہوتا ہے۔ وہ اپنے اشعار میں ثقیل الفاظ استعمال کرنے سے پرہیز کرتے تھے۔ کچھ عرصہ کے لئے وہ داغؔ اسکول کے نمائندہ شاعر جوش ملسیانی سے وابستہ رہے اس لئے وہ شاعری کے لوازمات اور خاص طور پر زبان سے سمجھوتہ کرنے پر کسی صورت بھی تیار نہیں ہوتے تھے اور شاید یہی وجہ تھی کہ خواہ مخواہ بہت سے دشمن بنا لئے تھے۔ لیکن میرے خیال میں یہ ایک اصلاحی پہلو ہوتا تھا جو ان کی نظر میں "تخلص کے گنہگار شاعر" ہیں۔ عرشؔ بسیار

Kashmir Treasures Collection, Srinagar

CC-0. In Public Domain. Digitized by eGangotri.

گو تھے۔ اس عمر میں بھی وہ کسب شاعری میں مصروف رہتے تھے۔ لفظ ''تھکن'' اُن کی لغت میں تھا ہی نہیں۔ ان کی ذاتی زندگی، ان کی شاعری، ان کی مصروفیات، ان کے شاگردوں جن میں، میں بھی شامل ہوں، کے بارے میں بہت کچھ لکھا جاسکتا ہے کیونکہ میرا اور اُن کا ساتھ ساٹھ سال پرانا ہے، لیکن بخوف طوالت ایسا نہیں کیا جارہا۔

ڈاکٹر شاہ نواز نے عرشؔ کی شاعری کے بارے میں اپنے احساسات کو یوں سمیٹا ہے :

'' ۔ ۔ عرشؔ کی شعری زمین پر جب بھی نزول سروش ہوتا ہے تو خوب سے خوب تر اشعار دیکھنے کو ملتے ہیں جو عرشؔ کے عہد کے کسی دوسرے شاعر کے ہاں نہیں ہیں بلکہ ایسے شعری تفکر کا تو فقدان ہی نظر آتا ہے۔ محبت کا ایسا پاکیزہ ذوق ان کی شاعری میں ملتا ہے کہ اس پر جی جان سے قربان ہونے کو جی چاہتا ہے''

میں نے اپنے دیرینہ رفیق اور اُستادِ محترم کی وفات پر چند شعر کہے تھے، اُن میں سے دو کے ساتھ رخصت ۔

اور بھی ہوں گے کئی شعر جو کہہ لیتے ہیں
منفرد عرشؔ کا اندازِ سخن ہے یارو

یہ الگ بات ہے سمجھا نہ گیا اُس کا مقام
ورنہ سچ یہ ہے وہ شہباز سخن ہے یارو

☆ ☆

مرحوم عرشؔ صہبائی کی تخلیقات ایک نظر میں

۱۔	شکست جام	۱۹۵۸ء
۲۔	شکست گل	۱۹۶۱ء
۳۔	انجم کدہ	۱۹۶۳ء
۴۔	یہ جانے پہچانے لوگ	۱۹۷۶ء
۵۔	صلیب	۱۹۷۱ء
۶۔	یہ جھونپڑے یہ لوگ	۱۹۷۶ء
۷۔	اسلوب	۱۹۹۱ء
۸۔	ریزہ ریزہ وجود	۱۹۹۵ء
۹۔	احساس	۲۰۰۱ء
۱۰۔	نایاب	۲۰۰۴ء
۱۱۔	توازن	۲۰۰۵ء
۱۲۔	دسترس	۲۰۰۷ء
۱۳۔	چشم نیم باز	۲۰۰۷ء
۱۴۔	عکس جمال	۲۰۰۷ء
۱۵۔	خدوخال	۲۰۰۸ء
۱۶۔	خوشبو تیرے بدن کی	۲۰۰۹ء
۱۷۔	تجھ بن چین کہاں	۲۰۰۹ء
۱۸۔	سائے تیری یادوں کے	۲۰۱۰ء
۱۹۔	جواز	۲۰۱۱ء
۲۰۔	شبنم تیری یادوں کے	۲۰۱۳ء

Kashmir Treasures Collection, Srinagar

CC-0. In Public Domain. Digitized by eGangotri.

بشیر دادا
6005655268

عمر مجید

ایک سچا کہانی کار، ایک سچا دوست

جڑ از مین سے کردار آسمانی تھا
اسی کی اپنی کسی ان کہی کہانی کا
وہ دوست فطرتاً اِک صبر کا سمندر تھا
کہ جس سے موجِ رفاقت اُمڈتی رہتی تھی
وہ کیا کمال تھا اُس کے سنہرے ہاتھوں کا
وہ حرف حرف عجب تتلیاں اُڑاتا تھا
مجھے یقین ہے ہر شب کوئی سروشِ ادب
ادب سے چومنے جاتا تھا اُس کے ہاتھوں کو
وہ فکر و سوچ کی وادی میں جب کبھی گم صم
کسی خیال کو پیکر میں ڈالنے لگتا
تو جیسے قوس قزح کے دریچے کھل جاتے
ہوا میں گونجتے ہر رنگ و بو کے افسانے
وہ فن شناس تھا، خوشبو کتاب کا چہرہ تھا
مزاج نرم تھا احساس ریشمی ایسا
وہ مزاج تھا اُس کے قلم کی فطرت کا
زباں سلیس تھی بے داغ تھا لباس سخن
طرح طرح کے جو شہکار اُس نے لکھے ہیں
وہ حرف حرف ہیں شاہد، وہ خواب جادوگر
زبان خامہ سے کیا خوشبوئیں پکڑتا تھا
وہ راہبر تھا فضا میں نئے پرندوں کو
طرح طرح کی مسافت سے آشنا کرتا
نئے سفر پہ سفینے نئے نکل پڑتے
تو ان کا ساتھ نبھاتا وہ بادباں بن کر
بڑے ہی شوق سے فن اور ادب کی دنیا میں
کبھی فضاؤں میں پرتو لنے جو لگتا تھا
اُسے خلا میں وہ منظر دکھائی دیتے تھے
کہ اُس کے درد بھرے دل کو ٹھیس لگتی تھی
دکھائی دیتے تھے جیسے کہ پنکھ پھیلائے
سیاہ اژدہے جیسے ہزار ہا کرگس
فضا پہ چھائے ہوئے کالے بادلوں کی طرح
وہ چیل کوے، وہ شاہیں نما کئی کرگس
کہ جن کا اصل نشیمن ہے گنبد شاہی
دکھائی دیتا تھا، سب کچھ دکھائی دیتا تھا
وہ مڑ کے اپنی زمیں پر قدم جماتا تھا
وہ اپنے چاند ستاروں کو یہ درس دیتا
خودی نہ بیچ غریبی میں نام پیدا کر
وہ اپنے شہر سے شہر ابد کے مسکن تک
کبھی نہ کر سکا اپنے ضمیر کا سودا
وہ اپنے آپ میں تا عمر ایسا قیدی تھا
کبھی نہ جس نے رہائی کی جستجو کی تھی

Kashmir Treasures Collection, Srinagar

CC-0. In Public Domain. Digitized by eGangotri.

ڈاکٹر اشرف آثاری
9419017246

انجمن میں بھی میسر رہی خلوت اُس کو

ایک سال قبل کی بات ہے، میں لال چوک میں گھنٹہ گھر کے آس پاس ہی اپنے ایک دوست کے ساتھ ٹہل رہا تھا کہ اچانک میری نگاہ بھائی عمر مجید پر پڑی۔ میں نے خیریت پوچھنے کے لئے پہل کی تو رُکے اور میری باتوں کا جواب دینے لگے اور اچانک اپنی ٹوپی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے مجھ سے سوالیہ انداز میں پوچھنے لگے :

''ڈاکٹر صاحب! آج میری ٹوپی میرے سر پر صحیح سمت میں ہے ۔ ۔ ؟''

میں نے ہنستے ہوئے جواب دیا :

''ماسٹر جی! آج آپ نے گول ٹوپی پہن رکھی ہے جو بے سمت ہے''

۲۳ر دسمبر ۲۰۰۸ء کو صبح جب میرے ایک دوست نے مجھے اس دلدوز سانحے کی اطلاع موبائل پر دی کہ کل رات عمر مجید کا انتقال ہو گیا، تو میں سکتے میں آ گیا۔ میری آنکھوں سے بے اختیار آنسو نکلنے شروع ہو گئے۔ عمر مجید جنہیں ہم ماسٹر جی بھی کہا کرتے تھے، کے ساتھ پچھلے تیس پینتیس برسوں کے تعلقات کے اہم واقعات میرے ذہن میں گھومنے لگے۔ ہمیشہ کسی گہری سوچ میں ڈوبے ہوئے، شریف النفس، سادہ طبیعت، خوش اخلاق، ملنسار و ہمدرد، مخلص و مشفق ماسٹر جی کا چہرہ، ان کا اندازِ گفتگو، روزنامہ آفتاب، روبی، تعمیر، شیرازہ، کشمیر عظمیٰ اور لاتعداد دیگر اخبار و رسائل میں دل کو چھو لینے والے ان کے افسانے اور رُلانے والی کہانیاں، ریڈیو پر نشر ہونے والے ڈرامے، ٹی وی سیریل اور روزنامہ آفتاب میں جھنجھوڑنے والے کالم، مضامین اور ڈائری وغیرہ۔ سب کچھ مختلف موضوعات پر ان کا ٹھوس اور گہرا مطالعہ اور سائنسی معلومات وذاتی مشاہدہ، سبک رفتار اور سلیقہ مند گفتگو، زندگی میں پیش آنے والے روزمرہ کے مسائل سے جھوجھنے میں ان کی بردباری اور ہمت وحوصلہ وغیرہ سب قابلِ داد تھا۔

سال ۲۰۰۸ء، فروری کو روزنامہ ''اطلاعات'' میں ''عمر مجید ۔ ہم سب کے ماسٹر جی'' کے عنوان سے میرا ایک مزاحیہ خاکہ دو قسطوں میں چھپا تھا۔ ۱۷ اور ۱۸ر فروری کے شماروں میں۔ عمر مجید نے مذکورہ مزاحیہ خاکے کو بہت سراہا اور اپنی پسندیدگی کا اظہار بھی کیا۔ اسی مزاحیہ خاکے میں، میں نے ماسٹر جی کے بارے میں ایک جگہ یوں لکھا تھا کہ :

''مختصراً میں بتائے دیتا ہوں کہ ماسٹر جی لمبے قد کے ہیں۔ داڑھی اور بال، عالم شباب سے لے کر آج تک میں نے کبھی قاعدے سے نہیں دیکھے، شاید شادی کے دن سے ہی۔ اپنے بال سنوارنے کی انہیں فرصت نہیں ملی ہے، نہ ہی اپنے پہنے ہوئے کپڑوں کے بارے میں، میں نے انہیں کبھی سنجیدہ پایا۔ سردیوں میں سر پر ٹوپی تو رکھ لیتے ہیں لیکن ان کی اس ٹوپی کا رُخ ہر لمحہ بدلتا رہتا ہے۔ کبھی یہ شمال کی جانب ہوتا ہے تو کبھی جنوب کی جانب، کبھی مغرب کی طرف ہوتا ہے تو کبھی مشرق کی طرف اور یہ ضروری بھی نہیں ہے کہ یہ رُخ صرف چار سمتی یا چوطرفی ہی ہو۔ کبھی یہ

Kashmir Treasures Collection, Srinagar

CC-0. In Public Domain. Digitized by eGangotri.

جنوب وشمال یا پھر مشرق وجنوب کی طرف بھی ہوسکتا ہے۔
اس صورت میں جب ماسٹر جی ایک جگہ آرام سے بیٹھے ہوئے ہوں، گھومنے پھرنے یا پھر چلنے دوڑنے میں ان کو ٹوپی کا رُخ متعین نہیں کیا جاسکتا، اس پریشانی سے بچنے کے لئے ماسٹر جی اکثر کوئی سمت نہ پکڑنے والی یا بنا رُخ والی گول ٹوپی ہی پہننے پر اکتفا کرتے ہیں''

تب سے جب بھی ماسٹر جی سے ملاقات ہوتی تھی تو مجھ سے ضرور اپنی ٹوپی کے بارے میں پوچھتے تھے، اگر موڈ اچھا ہوتا تھا تو۔ عمر مجید کو اُردو زبان کے ساتھ انتہائی گہرا اور والہانہ یعنی جنون کی حد تک لگاؤ تھا۔ عمر بھر بسکو سکول میں اُردو زبان کی درس وتدریس کے ساتھ وابستہ رہے۔ اب ریٹائر ہو چکے تھے۔ اُردو اکادمی کے بنیادی اراکین میں سے تھے۔ ۲۶ رمئی ۲۰۰۸ء کے روزنامہ ''اطلاعات'' میں ''اُردو اکادمی پکنک پر'' کے عنوان سے دو قسطوں پر میرا ایک انشائیہ چھپا۔ اس میں، میں نے عمر مجید کا اس طرح سے ذکر کیا تھا :

''ہم سب کے ماسٹر جی، عمر مجید خاموش اپنے بستر پر بیٹھے ہوئے خراٹے لے رہے تھے۔ دور سے انہیں دیکھنے پر ایسا اندازہ ہو جاتا کہ اپنے کسی اہم اور شاہکار افسانے کا پلاٹ سوچ رہے ہیں جسے وہ بس چند لمحوں کے بعد ہی تخلیق کرنے والے ہیں اور پھر سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر ہمیں سنانے والے ہیں، بالکل اسی طرح جس طرح انہوں نے کل والی میٹنگ میں ہمیں جان جانی جناردن والا افسانہ سنایا تھا''

۱۳ رفروری ۲۰۰۸ء بدھ کا دن تھا۔ میں اپنے کلنک میں بیٹھا ہوا مریضوں کو دیکھ رہا تھا کہ اچانک دروازہ کھل گیا اور عمر مجید اندر آ گئے۔ میں اُٹھا اور انتہائی گرم جوشی اور تپاک کے ساتھ اُن سے ہاتھ ملا کر دعا سلام کے بعد اُنہیں بٹھاتے ہوئے اپنی جگہ پر براجمان ہو گیا۔ کلنک بلڈنگ کی اوپری منزل پر ہونے کی وجہ سے عمر مجید تین چار سیڑھیاں چڑھ کر میرے پاس آئے تھے۔ ماتھے پر پسینے چھوٹ رہے تھے اور سانس بھی قدرے پھول رہی تھی۔ آتے ہی بیٹھتے ہوئے فرمانے لگے:

''میں نے فیصلہ کر لیا کہ میں پھر اُسی طرح روزنامہ آفتاب کا ادبی صفحہ ''سنڈے ایڈیشن'' کے نام سے ترتیب دیا کروں گا جس طرح یہ بہت پہلے نکلا کرتا تھا اور میں ''ادبی انکشافات'' کے تحت ایک مضمون بھی اس میں شائع کروانے کی سوچ رہا ہوں۔ میں نے سنا ہے کہ مرزا غالبؔ ذیابطیس سے انتقال کر گئے تھے اور مجھے خیال آیا کہ اس پر اگر کوئی مضمون لکھ سکتا ہے تو وہ صرف آپ ہیں۔ کل جمعرات ہے، مجھے آپ کا مضمون کل چاہیے تاکہ اُسے اتوار ۱۷ رفروری کے شمارے میں شامل کیا جاسکے''

میں یہ سب سن کر اُن سے یوں مخاطب ہو گیا :

''ماسٹر جی، آپ کا سانس پھول رہا ہے۔ آپ کا جسم پسینے سے شرابور ہے اور سیڑھیاں چڑھتے چڑھتے آپ کافی تھک گئے ہیں۔ آپ ذرا اطمینان سے پہلے دم تو لیں اور کچھ کھا پی لیں اور آرام کریں، بعد میں دیکھا جائے گا۔ ویسے میں قسم کھا کر کہتا ہوں کہ آپ جس طرح حکم کریں گے میں اُسی طرح اور بالکل اُسی بیماری سے مرزا غالب کو مار ڈالوں گا''

یہ سنتے ہی وہ اپنے مخصوص انداز میں مسکرانے لگے۔ مختصر اور قلیل مدت اور عجلت میں میرا لکھا ہوا وہ مضمون ۱۷ رفروری ۲۰۰۸ء کو ''انکشاف'' کیا

Kashmir Treasures Collection, Srinagar

CC-0. In Public Domain. Digitized by eGangotri.

غالب کی موت ذیابطیس سے ہوئی کے عنوان کے تحت روزنامہ آفتاب کے سنڈے ایڈیشن میں چھپ گیا اور پھر حال ہی میں مشہور اور کثیرالاشاعت اُردو ماہنامہ ''بزم سہارا'' دہلی میں ''معمہ غالبؔ کی موت کا'' کے عنوان کے تحت ستمبر ۲۰۰۸ء کے شمارے میں دوبارہ چھپ گیا جسے کافی ادب نواز دوستوں نے پسند کیا اور سراہا بھی۔ یہ مضمون بھائی عمر مجید کے توسل سے ہی تخلیق ہوا اور پسند کیا گیا۔

تیس سال قبل چند اُردو دوست حضرات کی محفل بسکو سکول کے صحن میں بھائی عمر مجید کی کوششوں سے جما کرتی تھی جس میں اکثر بسکو سکول سے وابستہ ایک اُردو ٹیچر کے علاوہ عام طور پر عمر مجید، عبدالرشید فراق، رفیق ہمراز اور شاید جاوید آذر بھی ایک ڈیڑھ گھنٹہ بیٹھ کر چائے وغیرہ پیتے تھے اور کچھ شاعری وغیرہ بھی ہوتی تھی۔ یہ وہی ایام تھے جب آفتاب کے سنڈے ایڈیشن کا ہمیں انتظار رہتا تھا جس میں عمر مجید، خالد بشیر، جاوید آذر، جان محمد آزاد، زاہد مختار، بشیر دادا، عطا محمد میر، قاسم سجاد، یوسف سکندر اور میری تخلیقات کے علاوہ کافی دوستوں کی تخلیقات بھی چھپا کرتی تھیں۔ واقعی روزنامہ آفتاب نے ہی ہمیں اُن دنوں ایک ایسا پلیٹ فارم مہیا کر رکھا تھا جس پر وادی سے تعلق رکھنے والے قلمکار یکجا ہو گئے تھے۔ اس میں عمر مجید کا بھرپور حصہ اور تعاون بھی شامل تھا۔

انجمن میں بھی میسر رہی خلوت اس کو
شمع محفل کی طرح سب سے جدا سب کا رفیق
مثل خورشید سحر فکر کی تابانی میں
بات میں سادہ و آزاد معانی میں دقیق

عمر مجید اپنی ذاتی زندگی میں جس قدر ملنسار و مخلص اور سادہ طبیعت اور بااخلاق شخص تھے اُسی طرح اُن کی کہانیاں بھی ان ہی اوصاف حمیدہ سے مزین، مثالی کرداروں، شائستہ اور سلیقہ مند لب و لہجے اور الفاظ واستعارات سے آراستہ اور دل کو چھو لینے والی شاہکار کہانیاں ہیں۔ انہوں نے بہت کم کہانیاں لکھی ہیں لیکن بہت خوب کہانیاں لکھی ہیں کہ ایک ایک کہانی یادگار کہانی بن گئی۔ انہوں نے کبھی مقدار کو معیار پر ترجیح نہیں دی اور نہ ہی اپنے منفرد و مخصوص معیار کے ساتھ کبھی کوئی سمجھوتہ کیا۔ وفات سے قبل میرے خیال میں دس پندرہ دن پہلے ہی مجھ سے اپنی کہانیوں کا مجموعہ مرتب کرنے کی بات کر رہے تھے اور مجھ سے لاگت وغیرہ کے بارے میں معلوم کر رہے تھے۔ جن لوگوں نے ان کے بہت بعد میں لکھنا شروع کر دیا اُن کی کہانیوں کے آج کئی کئی مجموعے ہیں۔ ان کی بہت سی یادگار کہانیوں کا ریکارڈ تک بھی آج ان کے پاس موجود و محفوظ نہیں تھا۔

روزنامہ آفتاب کے ساتھ کافی عرصے تک وابستہ رہے۔ ''کشمیر نامہ'' بہت دیر تک لکھتے رہے اور اس کی کافی اقساط ہفتہ وار چھپتی رہیں۔ ان کی دلکش طرز تحریر کی جھلک ان اقساط میں خوب دکھائی دیتی تھیں۔ جب کشمیر میں شدت کا زلزلہ آیا تھا تو انہوں نے اس کی منظر کشی انتہائی دلکش اور ظرافت آمیز پیرائے سے مملو انداز میں کی تھی جو قارئین کو بہت پسند آئی تھی۔ جب میں نے اس کا اعتراف ان سے کیا تو بہت خوش ہو گئے۔ ویسے بھی وہ اُردو زبان کے میرے پسندیدہ افسانہ نگاروں میں سے تھے۔

عمر مجید ہمیشہ سے ہی ادب برائے ادب کے نہیں بلکہ ادب برائے زندگی کے قائل رہے۔ غالباً اسی لئے اُن کی تحریروں کو کوئی نہ کوئی اصلاحی پہلو ضرور نکلتا ہے۔ اُردو کہانی میں ان تین دہائیوں میں جو مختلف موڑ آئے وہ اُن سے ذرا بھی متاثر نہ ہوئے بلکہ وہ ہمیشہ اپنی الگ اور منفرد ڈگر پر مضبوطی کے ساتھ قدم جمائے ہوئے ڈٹے رہے۔ انہوں نے نہ تو ابہام زدہ کہانیاں ہی تحریر و تخلیق کیں اور نہ ہی جدیدیت

Kashmir Treasures Collection, Srinagar

CC-0. In Public Domain. Digitized by eGangotri.

والی لایعنیت نے انہیں کبھی ورغلایا۔ ان کی کہانیاں زندگی سے قریب تر ہیں، بالکل ویسے ہی جس طرح وہ اپنی ذاتی زندگی میں زندگی سے قریب تر رہے۔ اپنوں اور پرائیوں کے غم بانٹتے رہے۔ اپنے طالب علموں کے ساتھ منسلک رہے۔ اپنے معاشرے اور سوسائٹی سے منسلک اور جڑے رہے، حالانکہ اُن کی سادہ خیالی، پاکیزہ اور صوفیانہ فکر و سوچ، بلند کردار اور نیک سیرتی دیکھ کر ایسا لگ رہا تھا کہ شاید یہ اوصاف رکھنے والا خوددار شخص اس غلیظ و کثیف معاشرے اور دنیا کو تیاگ کر رہبانیت یا پھر تنہائی اختیار کرلے گا، لیکن چونکہ رہبانیت کا چلن اسلام میں نہیں ہے اس لئے وہ زندگی کی آخری سانس تک ایک مجذوب صوفی و قلندر کی طرح زندگی گزارتے رہے۔ غالباً یہی وہ جذبہ تھا جو اس مرد قلندر کو Depression بلند فشار الدم (ہائی بلڈ پریشر) وغیرہ جیسی بیماریوں کی موجودگی میں بھی لال چوک جیسے لوگوں سے کھچا کھچ اور مصروف ترین شہر میں بھی اپنی قلیل و کم بینائی والی آنکھوں کو نیچے کئے ہوئے آہستہ آہستہ اور مدھم لے میں چلواتا پھرواتا تھا اور اپنے زندگی بھر کے ساتھی قلم سے ہم سب کے لئے اچھی اچھی چیزیں تخلیق کرواتا تھا اور اپنے اُس منصب و فریضے کو انجام دلواتا تھا جو خالق کائنات اور رب لم یزل نے اس کے لئے مقرر کر رکھا تھا۔

عمر مجید کے ساتھ جن لوگوں کے قریبی روابط رہے ہیں وہ اس بات پر متفق ہیں کہ اس فرشتہ صفت انسان کو زندگی میں مسکرانے کے بہت کم مواقع ملے ہیں، لیکن اس بات کے باوجود بھی صبر و استقامت کا مادہ اس میں اس حد تک کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا کہ دماغ و ذہن پر پریشانیوں، اندیشوں اور بیماری کے زبردست اور شدید کوڑے برسنے کے باوجود بھی اُف تک نہیں کرتے تھے کہ دوسرے پریشان نہ ہوں۔ ہاں صرف ایک اپنے عمر بھر کے ساتھی قلم سے کچھ نہ چھپاتے تھے اور دوسرا اپنا معاملہ اپنے خالق سے پوشیدہ نہیں رکھتے تھے۔ اس سے کوئی چھوٹی یا بڑی بات پوشیدہ رہ بھی کیسے سکتی تھی جس نے میرے بھائی عمر مجید کو اتنا صابر و شاکر بنا رکھا تھا کہ شاید وہ بھی میرے بھائی کا پتھر کا کلیجہ دیکھ کر اس سے کچھ کہلوانے اور سننے کا منتظر تھا کہ کب یہ شخص پھوٹے گا، کسی کا گریباں پکڑ کر شکایت یا گلہ کرے گا، اُف، آہ یا وائے اپنی زبان پر لائے گا، لیکن میرا بھائی عمر مجید جانتا تھا کہ ؎

نہیں ہے زخم کھا کر آہ کرنا شانِ درویشی

(تحریر: مئی ۲۰۱۰ء)

☆ ☆

''عمر مجید کو افسانے لکھنے کا ڈھنگ آتا ہے۔ ان کی نظر اپنے اطراف کی زندگی کا مشاہدہ کرنے کی صلاحیت رکھتی ہے اور ان مشاہدات کو وہ سلیقہ سے بیان کرنے کے اسلوب پر بھی قدرت رکھتے ہیں۔ نیچے کے طبقے کے لوگوں، کسانوں اور مزدوروں کی قابل رشک زندگی ان کا عام موضوع ہے''

مرحوم عبدالقادر سروری
''کشمیر میں اُردو''

Kashmir Treasures Collection, Srinagar

CC-0. In Public Domain. Digitized by eGangotri.

دیپک بدکی
9868271199

عمر مجید
ایک حساس افسانہ نگار

جموں وکشمیر میں اردو افسانے کا سفر اتنا ہی طویل ہے جتنا کہ ملک کے دیگر اردو مراکز میں۔ یہ بات سچ ہے کہ اس یونین ٹیرٹری میں اردو کسی کی مادری زبان نہیں ہے مگر جس طرح انگریزوں کے زمانے سے انگریزی زبان کو سارے ملک میں فروغ حاصل ہوا اسی طرح ڈوگرہ حکمرانوں کے زمانے سے اردو کو بطور ترسیلی زبان کے رائج کیا گیا اور نظم ونثر ہر دو اصناف میں جموں وکشمیر سے کئی نامور ادیب ابھر آئے۔ بدقسمتی سے اردو کے تنقید نگار یہاں کے ادیبوں اور شاعروں کو نظر انداز کرتے رہے اور ان کو وہ مقام حاصل نہ ہوا جو ان کا جائز حق تھا۔ وادی کے گنے چنے ناقدوں نے بھی کشمیری تخلیق کاروں کو فراموش کیا۔ حالانکہ یہاں کے کئی معروف افسانہ نگار ماہنامہ بیسویں صدی، آج کل، شب خون اور دیگر معتبر رسالوں میں بڑی آب وتاب کے ساتھ مسلسل چھپتے رہے۔

عمر مجید وادی کشمیر کے ایسے ہی ایک مایہ ناز افسانہ نگار ہیں جن کے افسانے ملک کے معیاری جرائد میں شائع ہوتے رہے۔ ان کا پہلا افسانہ 'ایک بوڑھا ولر کے کنارے' ۱۹۶۵ء میں روزنامہ آفتاب سرینگر میں شائع ہوا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب جدیدیت کا طوطی بول رہا تھا۔ ہر کوئی اپنی شناخت قائم کرنے کے لیے علامتوں، کنایوں اور استعاروں کا بے دریغ استعمال کرتا رہا یہاں تک کہ پلاٹ، کردار اور منظر نگاری پر سوالات کھڑے کیے گئے اور جستہ جستہ افسانے سے 'کہانی' غائب ہوگئی۔ عمر مجید بھی اس تحریک سے کافی متاثر ہوئے اور انھوں نے بھی علامتی اظہار کا سہارا لیا مگر اس کے باوجود وہ بیانیہ اور کہانی پن سے اپنا دامن نہیں چھڑا سکے۔ نتیجے میں ان کے افسانے جہاں جدید طرز کے تھے وہیں ان میں نہ ترسیل کا المیہ تھا اور نہ کہانی پن کی کمی تھی۔ افسوس اس بات کا ہے کہ وہ اپنی ان سبھی تحریروں کو یکجا نہیں کر پائے اور ان کو کتابی شکل میں شائع نہیں کر پائے۔ یہ ہماری خوش قسمتی ہے کہ سلیم سالک نے عمر مجید کی وفات کے بعد ان کے افسانوں کا انتخاب بعنوان 'عمر مجید کے بہترین افسانے' سن ۲۰۰۹ء میں شائع کر کے ان سے کیا ہوا وعدہ وفا کیا۔ مجموعے میں چند افسانچے بھی شامل ہیں۔ اس طرح افسانہ نگار کا کچھ تو سرمایۂ حیات محفوظ ہوا۔

عمر مجید سے میری ملاقات اچانک ۱۹۹۸ء کے آس پاس ہوئی۔ وہ میرے دفتر میں مجھ سے ملنے آئے اور ہم نے افسانے، ادب اور کشمیر کے حالات سے متعلق کئی موضوعات پر گفتگو کی۔ ان کے بارے میں کئی دوستوں سے سنا تھا مگر ان کی تحریروں کا مطالعہ نہیں کیا تھا۔ ان کو دیکھ کر بہت خوشی ہوئی کیونکہ سیکورٹی کے باعث میں جی پی او کے احاطے سے باہر نہیں جاتا تھا۔ مجھے عمر مجید کی وہ پہلی ملاقات آج تک یاد ہے۔ ایک تھکا تھکا سا فکر مند چہرہ جس پر بے اطمینانی صاف جھلک رہی تھی، ذہن میں منتشر خیالات کی کلبلاہٹ اور لہجے میں کچھ بے ربطی سی محسوس ہو رہی تھی۔ میں نے ان سے پوچھا کہ کیا ان کے افسانے کتابی صورت میں شائع ہوئے ہیں تو معلوم ہوا کہ بہت عرصہ پہلے ان کے دو ناول 'یہ بستی یہ لوگ' (۱۹۷۰ء)، 'درد کا دریا' (۱۹۷۶ء) اور افسانوں کا ایک مجموعہ 'اجالوں کے گھاؤ' (۱۹۶۸ء) شائع ہوئے تھے جن کا کوئی بھی نسخہ

Kashmir Treasures Collection, Srinagar

CC-0. In Public Domain. Digitized by eGangotri.

اب ان کے پاس موجود نہیں تھا۔ غرض تیس سال کی مدت گزر چکی تھی اور اس درمیان انھوں نے کئی افسانے قلم بند کیے تھے مگر نہ تو انھوں نے افسانوں کی نقل یا شائع شدہ کاپی ترتیب سے اپنے پاس رکھی تھی اور نہ ہی ان کے پاس ان کے شائع ہونے کی تفصیل دستیاب تھی۔ جہاں تک میرا قیاس ہے چونکہ عمر مجید روزنامہ آفتاب کے ساتھ بطور اسسٹنٹ ایڈیٹر منسلک رہے، اخبار کے ادبی گوشہ کی ادارت اور کالم نگاری بھی کرتے رہے، بہت ممکن ہے کہ ان کی بیشتر کہانیاں اسی اخبار میں شائع ہوئی ہوں جنھیں آفتاب کی فائلوں میں تلاش کرنا ضروری ہے۔ بقول عمر مجید :

> ''میں روزنامہ 'آفتاب' کی پیداوار ہوں۔ 'آفتاب نے مجھے گویائی بخشی اور پروان چڑھایا۔ اس لحاظ سے مدیر آفتاب خواجہ ثنا اللہ بٹ ناچیز کے مربّی بھی ہیں اور مخدوم بھی۔'' (عمر مجید کے بہترین افسانے ص ۱۹، بحوالہ روزنامہ کشمیر عظمیٰ ۱۵ر جنوری ۲۰۰۸ء)

دو تین روز بعد وہ میرے پاس دوبارہ آئے اور حال ہی میں شائع ہوئے اپنے چار افسانوں کی زیراکس کاپی عنایت کی۔ ان افسانوں کو پڑھ کر مجھے احساس ہوا کہ عمر مجید افسانہ نگاری میں یکتا ہیں اور غریب اور پسماندہ طبقے کے دکھ درد کو بڑی ہنرمندی سے پیش کرتے ہیں۔ وہ جو بھی علامتیں استعمال کرتے ہیں وہ عام فہم ہوتی ہیں اور قارئین کو ان علامتوں کے پیچھے چھپی ہوئی سچائی تک رسائی پانا مشکل نہیں ہوتا۔ غریب پرور 'چنار' کو عمر مجید نے کئی افسانوں میں بطور علامت استعمال کیا ہے۔ کہیں وہ خود جل کر غریب جاروب کش کے کنبے کو گرمی پہنچاتا ہے، کہیں غریب کی جھونپڑی پر ڈھال بن کر اس کو برف اور بارش سے بچاتا ہے اور کہیں سارے ماحول کو اپنی ہریالی سے تر و تازہ کرتا ہے۔

افسانہ 'مردہ چنار' میں چنار کی تجسیم بڑی ہنرمندی سے کی گئی ہے، چنار جو خزاں میں غریبوں کی کانگڑی کے لیے کوئلہ مہیا کرتا ہے۔ غریبوں کی کسمپرسی کی عکاسی اور پھر دولت مند ٹھیکیداروں کا ان سے یہ آسائش بھی چھین لینا بڑی دلسوزی کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ اسی طرح 'برف کے پھول' قدرت کی چارہ گری کا کرشمہ ہے کہ دُولھے کو ہر دم یہ خدشہ رہتا ہے کہ دُلھن کے ساتھ گھر پہنچ کر پانی کے رسنے کی وجہ سے کہیں پر بیٹھنے کی جگہ نہیں ملے گی مگر وہ یہ دیکھ کر حیران ہو جاتا ہے کہ چنار کی شاخوں نے برف کو روک لیا ہے اور مکان پر گرنے نہیں دیا ہے۔ عمر مجید کے افسانوں میں بیانیہ غالب ہے تاہم وہ مکالمے کا بھی حسب ضرورت استعمال کرتے ہیں۔ بہرحال وہ ہر صورت میں زمینی حقیقت سے جڑے رہتے ہیں۔ ان کے افسانے کشمیر کے ماحول، کلچر اور تہذیب کا آئینہ ہیں اور وہ اکثر و بیشتر کردار اپنے پاس پڑوس سے چن لیتے ہیں۔ ان کا مشاہدہ بھی عمیق ہے اور مطالعہ بھی کافی وسیع ہے۔

سال بھر میں ہی میرا تبادلہ ہوا اور پھر میں ۲۰۰۵ء میں واپس سرینگر بطور چیف پوسٹ ماسٹر جنرل کے تعینات ہوا۔ اس بار بھی عمر مجید سے میری ملاقات آفس میں ہی ہوئی۔ مگر ان کو دیکھ کر بہت مایوسی ہوئی۔ چہرے پر ذہنی انتشار نمایاں تھا، جسم اندرونی ٹوٹ پھوٹ سے کمزور ہو چکا تھا اور گفتگو کے دوران لگتا تھا کہ ان کی سوچ اور اظہار میں ربط نہیں ہو پا رہا ہے۔ انھوں نے وہ قصہ سنایا جس نے ان کے وجود کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا تھا۔ عمر مجید نے سی ایم ایس بسکو سکول، امیرا کدل میں تعلیم حاصل کی تھی اور پھر وہیں پر معلم کی حیثیت سے تقرری ہوئی۔ وہاں وہ قریباً چالیس برس اپنے فرائض انجام دیتے رہے اور آخر میں ہیڈ ماسٹر کے عہدے سے سبکدوش ہوئے۔ وہاں پر ایک ایسا واقع پیش آیا جس نے نہ صرف ان کے ذہن کو ماؤف کر دیا بلکہ ان کے قلم کو بھی مسدود کر دیا۔

Kashmir Treasures Collection, Srinagar

CC-0. In Public Domain. Digitized by eGangotri.

ان کے سکول کے سامنے گولی باری میں ان کا ہمسایہ حجام، عبدالخالق گولیوں کا نشانہ بن گیا۔ جونہی عمر مجید کی نظر خون سے لت پت عبدالخالق پر پڑی تو انھوں نے اس کو گھسیٹ کر اپنے سکول کے احاطے میں پہنچا دیا مگر اس نے عمر مجید کی گود میں دم توڑ دیا۔ اس حادثے کے بعد عمر مجید گوشہ نشین ہو گئے اور پھر کبھی اپنی پرانی لے میں نہ آسکے۔ یہ قصہ سن کر میرا شک یقین میں بدل گیا کہ ان پر کچھ شدید ذہنی دباو حاوی ہو چکا ہے اور وہ اس سے خود کو نکال نہیں پا رہے ہیں۔ تاہم میں نے اس طرف ان کو متوجہ نہیں کیا۔ کچھ گفتگو کے بعد وہ رخصت ہو گئے۔ اپنے پیچھے ایک عجیب سی غمزدگی چھوڑ گئے۔ اس کے بعد کبھی ملنے کا موقع نہ ملا۔ دسمبر ۲۰۰۸ء میں ان کی رحلت کی اطلاع ملی۔

عمر مجید کے افسانوں میں موضوعاتی تنوع اور فکری نکتہ رسی ملتی ہے۔ وہ اپنے افسانوں میں سماجی، سیاسی اور معاشی مسائل کو اجاگر کرتے ہیں۔ وہ غریبوں اور محتاجوں کی نمائندگی بڑی ہنروری سے کرتے ہیں اور استحصال کرنے والوں کو آئینہ دکھاتے ہیں۔ افسانہ 'گونگے گلاب' گھریلو تشدد کی شکار عورت اور اس کے کمسن بیٹے کی داستان ہے جو باپ کے تشدد کے باعث گونگا ہو جاتا ہے۔ افسانے میں لاوارث بچوں کے حشر کو بھی بڑے دلدوز طریقے سے درشایا گیا ہے۔ افسانہ 'بادشاہ' میں سلطانی اور جمہوری دور کے فن کاروں کا موازنہ کیا گیا ہے کہ ہر دور میں جب بھی کسی فن کار یا قلم کار نے انسانی دکھ درد، غریبی اور مفلسی کی ترجمانی کی تو اسے سولی پر چڑھایا گیا کیونکہ دونوں صورتوں میں حکمران زمینی حقیقت سے آشنا ہونا ناپسند کرتے ہیں۔ 'تاریخ ساز' میں بنی نوع انسان کی تاریخ پر فوکس کیا گیا ہے جس میں صرف ان لوگوں کا ذکر ہوتا ہے جو فتح یاب حکمران ہوتے ہیں یا پھر ان کے درباری ہوتے ہیں جبکہ عام فن کار چاہے کتنے بھی مقبول کیوں نہ ہوں تاریخ انھیں ہمیشہ فراموش کرتی ہے۔ موڈرن سوسائٹی میں انسانی وجود کی ارزانی اور حادثے میں فوت ہوئے لڑکے پر گواہی نہ ملنے کو افسانہ 'لاتعلق' میں پیش کیا گیا ہے۔

عمر مجید نے جہاں ایک جانب کشمیر کی دہشت گردی پر قلم اٹھایا ہے وہیں پولیس کے تشدد کو بھی بے نقاب کیا ہے۔ 'میری گلی کا غم' میں راوی عجیب سی کشمکش میں مبتلا ہو جاتا ہے، ایک طرف اس کے اپنے کیریئر کی اڑان ہے اور دوسری طرف پڑوسی کے غم میں شریک ہونے کی مجبوری جس کا بیٹا پولیس کی گولی سے جان بحق ہو گیا ہے۔ اخلاقی ذمے داری اس کے ضمیر کو جگاتی ہے اور وہ تعزیت کے لیے پڑوسی کے گھر چلا جاتا ہے۔ اس افسانے میں افسانہ نگار نے سیاست دانوں کی خود غرضی اور موقع پرستی کو بھی بے نقاب کیا ہے۔ ہمسایہ کے غم میں شرکت کرنے کی مثال افسانہ 'ماتم کے بعد' میں بھی ملتی ہے۔ اِدھر سرکاری اتیاچار کا ایک اور پہلو 'تلاشی' میں اجاگر کیا گیا ہے کہ ایک غریب قلم کار کے گھر کی تلاشی اس لیے لی جاتی ہے کہ اس پر بدیسی مال رکھنے اور بیچنے کا شبہ ہوتا ہے۔ اسی طرح اندیشے کی بنا پر کریک ڈاؤن، مخبری اور معصوم لوگوں کی پکڑ دھکڑ اور ان پر عقوبتی کارروائی افسانہ 'لاپتہ' میں منعکس کی گئی ہے۔ ہندوستان، پاکستان اور کشمیر سے متعلق ایک علامتی کہانی 'گمشدہ جنت' بھی مجموعے میں شامل ہے جس میں کشمیر میں پھیلے ناسور کو اجاگر کیا گیا ہے۔ بقول افسانہ نگار اس کا حل صرف کشمیریوں کے پاس ہے۔ عمر مجید کا ماننا ہے کہ نفرتیں، تشدد، خونریزی اور جنگ و جدل کا پٹارا 'پنڈورا' کے اس صندوق کی مانند ہے جس کو کھولنے سے دنیا میں تباہی مچ جاتی ہے۔ ملاحظہ کیجیے افسانہ 'پنڈورا کی نئی کہانی'۔ افسانہ 'وطن' میں بٹوارے کے دوران بچھڑا ہوا ایک شخص کشمیر جانے کے لیے امرتسر پہنچ جاتا ہے مگر اسی وقت ہندوستان اور پاکستان میں جنگ شروع ہو جاتی ہے اور اس کا

Kashmir Treasures Collection, Srinagar.

CC-0. In Public Domain. Digitized by eGangotri.

خواب ادھورا رہ جاتا ہے۔ انتظامیہ کی جابرانہ کارروائی کی ایک اور مثال افسانہ 'نوحہ' میں جھلکتی ہے کہ ایک معصوم لڑکی کو امتحان ہال میں ننگا کر کے نقل ڈھونڈنے کی کوشش کی جاتی ہے اور وہ غصے میں آ کر تلاشی لینے والی پولیس انسپکٹر کو تھپڑ مارتی ہے جس پر اس کے خلاف ایف آئی آر درج ہوتا ہے۔

چنانچہ عمر مجید نے ایسے سکول میں تعلیم پائی اور پھر وہاں پر معلّمی بھی کی جہاں انھیں ہر مذہب اور فرقے کے طالب علموں سے واسطہ پڑتا تھا اس لیے ان کی سوچ وفکر میں سیکولرازم کا کافی اثر نظر آتا ہے۔ کشمیری صوفی ریشیوں کے سبب ان کی تحریروں میں روحانیت کی رمق بھی دکھائی دیتی ہے۔ 'محمد شمیم کو گھر جانا ہے' ان کا شاہکار افسانہ ہے جو گنگا جمنی تہذیب، صوفیوں رشیوں پر عقیدت، کشمیریت اور سیکولر روایت کا آئینہ دار ہے۔ اس میں ایک کشمیری ہندو افسر محمد شمیم کے ہاتھ روپے بھیجتا ہے تاکہ وہ بابا ریشی کی درگاہ پر جا کر روایت کے مطابق چولہا لیپ دے تاکہ ان کی بیٹی کا بچہ پیدا ہو۔

انسانی نفسیات کا مشاہدہ عمر مجید نے بہت دقیقہ ریزی سے کیا ہے۔ ان کے یہاں انفرادی اور اجتماعی شعور دونوں کی بازگشت ملتی ہے۔ 'سب سے بڑا غم' ایک ایسے مفلس کی کہانی ہے جو خدا کے فرشتے سے اپنی زندگی کے تیس سال کم کرنے پر راضی ہوتا ہے بشرطیکہ اس کو من چاہی خوشی، دولت اور آسائشیں مل جائیں۔ زندگی کے باقی ماندہ دس سال پلک جھپکتے ہی گزر جاتے ہیں مگر اس دوران اس کو ہمیشہ یہ فکر لاحق ہوتی ہے کہ موت دبے پاؤں آ رہی ہے۔ 'شہر کا اغوا' میں بنی نوع انسان کی بے انتہا لالچ اس کو خاکستر کر دیتی ہے۔ انسانی نفسیات اور سماجی نا انصافی کا ایک اور پہلو 'درد کا مارا' میں سامنے آتا ہے جس میں ایک آسودہ حال ریٹائرڈ آدمی بیٹی کے بانجھ پن اور طلاق کی فکر میں غلطاں ایک بھکارن کو پانچ سو روپے کا نوٹ بطور خیرات دیتا ہے مگر وہ اس کو جسمانی دعوت سمجھ بیٹھتی ہے۔ 'پرچھائیاں' میں ازدواجی تشکیک کے سبب سارا گھر پراگندہ ہو جاتا ہے۔ افسانہ 'کسک' میں ایک باپ اپنی بیٹی کو یاد کرتے ہوئے اس کی صورت سے ملتی جلتی سیاح لڑکی کو پیار کرتا ہے مگر لڑکی کے والدین اس کو بھکاری سمجھتے ہیں۔ 'ریزہ ریزہ' عمر رسیدہ لوگوں کے احساس حاشیہ سازی پر لکھا گیا پُر اثر افسانہ ہے۔ افسانہ 'کھیل' میں بھی ایک سن رسیدہ جوڑے کا انتظار تب صدمے میں بدل جاتا ہے جب انھیں امریکہ سے لوٹے ہوئے بیٹے کے بارے میں پتہ چلتا ہے کہ وہ ایڈس کی بیماری میں مبتلا ہے۔ افسانہ 'یہ شام بھی کہاں ہوئی' ایک ایسے کشمیری نوجوان کی کہانی ہے جو سیاحوں کا کشمیری عورتوں کو بری نظر سے دیکھنے پر تلملا جاتا ہے اور انتقام لینے کے لیے ممبئی کے ریڈ لائٹ ایریا میں پہنچ جاتا ہے مگر وہاں بھی اسے دو کشمیری طوائفوں سے سابقہ پڑتا ہے۔ 'چھوٹا آدمی' میں ایک ڈرائیور اپنی بیوی کو ورغلانے کے لیے مالک پر شک کرتا ہے مگر اصلیت جان کر شرمسار ہوتا ہے کہ مالک اس کی بیوی کو بیٹی کہہ کر پکارتا ہے۔

مجموعی طور پر دیکھا جائے تو عمر مجید کی رگ رگ میں کشمیر سمایا ہوا ہے، وہ کشمیریوں کی معاشی تنگدستی، سیاسی عدم استحکام اور سماجی قدامت پرستی پر نالاں ہیں اس لیے ان مسائل پر قارئین کو متوجہ کرنے کی مسلسل کوشش کرتے ہیں۔ ان کا اسلوب منفرد ہے اور زبان پر ان کو دسترس حاصل ہے۔ علامتوں اور استعاروں کو بڑی خوبی سے استعمال کرتے ہیں۔ ان کے افسانے پڑھنے والوں کی فکر وسوچ کو مہمیز کرنے میں کامیاب ہوتے ہیں۔ بدقسمتی سے اجل نے انھیں ہم سے بہت جلدی چھین لیا ورنہ ابھی ان کے پاس لکھنے کو بہت کچھ تھا۔ ☆

Kashmir Treasures Collection, Srinagar

CC-0. In Public Domain. Digitized by eGangotri.

مرحوم عمر مجید کا خط

جاوید آذر صاحب کے نام

ایک زمانے میں جب کشمیر کے حالات نے ایک نیا رُخ اختیار کیا، زندگی مشکل ترین دور سے گزرنے لگی، تو مرحوم عمر مجید نے خاموشی اختیار کی۔ کئی برسوں کی مسلسل خاموشی کے بعد اُن کا افسانہ ''گم شدہ جنت'' کشمیر عظمیٰ میں شائع ہوا۔ اس کہانی کے ساتھ اُن کا ایک خط بھی شائع ہوا تھا۔ یہ خط اُن کی ادبی خاموشی اختیار کرنے اور پھر خاموشی توڑنے کے اعتبار سے بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ (ادارہ)

ٹھیک دس سال بعد آپ کے دل کے دروازے پر دستک دے رہا ہوں یا شاید دس جنموں کے بعد ۔ ۔ کچھ ٹھیک یاد نہیں۔ یادوں کے الاؤ سے اُٹھنے والا ملگجی دھواں، جہلم کے سینے پر دُھند کی دبیز تہہ، ڈل کے پیلے زرد آئینے، شالیمار کے زہریلے آبگینے، زبرون پہاڑی کے بھیانک سایے، نگا پربت کی بے رحم سنگلاخ عمودی چٹانیں، گلمرگ کی اُداس وادیاں، سونہ مرگ کی سیاہ کالی برف، جہنم کی آگ، دس برس، دس جنم، یہ دس جنم کیسے بیتے مجھے کچھ نہیں معلوم۔ ٹھیک دس برس پہلے میں دسویں جماعت کے طلبہ کو اقبالؔ کا تصورِ انسانیت پڑھا رہا تھا۔ مرد مومن کے اوصافِ حمیدہ بیان کر رہا تھا۔ بچے انہماک سے سُن رہے تھے کہ اچانک لال چوک میں گھنٹہ گھر کے قریب ایک زبردست دھماکہ ہوا اور پھر گولیوں کی گھن گرج میں سبق کو ادھورا چھوڑ کر باہر آیا۔ سکول کا داخلی دروازہ بند کیا جا چکا تھا۔ ایک زخمی شخص جس کے سر سے خون کا فوارہ چھوٹ رہا تھا، دروازے کے پاس لیٹا کراہ رہا تھا۔ میں نے دروازہ کھولا اور اس ادھیڑ عمر کے زخمی شخص کو تقریباً گھسیٹ کر اندر لے آیا۔ وہ زندہ تھا لیکن خون کی سرخ لکیریں اس کی داڑھی کے بالوں کو رنگین کرتی جا رہی تھیں اور پھر اُس شخص نے میری گود میں دم توڑ دیا۔ میں اُسے پہچان چکا تھا۔ وہ عبدالخالق تھا۔ ہمارے محلے سونہ وار کا خالق حجام۔ عبدالخالق ۔ ۔ ایکسی لنٹ ہیر کٹنگ سیلون کا مالک۔ کسی کام سے لالچوک آیا ہوا تھا۔ طاقتور بم کا ایک بڑا سا ٹکڑا ٹھیک اُس کے سر کے پیچھے لگا تھا۔ عبدالخالق نے میرے ہاتھوں میں دم توڑا۔ میں نے زندگی میں پہلی مرتبہ کسی کو ایڑیاں رگڑتے ہوئے مرتے دیکھا تھا۔ پھر پولیس آئی۔ لاش کو اُٹھا کر لے گئی اور میں اپنے ہاتھوں کو دیکھتا رہا جو تازہ بہتے ہوئے خون میں نہا چکے تھے۔ اُس رات میں بالکل نہ سو سکا اور دوسرے دن سکول بھی نہ جا سکا۔ خاموش پڑا عبدالخالق کے بارے میں سوچتا رہا۔ کئی راتیں بیت گئیں، دن بیت گئے۔ میں اپنے آپ کو خالی خالی سا محسوس کرنے لگا۔ اسی حالت میں ایک ہفتہ گزر گیا۔ فاطمہ پریشان، نوشابہ حیران ۔ ۔ یہ پاپا کو کیا ہو گیا؟ قلم، کتاب، نماز ۔ ۔ سب کچھ چھوٹ گیا اور پھر مجھے ایسا لگا کہ میں بہت بیمار ہوں۔ مصیبت کی راتیں میرے لئے ٹھہرائی گئی ہیں۔ راتیں لمبی ہوتی گئیں۔ میرا جسم کیڑوں اور مٹی کے ڈھیلوں سے ڈھکنے لگا۔ میری آنکھ خوشی کو نہ دیکھ سکی۔ روح کی تلخی، جان کا عذاب، مستقبل کا غم۔ میں زندہ تھا لیکن ایک بے گور کفن لاش کی طرح اور پھر یگ بیتے۔ الفاظ جن کے ساتھ میں کھیلا کرتا تھا اور جو میری لونڈی تھے، میرے لئے اجنبی بن گئے۔ ایکسی لنٹ ہیر کٹنگ سیلون کے مالک عبدالخالق اور اُس کے خون میں لت پت چہرے کو بھلا نہ سکا۔ وہ بچپن میں میرے بال کاٹتا ہوا آیا تھا۔ پھر ایک

Kashmir Treasures Collection, Srinagar

CC-0. In Public Domain. Digitized by eGangotri.

دن جب اُسے پتہ چلا کہ درس وتدریس کے ساتھ ساتھ میں اُلٹی سیدھی کہانیاں بھی لکھتا ہوں تو اُس نے مجھ سے کہا، میری بھی کہانی لکھئے۔ میں تمہیں اپنی کہانی سناتا ہوں اور اُس نے مجھے اپنی کہانی سنائی اور مجھے یقین ہوگیا کہ ہر شخص اپنی ذات میں ایک افسانہ ہے، ناول ہے، ایک پیچیدہ افسانہ، تہہ در تہہ، افسانہ در افسانہ ۔ ۔! عبدالخالق ہر رات ساڑھے آٹھ بجے ریڈیو پاکستان سے خبریں سنتا تھا۔ کشمیر اُس کی پہلی محبت تھی۔ میں اب بھی در در بھٹک رہا ہوں، اپنا کشکول لئے کہ شاید کوئی میرا مسیحا بن کر میرے درد کو سمجھے۔

(کشمیر عظمیٰ ؛ ۳۰ر دسمبر ۲۰۰۴ء)

☆ ☆

مرحوم عمر مجید کا تحریر کردہ مختصر ترین ریڈیائی ڈرامہ

انڈے ۔ ۔ سنڈے کے سنڈے

پہلا سین

زندگی رواں دواں ہے۔ اس پس منظر سے ایک ریڈھے والے کی آواز اُبھرتی ہے ۔ ۔

''انڈے تازہ انڈے ۔ ۔ ۲۴ روپے درجن

دوسرا سین

ریڈیو سے نشر ہونے والی ایک خبر ۔ ۔

''کل رات کی معمولی بارش سے قومی شاہراہ پر پسیاں گر گئی ہیں۔ شاہراہ غیر معینہ عرصے کے لئے بند''

ریڈھے والے کی آواز ۔ ۔

''انڈے انڈے ۔ ۔ ۴۸ روپے درجن ۔ ۔ !''

کشمیر نامہ

(اخباری کالم)

تحریر : عمر مجید

میڈیکل سائنس کی برکات

انسان غلطیوں کا پتلا ہے۔ غلطیوں کا پتلا نہ ہوتا تو اُسے گدھا یا بیل یا گھامڑ جیسے خطابات سے نوازا نہ جاتا۔ اپنے سر سے گدھے پن کا بوجھ یا خطاب اُتارنے کی خاطر انواع قسم کے علوم حاصل کرنا شروع کئے اور ان ہی علوم کے دم سے انسانی صحت سے متعلق اکثر رموز واسرار اُس کے ذہن میں اُترتے جارہے ہیں لیکن غلطیاں ہیں کہ پیچھا چھوڑ نہیں رہی ہیں۔ اصل میں اس میں سائنس کا کوئی قصور نہیں بلکہ انسانی ذہن کا فتور ہے کہ بار بار کستور کی طرح اکڑتا رہتا ہے۔ ابھی دیکھئے نا، پاکستان کے ایک شہر میں صرف سونوگرافی کی رپورٹ نے بڑی غلط فہمی پیدا کردی۔ میاں بیوی دونوں بیمار ہوئے۔ ایک اچھے ڈاکٹر سے سونوگرافی کرائی۔ ڈاکٹر نے بتایا کہ عورت ٹھیک ٹھاک ہے لیکن مرد کو پانچ مہینے کا حمل ٹھہرا ہے۔ جناب وہ ہنگامہ بپا ہوا کہ توبہ توبہ، لیکن بعد میں پتہ چلا کہ سونوگرافی کی رپورٹ بدل گئی ہے۔ اہلیہ کی رپورٹ خاوند کے نام سے چھپ گئی۔ اہلیہ کو پانچ مہینے کا حمل ٹھہرا تھا لیکن حملے کا شکار خاوند کو بنایا گیا۔ بسا اوقات معالج یعنی ڈاکٹر اس سے بھی بڑی غلطیاں کرتے ہیں لیکن اپنی غلطی ماننے کے لئے تیار نہیں ہوتے۔

☆ ☆

Kashmir Treasures Collection, Srinagar

CC-0. In Public Domain. Digitized by eGangotri.

نورشاہ
9906771363

مرحوم عمر مجید

کیا خوب آدمی تھا، اللہ مغفرت کرے

تعارف

پیدائش: سرینگر ؛ ۱۸ر ستمبر ۱۹۴۰ء

وفات: سرینگر ؛ ۲۳ر دسمبر ۲۰۰۸ء

پہلی کہانی: ایک بوڑھا ولر کے کنارے (۱۹۶۵ء)
روزنامہ ''آفتاب'' سرینگر میں شائع ہوئی۔

آخری تخلیق: ریڈیو ڈرامہ جو اُن کی وفات کے بعد جنوری ۲۰۰۹ء میں ریڈیو کشمیر سرینگر سے نشر ہوا۔

تخلیقات:
۱) اُجالوں کے گھاؤ (افسانے) ۱۹۶۷ء
۲) یہ بستی یہ لوگ (ناول) ۱۹۷۵ء
۳) درد کا دریا (ناول) ۱۹۷۶ء

وفات کے بعد

۱۔ ''عمر مجید کے بہترین افسانے''
ترتیب وتہذیب : سلیم سالک (۲۰۰۹ء)

۲۔ ''کشمیر نامہ ۔ ۔ عمر مجید کے تحریر کردہ مضامین''
ترتیب وتہذیب : نورشاہ، جاوید ماٹجی (۲۰۱۱ء)

۳۔ ''کشمیر نامہ جدید ۔ ۔ عمر مجید کی یادگار تحریریں''
ترتیب وتہذیب: ڈاکٹر اشرف آثاری، علی محمد صوفی (۲۰۱۲ء)

۴۔ ''کشمیر نامہ جدید (۲)''
جان محمد آزاد، جاوید حسین کرمانی (۲۰۱۴ء)

۴۔ ''عمر مجید کی افسانہ نگاری'' مقالہ برائے ایم فل
بلال احمد کھانڈے (۲۰۱۵ء)

عمر مجید کو ہم سے جدا ہوئے اب بارہ برس ہو چکے ہیں۔ میں یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ اگر وہ حیات ہوتے تو ان بارہ برسوں میں انہوں نے کشمیر کی حقیقی صورت حال کے تعلق سے افسانے لکھ کر جموں کشمیر اور لداخ کے افسانوی ادب میں نہ صرف ایک منفرد باب کا اضافہ کیا ہوتا بلکہ صحافتی ادب میں بھی نہ جانے کتنے نت نئے موضوعات اُن کے قلم کی سیاہی نے سمیٹ لئے ہوتے اور شاید حضرت خضر بھی ولر کے کنارے اپنی سوچوں میں گم چاند کی چاندنی میں کچھ کچھ نیا اور کچھ کچھ پرانا تلاش کرتے نظر آتے۔ ولر جھیل کا عمر مجید مرحوم کی زندگی خاص طور سے اُن کی افسانوی زندگی سے گہرا تعلق رہا ہے۔ وہ ایک اچھے تیراک بھی تھے۔ جھیل ولر اور جھیل ڈل میں تیرنے کا اُنہیں جنوں تھا بلکہ اُنہوں نے ولر جھیل کے پس منظر میں اپنا پہلا افسانہ ''ایک بوڑھا ولر کے کنارے'' قلم بند کر کے اپنی ادبی زندگی کا آغاز بھی کیا تھا۔ تب سے ولر جھیل کی تہہ سے نہ جانے کتنی کہانیاں اُبھر اُبھر کر سامنے آئی ہوں گی، کتنے ہی افسانوی کردار ولر جھیل پار کر کے عمر مجید کی تلاش کرتے رہے ہوں گے، کبھی اس کنارے اور کبھی اُس کنارے، کبھی اس پار اور کبھی اُس پار۔ اب نہ تو مرحوم عمر مجید کی کہانی ''ولر کے کنارے'' کا وہ خضر نظر آتا ہوگا اور نہ ہی وہ بوڑھا جس کا جوان اور کماؤ بیٹا ولر جھیل میں آئے ایک طوفان میں کھو گیا تھا۔ جھیل ولر کی طرح جھیل ڈل سے بھی اُن کی

Kashmir Treasures Collection Srinagar

CC-0. In Public Domain. Digitized by eGangotri.

گہری وابستگی تھی۔شاید اس وابستگی کا آغاز اُن کے جوانی کے دنوں میں ہوا تھا، اس لئے نہیں کہ ڈل جھیل کے کنارے خوبصورت، حسین اور جوان چہرے نظر آتے تھے، اس لئے بھی نہیں کہ وہ بذات خود ایک اچھے تیراک تھے اور ڈل میں تیرنے کے شوقین تھے بلکہ اُس زمانے میں وہ سگریٹ پینے کے عادی تھے۔ اُن کا گھر بھی زیادہ دور نہ تھا۔ وہ گھر والوں کے ڈر سے سگریٹ نوشی کے بہانے ٹہلتے ٹہلتے کبھی پیدل اور کبھی سائیکل سے بلیوارڈ کی جانب نکل آتے اور اپنا شوق پورا کرتے۔ اس شوق کے پس منظر میں شاید ڈل جھیل سے وابستہ جانی انجانی کہانیاں اُن کے سوچوں میں گھر بناتی تھیں۔

عمر مجید اب ہمارے درمیان نہیں، لیکن اُن کی یادیں، اُن کی شفقتیں اور اُن کی باتیں ہمارے ذہنوں میں محفوظ ہیں۔ اُن کے خلوص کا کیا کہنا، وہ سراپا خلوص تھے۔ بنیادی طور پر وہ بے حد شریف تھے۔ شرافت اُن کے لہجے کی ایک بڑی صفت تھی۔ اُن کے عادات سادہ تھے۔ یہ سادگی اُن کی طبیعت میں رچی بسی تھی۔ مرحوم کے لاشعور میں صالح معاشرے کے قیام کا خاکہ ہر وقت موجود رہتا تھا۔ اپنے ان خاکوں کو رنگ بھرنے اور علم وادب کو اس رنگ کا ایک حصہ بناتے ہوئے انسان اور انسانیت کی خدمت کرنا چاہتے تھے۔ عوامی مسائل کو ادبی رنگ دے کر پیش کرنے کا سلیقہ مرحوم عمر مجید کو خوب آتا تھا۔ کشمیر، کشمیری اور کشمیریت اُن کے افسانوں کے محبوب ترین موضوعات ہوتے تھے۔ مرحوم کے افسانے ہوں، افسانچے ہوں، مضامین ہوں یا اخباری کالم، اُن کی ہر تحریر میں زبان وبیاں کی سادگی اور تازگی اُن کے منفرد اسلوب میں نظر آتی ہیں۔ اُن کی ادبی زندگی کا فلسفہ ذہن اور زبان کی آزادی پر مبنی تھا۔ اس لئے اُن کا قلم بھی بندشوں اور پابندیوں سے آزاد تھا۔ اپنے یار دوستوں سے کبھی کبھار اُن کا روٹھنا اور پھر مسکرا کر گلے لگانا اُن کی شخصیت کا ایک اور پہلو تھا۔ آج جب میں اپنے اردگرد دیکھتا ہوں تو مجھے احساس ہوتا ہے کہ دوست بھی ہیں، اُن کی محبتیں بھی ہیں، خلوص بھی ہے لیکن ایک عمر مجید نہیں ۔ ۔ !

عمر صاحب جب حیات تھے، تب بھی کشمیر میں بہت سارے طوفان آتے رہے ۔ ۔ رنگ رنگ کے طوفان، انفرادی اور اجتماعی طوفان۔ اُن کی وفات کے بعد بھی طوفانوں کا یہ سلسلہ تھما نہیں۔ یہ آگ بجھی نہیں۔ عمر مجید تو اُن طوفانوں کی کہانیاں لکھ چکے ہیں۔ اُن طوفانوں کو افسانوی رنگ دے چکے ہیں، جن کا سامنا اُن کو کرنا پڑا۔

سوچتا ہوں، عمر مجید نہیں ہیں تو پھر ۔ ۔ ۔ !

بسکو اسکول کے گیٹ پر خون سے لت پت خالق حجام کو کون گلے لگائے گا؟ غوث چاچا کے گھر اُس کے معصوم بیٹے کی موت پر تعزیت کرنے کون جائے گا جسے بغیر کسی قصور کے گولی کا نشانہ بنایا گیا تھا؟ یہ گولی کہاں سے آئی تھی؟ کس کے بندوق سے نکلی؟

عمر مجید کا شہر تو کب کا اغوا ہو چکا ہے۔ عمر مجید کے اس شہر کو اغوا کاروں سے کون بچائے گا؟

گونگے گلاب کب مسکرا مسکرا کر اپنی خوشبو بکھیر بکھیر کر ہماری فضاؤں کو گلابی بنائیں گے؟

کیا وہ خط ہم کو دوبارہ پڑھنا پڑے گا جو ایک صحافی ایک قلم کار کی جیب سے ملا تھا اور جس میں اُس نے اپنے مرنے کی پیشن گوئی کی تھی کیونکہ گذشتہ ایک ہفتے سے چند نامعلوم افراد اُس کی تلاش میں تھے، صرف اس لئے کہ وہ اپنی تحریروں میں سچ اور سچائی کی عکاسی کرنے لگا تھا۔

نوجوان قلم کار سلیم سالک نے ۲۰۰۹ء میں مرحوم عمر مجید کی کہانیوں کا ایک انتخاب ترتیب دیا تھا جو اُس سال میزان پبلی شرز کی وساطت سے شائع ہوا۔ اس کتاب کا سلیم صاحب کا تحریر کردہ پیش لفظ مرحوم عمر مجید

Kashmir Treasures Collection, Srinagar

CC-0. In Public Domain. Digitized by eGangotri.

کی اندرونی اور بیرونی زندگی کے تعلق سے بے حد اہمیت کا حامل ہے۔
اس انتخاب میں سلیم صاحب نے عمر مجید مرحوم کی کہانی ''میری گلی کا غم'' بھی شامل کیا ہے۔ اس کہانی سے ایک اقتباس :

''چور نظروں سے غوث چاچا کے مکان کو دیکھتا ہوں، مکان منہ بسورے نظر آ رہا ہے۔ یہ شاید میرا وہم ہے۔ سبھی مکان جن پر رنگ وروغن کی چادر نہ چڑھائی گئی ہو ایسے ہی منہ بسورے کھڑے نظر آتے ہیں۔ انسان کی موت کا مکان کی بناوٹ سے کیا کام ۔ ۔ ! گلی کی ہر شئے اُداس نظر آتی ہے۔ دو فرلانگ لمبی گلی ایک ایک قدم اُٹھانا بھاری ہو جاتا ہے۔ ماتم بس گلی کے نکڑ تک ہے۔ نکڑ کے آس پاس زندگی رواں دواں ہے۔ وہاں کوئی ماتم نہیں۔ پہلے اس طرح کوئی مارا جاتا تھا تو شہر کی ہر گلی میں ماتم منایا جاتا تھا''

دیکھئے اس کہانی میں مرحوم بہت کچھ کہنا چاہتے ہیں۔ مرحوم کی گلی ملک کی کوئی بھی گلی ہو سکتی ہے، لیکن جو لوگ کشمیر کے حالات وواقعات سے واقف ہیں، یہ گلی اُن کو اپنی گلی نظر آئے گی کیونکہ یہ کہانی صرف یعقوب کی گلی کی عکاسی نہیں کرتی بلکہ یہاں کی درہم برہم زندگی کو سامنے لانے میں ایک اہم کردار نبھاتی ہے۔ ''میری گلی کا غم'' ہماری تاریخ کا ایک ایسا ورق ہے جس کا ایک ایک لفظ خون کے آنسو میں ڈوبا ہوا ہے۔ عمر مجید اگر حیات ہوتے تو یہ آنسو ہم اُن کی آنکھوں میں بھی دیکھتے۔

یہ مرحوم عمر مجید کی افسانوی زندگی کا ایک پہلو تھا جو ہم نظر انداز نہیں کر سکتے۔ اس تعلق سے مجھے وہ دن یاد آ رہے ہیں جب عمر مجید کے کشمیر کی ہر شئے خوبصورت ہوا کرتی تھی، سندر ہوا کرتی تھی اور یہی خوبصورتی عمر مرحوم کی کہانیوں کا حصہ ہوتی تھی۔ وہ دن میں کیسے بھول سکتا ہوں جب مرحوم عمر مجید کی ادبی زندگی کی رنگا رنگی میں پوشیدہ آتش جوان تھا اور جوانی میں ہر صورت خوبصورت نظر آتی ہے۔ بدصورتی میں بھی خوبصورتی کی تلاش رہتی ہے۔ معطر فضائیں جوان سوچوں میں رنگ بھرتی ہیں۔ اُن کے اُن دنوں میں تحریر کردہ ایک کہانی سے ایک جوان جھلک :

''بابو جی! صبح سے کچھ نہیں کھایا۔ بچہ بھی بلک رہا ہے''
یہ سن کر ۔ ۔ سو روپے کا نوٹ اُسے تھما دیتا ہوں۔
نوٹ کو اپنے گریباں میں ڈال کر مسکرا کر کہتی ہے :
''میں اس اَدھ جلے مکان میں انتظار کر رہی ہوں،
میرے جانے کے پانچ منٹ بعد آ جانا ۔ ۔ !''

اور اب دیکھئے مرحوم کی کہانی ''کسک'' سے ایک اقتباس۔ نثر میں شاعری کا ایک اعلیٰ نمونہ :

''ملائم ہونٹ، بادام کے شگوفے اتنے گلابی کہاں ہوتے ہیں، اس قدر ملائم کہاں ہوتے ہیں۔ اُن میں ایسی خوشبو کہاں ہوتی ہے ۔ وہی نرگسی آنکھیں ، لیکن ایسی نرگسیت نرگس کے پھولوں میں کہاں ہوتی ہے اور اخروٹ کی رنگت میں اُلجھے ہوئے بال اور شروع بہار کے لطیف جھونکے گویا جنت کے تمام دروازے وا کئے گئے ہوں''

مرحوم عمر مجید ایک اُستاد بھی تھے۔ اپنی زندگی کا بیشتر حصہ اُنہوں نے ایک مقامی اسکول (بسکو اسکول) میں بحیثیت اُستاد گزارا۔ اس وجہ سے وہ ماسٹر جی کے نام سے بھی جانے جاتے تھے۔ وہ بحیثیت ہیڈ ماسٹر ملازمت سے سبکدوش ہوئے تھے۔ وہ جموں کشمیر اُردو اکادمی کے بانی ممبران میں سے تھے۔ اُردو اکادمی دسمبر ۲۰۰۶ء میں وجود میں آئی تھی۔

Kashmir Treasures Collection, Srinagar

CC-0. In Public Domain. Digitized by eGangotri.

میں تو صاف الفاظ میں کہنا چاہتا ہوں کہ اگر مرحوم عمر مجید نہ ہوتے تو شاید اُردو اکادمی کا بھی کوئی وجود نہ ہوتا کیونکہ اُردو اکادمی کی تشکیل میں اُن کا خلوص شامل تھا۔ سن ۲۰۰۶ء سے ۲۰۰۸ء تک وہ اپنی ذمہ داریاں خوش اسلوبی سے نبھاتے رہے۔ مرحوم عمر مجید صاحب قریب قریب تین دہائی تک بحیثیت اسسٹنٹ ایڈیٹر روزنامہ ''آفتاب'' سے منسلک رہے۔ وہ مرحوم خواجہ ثناء اللہ صاحب کا بے حد احترام کرتے تھے اور خواجہ صاحب بھی مرحوم عمر مجید کی صلاحیتوں سے خوب واقف تھے اور اس وجہ سے ان کی قدر بھی کرتے تھے۔ مرحوم عمر مجید کے صحافتی ادب کا مطالعہ کرنے سے یہ بات بخوبی سامنے آتی ہے کہ اُن کے وجود میں ایک صحافی بھی ہمیشہ سے موجود تھا۔ عوامی مسائل کو ادبی رنگ دے کر پیش کرنا مرحوم کو خوب آتا تھا۔ ''خیال اپنا اپنا'' اور ''کشمیر نامہ'' کے عنوان سے اُن کے تحریر کردہ کالم روزنامہ ''آفتاب'' میں تواتر کے ساتھ شائع ہوتے تھے۔ تاریخی نوعیت کے ان کالموں کے ذریعے مرحوم جہالت، لاعلمی، غربت، ظلم، استحصال اور ناانصافی کے خلاف اپنی آواز بلند کرتے رہے۔

''باپو تیرا بھارت'' کے تحت لکھے گئے ایک کالم سے اقتباس :

''دغا، فریب، جھوٹ، لوٹ مار، رشوت، خرد برد، سکینڈل پر سکینڈل ۔ ۔ بھارت یعنی ہندوستان میں ہر ایک لوٹنے لگا ہے، تجوریاں بھرنے لگا ہے۔ کیا وزیر کیا مشیر، کیا اہلکار، کیا سالار، کیا افسر، کیا دفتر، کیا چوکیدار اور کیا تحصیل دار، اوپر سے نیچے تک سب لوٹ کے کھا رہے ہیں۔ سب کے سب رنگے ہاتھوں پکڑے جا رہے ہیں۔ سزا کسی کو نہیں ہوتی۔ گنگا بہہ رہی ہے اور سب غوطے لگا رہے ہیں''

ان کے تحریر کردہ کالموں کے عنوان بڑے دلچسپ ہوتے تھے۔ یہ دیکھئے!

عجائبات کشمیری چونچہ، بچھوارہ کا ادب نامہ، راہ شفا کا ہم سفر، ہمالیہ کے چشمے اُبلتے ہیں کب تک، باپو تیرا بھارت، درسگاہ صحافت، ہماری کہانی غیروں کی زبانی۔

مرحوم عمر مجید کے تعلق سے اس بات سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اُن کو بھی جموں کشمیر کے بہت سے قلم کاروں کی طرح ادبی دنیا میں وہ مقام نہیں دیا گیا جس کے وہ ہر لحاظ سے مستحق تھے۔ اس کے باوجود افسانوی ادب میں اُن کا نام ہمیشہ روشن رہے گا۔

☆ ☆

رؤف راحت

وہ زندہ ہے

نہیں نہیں
یہ سب جھوٹ ہے
سنی سنائی ہے
وہ مر نہیں سکتا
ایسا ناممکن ہے
وہ تو خود ایک خالق تھا
مٹھی بھر انسانوں کا
لافانی جن کے کردار
جن کے لفظوں میں دھڑکن
جن میں سچی تصویریں
یہ غمازی کرتے ہیں
زندہ ہے وہ
زندہ ہے ۔ ۔ !

Kashmir Treasures Collection, Srinagar

CC-0. In Public Domain. Digitized by eGangotri.

ڈاکٹر نذیر مشتاق
9419004094

عمر مجید ۔ مریض عشق

عمر مجید ہماری وادی کے ایک نامور ادیب اور صحافی تھے۔ میں اُن کو بحیثیت ادیب، کالم نگار اور ایک مریض کے جانتا ہوں۔ میں ایک سال تک اُن کا معالج رہا ہوں۔ وہ ایک اعلیٰ پایہ کے افسانہ نگار تھے۔ اُن کے افسانے ریاستی اور غیر ریاستی رسالوں میں چھپتے تھے اور پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے۔ اُن کے مشہور افسانوں میں پرچھائیں، چھوٹا آدمی بہت مشہور ہوئے کشمیر میں نامساعد حالات کے تناظر میں انہوں نے گمشدہ جنت، شہر کا اغوا اور میری گلی کا غم لکھ کر اپنا حق ادا کیا۔ انہوں نے دو ناول بھی لکھے ہیں۔ عمر مجید کو اپنے جنت بے نظیر کشمیر سے والہانہ عشق تھا۔ انہوں نے تاریخ کشمیر کا بغور مطالعہ کیا تھا اور وہ کشمیر کے ماضی، حال اور مستقبل پر بات کر سکتے تھے۔ انہیں کشمیر کے سبزہ زاروں، کوہساروں، ندی نالوں، دریاؤں، آبشاروں، جھرنوں، جھیلوں اور رنگ برنگے گلوں سے عشق تھا۔ وہ کشمیر کے پس منظر میں ایک ضخیم ناول قلم بند کرنا چاہتے تھے مگر موت کے فرشتے نے اُن کو مہلت نہ دی۔

افسانہ نگار تو وہ تھے ہی، مگر بنیادی طور وہ وادی کے مشہور و معروف اسکول ''بسکو میموریل'' میں بحیثیت ایک معلم کے اپنے فرائض انجام دیتے رہے۔ وہاں سے وہ بحیثیت مدرس اعلیٰ بازنشست ہوئے اور پھر وہ اخبار ''آفتاب'' کے لئے ہمہ وقت کالم نویسی جیسا مشکل کام انجام دیتے رہے۔ اخبار ''آفتاب'' کے ساتھ وہ شروع سے ہی وابستہ تھے۔ وہ ادب نامہ اور سنڈے ایڈیشن کے انچارج تھے۔ انہوں نے بے شمار نئے لکھنے والوں کی حوصلہ افزائی کی۔

''آفتاب'' نے نہ جانے کتنے ذرّوں کو آفتاب بنایا۔ اس کا سہرا عمر مجید کے سر جاتا ہے۔ انہوں نے کبھی کسی نوجوان قلمکار کی حوصلہ شکنی نہیں کی بلکہ ہر نئے لکھنے والے کو سکھایا کہ افسانہ کیسے لکھا جاتا ہے۔ آپ کے چاہنے والوں کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ اُردو زبان اُن کی روح میں سرایت کر چکی تھی، اس لئے وہ اُردو زبان کی ترویج و ترقی کے لئے ہر وقت ایک چاق و چوبند سپاہی کی طرح تیار رہتے تھے۔ اُنہوں نے کئی ادبی انجمنوں میں اپنے فرائض بڑی خوش اسلوبی سے انجام دئے۔ وہ تلاش ادب کے روح رواں تھے۔ وہ اُردو اکادمی کے بنیادی اراکین میں سے تھے اور اس کا آئین و منشور اُنہوں نے ہی ترتیب دیا تھا۔ انہوں نے اپنی ملازمت کے دوران بسکو اسکول میں طلباء کو اُردو زبان کی طرف راغب کرنے کے لئے بہت محنت کی۔ اس اسکول میں ایک لائبریری قائم کی جہاں سے طلباء کو اُردو کتب فراہم کی جاتی تھیں تاکہ وہ اس زبان کو پڑھیں اور اس کی ترویج و ترقی کے لئے اپنا رول نبھائیں۔ آج بھی اُن کے شاگرد یاد کرتے ہیں تو یہی کہتے ہیں کہ عمر سر جیسا مہربان، شفیق، محنتی، قابل اور اپنے مضمون میں ماہر شاید ہی کوئی اُستاد ہو۔ اسکول کے سبھی طلباء اُن کی عزت کرتے تھے اور دل کی گہرائیوں سے پیار بھی کرتے تھے۔ اسکولی ملازمت سے سبکدوش ہونے کے بعد وہ اخبار ''آفتاب'' کے لئے کام کرتے رہے۔ ان کا کالم ''خیال اپنا اپنا'' عوام الناس میں بے حد پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔ علاوہ ازیں وہ ''ادب نامہ'' اور ''کشمیر نامہ'' بھی ترتیب دیتے تھے اور یہ فریضہ وہ انتہائی سنجیدگی، ایمانداری اور محنت سے انجام دیتے تھے، اسی لئے اخبار کے مدیر اعلیٰ اور قارئین کو اُن سے کبھی کوئی شکایت نہ تھی۔

Kashmir Treasures Collection, Srinagar

CC-0. In Public Domain. Digitized by eGangotri.

عمر صاحب ایک مخلص، غیرت منداور شریف النفس انسان تھے۔ وہ چاپلوسی اور چمچہ گری کو بالکل پسند نہیں کرتے تھے، اسی لئے اس سماج میں اُن کی اور اُن کے کارناموں کی وہ پذیرائی نہیں ہوئی جو ہونی چاہئے تھی۔ یہی وجہ ہے کہ اُن کے صفات کی وجہ سے وہ زندگی کے آخری ایام تک آفتاب میں اپنے فرائض انجام دیتے رہے۔ خواجہ ثناء اللہ بٹ صاحب نے ہمیشہ اُن کو قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھا اور ہمیشہ اُن کے کام کو سراہا۔ وہ ہر کالم کے لئے پہلے پوری طرح تحقیق کرتے پھر قلم بند کرتے۔ جب بھی کالم میں صحت سے متعلق کوئی بات ہوتی تو میرے ساتھ تفصیلی مشورہ کرنے کے بعد ہی لکھتے۔

جب میں نے اپنا پہلا افسانہ ''بدنصیب'' لکھا تو میں ''آفتاب'' کے دفتر پر گیا، وہاں مدیر اعلیٰ جناب ثناء اللہ بٹ صاحب نے مجھے عمر مجید سے ملنے کو کہا۔ وہاں اُن سے میری پہلی ملاقات ہوئی۔ اُنہوں نے مجھ سے میرا تحریر کردہ افسانہ لیا اور کہا، ''جاؤ اور کسی سنڈے ایڈیشن میں چھپنے کا انتظار کرو''۔ میرا وہ افسانہ چھپ گیا اور عمر مجید کے ساتھ میری دوستی ہوگئی۔ انہوں نے مجھے مشورہ دیا کہ آپ مشہور افسانہ نگاروں کے افسانے پڑھا کریں، مگر اُس وقت میں ساری کتابیں خرید نہ سکا، بعد میں سب خرید لیں۔ مجھے بعض ناگزیر حالات کی وجہ سے اپنا کشمیر دس برس کے لئے چھوڑنا پڑا، اور یوں ادب اور دیگر ساتھیوں سے میرا رابطہ ٹوٹ گیا۔

جلاوطنی کے بعد جب میں نے از سر نو یہاں سرکاری نوکری شروع کی تو ایک دن لال چوک میں بسکو اسکول کے گیٹ کے سامنے عمر مجید سے ملاقات ہوئی۔ سلام و دُعا کے بعد ہم ایک مقامی ریستوراں میں بیٹھ گئے اور اُنہوں نے مجھ سے کہا کہ وہ ڈپریشن میں مبتلا ہیں اور وہ واقعہ بھی سنایا جس کے پیش آنے سے وہ ''پی ٹی ایس ڈی'' میں مبتلا ہوئے اور اب اس کی وجہ سے شدید ڈپریشن میں مبتلا ہیں۔ اُنہوں نے مجھ سے کہا، ''آپ نے تو مینٹل اسپتال میں کام کیا ہے اس لئے آپ میرا علاج کر سکتے ہیں۔ میں یہاں کسی بھی ڈاکٹر سے مطمئن نہیں ہوں۔ یہ لوگ بیمار کی ہسٹری پوری طرح سنے بغیر سکون، خواب اور ادویات تجویز کرتے ہیں۔ یہاں کے ڈاکٹر مریض کو ایک تجرباتی جانور سمجھتے ہیں'' پھر انہوں نے مجھے ایک ٹیبلٹ دکھائی جو وہ بہت عرصے سے استعمال کرتے تھے۔ یہ ایک "Anti Depression" دوائی تھی۔

اس ملاقات کے بعد میرے اور ان کے درمیان ڈاکٹر مریض کا رشتہ پروان چڑھا جو اُن کی زندگی کے آخری ایام تک جاری رہا۔ وہ بھی ایک عام مریض کی طرح اپنی بیماری کو لے کر بہت زیادہ پریشان تھے۔ ایک عام کشمیری کی طرح وہ بھی اپنی ذہنی بیماری یعنی ڈپریشن کو بیماری ماننے کے لئے تیار نہیں تھے۔ اُن سے کہا گیا تھا، ''آپ کو Shock لگ گیا ہے۔ آپ کو ذہنی دباؤ ہے۔ آپ کو سب کچھ بھول جانا چاہئے'' مگر اُنہوں نے مجھ سے کہا کہ وہ لاکھ کوشش کے باوجود بھی وہ لمحہ نہیں بھول سکتے کہ جب ایک دوست نے اُن کی بانہوں میں دم توڑ دیا۔ مجھ سے مخاطب ہو کر کہا، ''کیسے بھول جاؤں، کیسے بھول جاؤں ۔ ۔ ؟ جب سے وہ حادثہ ہوا، تب سے مجھے قرار نہیں، چین نہیں۔ نیند مجھ سے روٹھ گئی ہے۔ کھانے پینے میں کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ اکثر باتیں اور واقعات بھول جاتا ہوں، بے حد کمزوری محسوس کرتا ہوں۔ ہر وقت رونے کو جی چاہتا ہے۔ جی چاہتا ہے کہ تنہا کسی جگہ بیٹھ کر آنسو بہا کر دل کو ہلکا کروں مگر آنکھیں خشک ہو چکی ہیں۔ کبھی کبھی سوچتا ہوں کہ اب زندگی سے کیا لینا دینا، اس لئے بہتر ہے کہ خودکشی کر لوں، مگر جانتا ہوں کہ خودکشی کرنا گناہ ہے''

Kashmir Treasures Collection, Srinagar

CC-0. In Public Domain. Digitized by eGangotri.

ان کی باتیں غور سے سننے کے بعد میں نے اُن سے کہا کہ وہ MDD یعنی شدید ڈپریشن کے شکار ہو چکے ہیں اور میں نے اُن کو اس بیماری کے متعلق سو فیصد جانکاری دی۔ میں اُن کا علاج کرتا رہا اور اس دوران وہ میرے گھر بھی آتے رہے۔ اکثر ڈرائنگ روم میں بیٹھ کر سر جھکائے خاموشی سے بیٹھتے رہتے اور سگریٹ نوشی سے لطف اندوز ہوتے۔ کبھی کبھی وہ میرے پاس میڈیکل کالج آتے۔ ایک دن آئے تو میں کمرے میں نہیں تھا۔ میرا انتظار کر رہے تھے کہ اسی دوران میں کمرے میں داخل ہوا۔ کھڑے ہو کر مجھے گلے لگانا چاہا مگر دھڑام سے نیچے گر پڑے۔ اسی وقت میرا دوست ڈاکٹر ریاض تسلیم جو اُن کو جانتے تھے کمرے میں داخل ہوئے اور ہم دونوں نے بڑی مشکل سے اُن کو اُٹھا کر کرسی پر بٹھا دیا۔ چند لمحوں بعد وہ ہوش میں آ گئے تو کہا کہ اب میری بینائی متاثر ہو چکی ہے۔ میں نے اُن کا بلڈ پریشر چیک کیا تو یہ بہت زیادہ تھا۔ میں نے اُن کے لئے دوائیاں تجویز کیں مگر مجھے پورا یقین تھا کہ وہ میری ہدایات پر عمل نہیں کریں گے۔

بہر حال میں اُن کا معالج اور دوست بنا رہا اور ایک دن وہی ہوا جو ہم ڈاکٹروں کے ساتھ ہوتا ہے یعنی ڈاکٹر اور مریض کا رشتہ ٹوٹ گیا۔ علاج کے دوران اُنہوں نے خود کے بارے میں، ادیبوں، انجمنوں، اخبارات اور لوگوں کے بارے میں کئی انکشافات کئے جو میں بیان نہیں کر سکتا ہوں کیونکہ وہ سب باتیں پیشہ ورانہ راز ہوتی ہیں جو ایک ڈاکٹر کسی کے سامنے بیان نہیں کر سکتا۔ وہ سب باتیں راز ہیں جو کہ میرے سینے میں دفن ہیں اور میرے جسم کے ساتھ ہی دفن ہوں گی۔

بہر حال ایک روز خبر ملی کہ وادیٔ کشمیر کا ایک نامور معلم، ادیب، صحافی، کالم نویس اس دار فانی سے کوچ کر گیا۔ میں نے اُن کے جنازے میں شرکت کی اور اپنے دیرینہ دوست اور اپنے اہم مریض عشق کو الوداع کہا اور اللہ تعالیٰ سے دُعا کی کہ وہ اس مریض عشق کو جنت الفردوس میں جگہ عطا فرمائے ۔ ۔ آمین۔

☆ ☆

سلیم ساغر
9419072288

آہ! عمر مجید

پیکر صدق و صفا وہ صاحب عالی وقار
روٹھ کر ہم سے گیا اُردو ادب کا شہسوار

جس کے ماتھے کی چمک اسلاف کی تصویر تھی
جس کی ساری زندگی خود علم کی تفسیر تھی

جس کے نقش پا سے ملتا تھا منازل کا سراغ
جس نے روشن کردئے تھے ہر طرف لاکھوں چراغ

جس کا ہر اِک حرف گویا گوہر نایاب تھا
جس کا ہر اِک لفظ گو اِک تجربوں کا باب تھا

اشک افشاں آج کاغذ اور قلم مایوس ہے
پاسباں رخصت ہوا اور شمع بے فانوس ہے

☆ ☆

Kashmir Treasures Collection, Srinagar

CC-0. In Public Domain. Digitized by eGangotri.

طارق شبنم
9906526432

عمر مجید ۔ فن اور شخصیت

وادیٔ گلپوش ہمیشہ سے علم وادب کا گہوارہ رہی ہے۔ یہاں بہت سے شعراء، ادباء اور تاریخ دانوں نے اپنی بے پناہ صلاحیتوں کی بنیاد پر علم وادب کے گلشن کو مہکا کر اپنی خوشبوؤں کو بکھیرا ہے اور ایسے نقوش چھوڑنے میں کامیاب ہوگئے ہیں جو بہت دیر تک قائم رہیں گے۔ علم وادب کے ان ہی روشن چراغوں میں ایک نام عمر مجید کا ہے جنہوں نے ساری عمر اُردو زبان کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنا کر علم وادب کی زُلفیں سنواریں۔

مرحوم عمر مجید کسی تعارف کے محتاج نہیں ہیں۔ ان پر کافی کچھ لکھا جا چکا ہے۔ وہ ایک فن شناس افسانہ نگار، ڈرامہ نگار، بہترین اُستاد اور بے باک صحافی تھے۔ ان کی علمی وادبی خدمات کا نہ صرف زمانہ معترف ہے بلکہ علمی وادبی حلقوں میں انہیں کافی عزت واحترام کی نگاہوں سے دیکھا جاتا ہے، خاص طور پر بحیثیت افسانہ نگار ان کی ایک خاص پہچان ہے۔ عمر مجید کا اصلی نام عبدالمجید میر ہے لیکن ادبی وعلمی حلقوں میں عمر مجید کے نام سے مشہور ہیں۔ آپ ۱۹۴۰ء کو سرینگر کے پالہ پورہ سونہ وار علاقے میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد جو ایک معروف اُستاد تھے، کا نام غلام قادر میر تھا۔ مرحوم عمر مجید نے سرینگر کے بسکو اسکول میں تعلیم حاصل کرنے کے بعد ۱۹۵۸ء میں کشمیر یونیورسٹی سے گریجویشن مکمل کی اور پھر بسکو اسکول میں ہی بحیثیت اُستاد فرائض دینے شروع کئے جہاں وہ کم وبیش چالیس سال تک فرائض انجام دیتے رہے۔ مرحوم بچپن سے ہی ادب کی طرف مائل تھے اور ان کا پہلا افسانہ زیر عنوان ''ایک بوڑھا وُلر کے کنارے'' ۱۹۶۵ء میں روزنامہ آفتاب کے ادبی ایڈیشن میں شائع ہوا۔ اس افسانے کے بارے میں عمر مجید لکھتے ہیں :

''مجھے وہ دن اچھی طرح یاد ہے جب میں اپنا افسانہ لے کر ''آفتاب'' کے دفتر میں دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ داخل ہوا تھا۔ گرمیوں کا زمانہ تھا۔ خواجہ اُس زمانے میں پتلون اور پورے آستین کی قمیض پہنا کرتے تھے۔ آپ نے میری سلام کا جواب نہایت خلوص کے ساتھ دیا تھا اور شاید عادت کے مطابق مجھے اوپر سے نیچے تک دیکھا۔ بغیر کچھ پوچھے یا کہے آپ نے میرا افسانہ لیا اور ایک ہی نشست میں پڑھا۔ میں خاموش بت بن کر آپ کو دیکھ رہا تھا۔ ''ٹھیک ہے'' بس آپ نے یہی دو لفظ کہے اور میں کسی وحشت زدہ جانور کی طرح دفتر سے بھاگ نکلا تھا اور پھر تیسرے یا چوتھے روز میرا پہلا افسانہ ''ایک بوڑھا وُلر کے کنارے'' آفتاب کے زرّیں اوراق کا زینت بنا تھا''

بحوالہ ''عمر مجید کے بہترین افسانے''

مرتب : سلیم سالک ؛ ص : ۲۰

راقم الحروف نے یہ بھی سنا ہے کہ چند روز بعد یہ افسانہ ہندوستان کے کئی معتبر اخبارات نے آفتاب سے کاپی کر کے شائع کیا جس سے عمر مجید کی کافی حوصلہ افزائی ہوئی اور انہوں نے بڑی دلچسپی سے افسانے تخلیق کرنے شروع کئے اور جلد ہی ان کے افسانے ملک کے مختلف اخبارات اور جرائد میں شائع ہونے لگے اور انہیں بحیثیت افسانہ نگار ایک منفرد پہچان ملی۔ بعد میں عمر مجید روزنامہ آفتاب سے وابستہ ہوگئے اور یہ وابستگی دن بہ دن گہری ہوتی گئی۔ آپ عرصہ دراز تک ''آفتاب'' میں بحیثیت اسسٹنٹ ایڈیٹر کام کرتے رہے جب کہ مختلف عنوانات

Kashmir Treasures Collection, Srinagar

CC-0. In Public Domain. Digitized by eGangotri.

کے تحت کالم بھی تحریر کرتے رہے۔ ان کا ایک ہفتہ وار کالم ''کشمیر نامہ'' اخبار بین حلقوں میں کافی مشہور ہوا تھا۔ اس کالم میں مرحوم کشمیر کے سیاسی، سماجی اور معاشی موضوعات پر بڑے ہی منفرد اور دلچسپ انداز میں لکھتے تھے۔ ''آفتاب'' عمر مجید کے لئے ایک بہترین پلیٹ فارم ثابت ہوا، جہاں ان کو مرحوم خواجہ ثناء اللہ بٹ کی سرپرستی میں اپنی صلاحیتوں کو بروئے کار لانے کے مواقع نصیب ہوئے۔ کچھ عرصہ تک مرحوم نے اگرچہ ہفت روزہ ''رہبر'' کی ادارت بھی سنبھالی لیکن ''آفتاب'' کا ساتھ کبھی نہیں چھوڑا، جس کا اعتراف مرحوم نے ان الفاظ میں کیا ہے :

''میں روزنامہ ''آفتاب'' کی پیداوار ہوں۔ ''آفتاب'' نے مجھے گویائی بخشی اور پروان چڑھایا۔ اس لحاظ سے مدیر ''آفتاب'' خواجہ ثناء اللہ بٹ ناچیز کے مربی بھی ہیں اور مخدوم بھی''

''کشمیر نامہ'' کالم کی مقبولیت کے پیش نظر بعد میں نور شاہ اور جاوید ماٹجی نے اس کو مرتب کر کے کتابی شکل دی جب کہ ڈاکٹر اشرف آثاری اور علی محمد صوفی نے بھی کئی قسطوں کو مرتب کر کے کتابی صورت میں شائع کیا ہے۔ عمر مجید کا پہلا افسانوی مجموعہ ''اُجالوں کے گھاؤ'' ۱۹۶۸ء میں شائع ہوا جب کہ ان کے دو ناول ''یہ بستی یہ لوگ'' ۱۹۷۰ء میں اور ''درد کا دریا'' ۱۹۷۶ء میں منظر عام پر آ کر داد تحسین حاصل کر چکے ہیں۔ علاوہ ازیں ان کی وفات کے بعد نوجوان نقاد سلیم سالک نے ۲۰۰۹ء میں ''عمر مجید کے بہترین افسانے'' کے نام سے ایک افسانوی مجموعہ بھی مرتب کیا ہے جس میں چوبیس افسانے اور کچھ مختصر افسانے بھی شامل ہیں۔ کچھ اطلاعات کے مطابق زیتون (ناول) سمیت مرحوم کا کچھ ادبی سرمایہ ابھی بھی غیر مطبوعہ ہے اور کچھ ضائع بھی ہو چکا ہے۔ عمر مجید اُردو زبان کو اپنا جائز مقام دلانے کے لئے بھی کوشاں رہتے تھے اور زبان و ادب کی خدمت کے لئے وہ اپنے ادبی سفر کے دوران کئی ادبی انجمنوں سے بھی وابستہ رہے جن میں ''تلاش ادب کشمیر''، رائٹرس گلڈ سرینگر اور اُردو اکادمی جموں کشمیر قابل ذکر ہیں۔ اُردو اکادمی کی بنیاد ڈالنے میں مرحوم کا اہم رول رہا ہے۔

مرحوم عمر مجید فن افسانہ پر مضبوط گرفت رکھتے تھے اور شہرت اور انعام و اکرام کی تمنا سے بالاتر ہو کر لکھتے تھے۔ ان کے افسانوں میں ہر قسم کے موضوعات ملتے ہیں اور عام لوگوں کا درد چھلکتا نظر آتا ہے۔ افسانہ ''گونگے گلاب''، ''میری گلی کا غم''، ''شہر کا اغوا''، ''ماتم کے بعد''، درد کا مارا، تلاشی وغیرہ افسانوں کے مطالعے سے یہ بات صاف ظاہر ہوتی ہے کہ ان کے تحریر کردہ افسانے زندگی کی تلخ حقیقتوں سے بھرپور ہیں۔ مرحوم اپنے اردگرد کے کرداروں کا انتخاب کرتے تھے۔ اس بات کی عکاسی معروف فکشن نگار نور شاہ ان الفاظ میں کرتے ہیں :

> ''عمر مجید کے افسانوں کا ایک الگ ہی انداز ہے۔ وہ افسانہ لکھنے کے ڈھنگ سے بخوبی واقف ہیں۔ وہ کردار زمین کی کھردری سطح پر تلاش کرتے ہیں اور چن چن کر اُنہیں اپنے افسانوں میں قید کر لیتے ہیں۔ اسلوب کا ستھراپن ان کی کہانیوں کی نمایاں خصوصیت ہے۔ کشمیر، کشمیریت اور کشمیر کی زندگی اُن کے محبوب ترین موضوعات ہیں''

ملاحظہ فرمائیں عمر مجید کے افسانے کا یہ اقتباس :

''اچانک دروازہ ایک مرتبہ پھر کھلا۔ دروازے پر پاپا کھڑے تھے۔ وہ بھی خواجہ صاحب کے ہاں سے لوٹے تھے۔ ان کے لب ہل رہے تھے لیکن اونچے والیوم کی وجہ سے ان کی آواز نہیں آ رہی تھی۔ وہ خود آگے بڑھے۔ رتھوں کی دوڑ ایک دم بند ہو گئی ۔ ۔ ''

Kashmir Treasures Collection, Srinagar

CC-0. In Public Domain. Digitized by eGangotri.

''تمہیں شرم آنی چاہئے۔ ہمسائیگی میں ماتم داری ہے اور تم لوگ فلمیں دیکھ رہے ہو''

''چپ رہو ۔ ۔ خواجہ زندگی کی آخری سانسیں لے رہے ہیں''

''پاپا ۔ ۔ ہمارے ویڈیو نہ دیکھنے سے خواجہ صاحب کی رُکتی ہوئی سانسیں دوبارہ واپس نہیں آسکتی ہیں''

(افسانہ : ماتم کے بعد)

افسانے کی کہانی میں سماج میں بدلتی قدروں اور غم وخوشی کے موقعوں پر آپسی محبت اور بھائی چارے کے مٹتے آثار اور نئے نسل کی کج روی کو بہترین انداز میں پیش کیا گیا ہے، جب کہ افسانے کے کلائمکس میں موصوف نے نہایت فنکارانہ انداز میں سماج پر ایسا بھرپور طنز کیا ہے کہ سنجیدہ کاری کے ذہن میں سماج کے مستقبل کی بدلتی صورتحال اور نئی نسل کے بدلتے رویوں پر کئی سوال اُبھرتے ہیں۔ دیکھیں یہ اقتباس :

کلثوم نسرین کو دلاسہ دے رہی تھی۔ امی نے خواجہ صاحب کی بہو کو سنبھال رکھا تھا۔ سارے ہمسایے جمع تھے۔ خواجہ صاحب کے بڑے بیٹے کے سسرال والوں نے کھانے پینے کا انتظام کیا تھا۔ نسرین کے ماموں جو حال ہی میں امریکہ سے لوٹے تھے، اپنے دو چھوٹے بھانجوں کو سینے سے لگائے بیٹھے تھے۔ کھانا کھانے کے بعد خواجہ صاحب کی باتیں ہونے لگیں۔ مرنے والے کی صفات بیان ہونے لگیں تو نسرین کی امی کی ہچکیاں بندھ گئیں۔ نسرین بھی رونے لگیں۔ تب اس کے ماموں نے چاروں طرف نظریں دوڑائیں۔

''آصف ۔ ۔ ''

آصف اُن کے ملازم کا نام تھا۔ وہ پلک جھپکتے ہی سامنے آیا۔

''ایسا کرو آصف، جلدی سے گاڑی لے کر جاؤ۔ میں جو اپنے ساتھ ویڈیو کیسٹ لے آیا ہوں، اُنہیں لے کر آؤ۔ بچوں کا دل بہل جائے گا''

عمر مجید اپنے افسانوں کے ذریعے کشمیری عوام کے بے پناہ مسائل کو بہترین انداز میں اُجاگر کرتے تھے۔ کشمیر کے نامساعد حالات پر بھی انہوں نے بہترین افسانے تخلیق کئے ہیں جن میں گمشدہ جنت، میری گلی کا غم، شہر کا اغوا جیسے افسانے قابل ذکر ہیں، جن میں انہوں نے کشمیر کے نامساعد حالات، بے چینی اور درد وکرب کی ایک منفرد اور علامتی انداز میں دل چھو لینے والی عکاسی کی ہے۔ عمر مجید کے افسانوں کے حوالے سے بات کرتے ہوئے ڈاکٹر اشرف آثاری رقم طراز ہیں :

''ماسٹر جی وادیٔ کشمیر کے باصلاحیت افسانہ نویس ہیں۔ ان کی کہانیوں میں وہ کسک، وہ چبھن اور وہ درد ہوتا ہے کہ ان کی بات دل ہی میں نہیں بلکہ روح کی گہرائیوں میں اثر کر کے وہاں ارتعاش وتلاطم پیدا کر دیتی ہے۔ سب سے پہلے ان کی کہانیاں اُنہیں رُلاتی ہیں اور پھر وہ قارئین وسامعین کو رُلاتی ہیں۔ جب وہ کہانیاں اور افسانے تخلیق کرتے ہیں تو ان کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرتے رہتے ہیں۔ جب وہ اپنے کلاس روم میں، مستقبل کے ڈاکٹروں، انجینئروں، پروفیسروں اور افسروں کی تخلیق کرتے رہتے ہیں تو اُن کی لاٹھی خوب چلتی رہتی تھی اور اُن کے شاگردوں کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرتے رہتے تھے''

(عمر مجید کے بہترین افسانے ؛ مرتب سلیم سالک)

مرحوم عمر مجید نے اگرچہ اپنے ادبی سفر کے آغاز سے دم واپسی تک کافی متحرک رہ کر بے لوث انداز میں اُردو زبان وادب اور صحافت کی آبیاری کرتے رہے لیکن اُنہیں وہ پذیرائی نہیں ملی جس کے مستحق تھے۔ اُن کی حیاتی میں اُنہیں کوئی ایوارڈ نہیں دیا گیا جب کہ انتقال کے بعد

Kashmir Treasures Collection, Srinagar

CC-0. In Public Domain. Digitized by eGangotri.

اُردو اکادمی کی طرف سے اُنہیں بعد از مرگ ایوارڈ سے نوازا گیا۔

مرحوم کے جاننے والوں کے مطابق آپ ذاتی زندگی میں انتہائی ملنسار، ہر ایک سے محبت کرنے والے، مخلص، سادہ مزاج اور با اخلاق انسان تھے۔ ہر ایک کی خوشی اور بھلائی کے لئے کوشاں رہتے تھے لیکن خود اُن کی زندگی میں بہت کم خوشیاں نصیب ہوئیں۔ چنانچہ ڈاکٹر اشرف آثاری لکھتے ہیں :

''عمر مجید کے ساتھ جن لوگوں کے قریبی روابط رہے ہیں وہ اس بات پر متفق ہیں کہ اس فرشتہ صفت انسان کو زندگی میں مسکرانے کے بہت کم مواقع ملے ہیں، لیکن اس بات کے باوجود بھی صبر واستقامت کا مادہ ان میں اس حد تک کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا کہ دماغ وذہن پر پریشانیوں، اندیشوں اور بیماری کے زبردست اور شدید کوڑے برسنے کے باوجود بھی اُف تک نہیں کرتے تھے''

(شیرازہ ؛ بیاد عمر مجید ؛ ص : ۷۸)

نوے کی دہائی میں جب کشمیر کے حالات نے اچانک ایک بھیانک کروٹ لی اور ہر طرف دھماکے اور گولیوں کی گھن گرج سنائی دینے لگی، انسانی خون ارزاں ہوگیا اور ہر انسان بے سکون و پریشان ہوگیا تو عمر مجید جیسے حساس دل رکھنے والا کہانی کار کیسے ان کربناک حالات کا شکار نہ ہوتے۔ اس دوران آپ ایک لمبے عرصے تک دنیا و مافیہا سے بے خبر قلم وقرطاس سے رشتہ توڑ کر گم سم گھر میں پڑے رہے۔ آخر ایک طویل وقفے کے بعد اپنی خاموشی توڑتے ہوئے ہفتہ روزہ ''کشمیر عظمیٰ'' کے مدیر جاوید آذر کے نام ایک طویل خط لکھا۔ مضمون کی طوالت کے پیش نظر دلچسپ ہونے کے باوجود اُس خط کو پیش کرنے سے قاصر ہوں لیکن اتنا ضرور کہوں گا کہ خط پڑھ کر یہ اندازہ ہوتا ہے کہ لال چوک سرینگر میں ایک دھماکے اور گولیوں کی گھن گرج کے ایک دلدوز واقع میں اپنے ہی پڑوسی عبدالخالق حجام کی المناک موت کا بچشم خود دیکھنے کے بعد وہ کیسے درد اور کرب میں مبتلا ہوگئے تھے۔ طویل عرصے کے بعد قلم وقرطاس سے دوبارہ رشتہ اُستوار کرنے کے بعد انہوں نے نامساعد حالات کو موضوع بنا کر کئی دل چھو لینے والے شاہکار افسانے تخلیق کر کے ایک بار پھر اپنی صلاحیتوں کا لوہا منوایا۔ اس سے پہلے کہ وہ اُردو ادب کے گلشن میں کچھ اور خوبصورت گل کھلاتے ۲۳ر دسمبر ۲۰۰۸ء کو اللہ کے اذن سے اپنے چاہنے والوں کو داغ مفارقت دے کر اس دنیائے فانی سے رخصت ہوگئے۔ اِنا للّٰہ واِنا الیہ راجعون.

مرحوم عمر مجید جو اپنی دل چھو لینے والی تحریروں کی صورت میں تادیر لوگوں کے دلوں میں زندہ رہیں گے، کی شخصیت اور شاندار ادبی سفر کے تمام پہلوؤں کو اس مختصر سے مضمون میں ضبط تحریر میں لانا ممکن نہیں ہے مگر یہ ایک خوش آئند بات ہے کہ اُردو اکادمی جموں وکشمیر، نگینہ انٹرنیشنل اور دیگر ادبی تنظیموں نے ان کے علمی وادبی کارناموں کو نمایاں کرنے کے لئے قابل قدر کام انجام دیا ہے، لیکن ضرورت اس بات کی ہے کہ اجتماعی طور پر مرحوم عمر مجید کے فن اور شخصیت کے تمام پہلوؤں کو نمایاں کرنے کے لئے زیادہ سے زیادہ کوششیں کی جائیں تاکہ نئی پود کو ان کے ناقابل فراموش علمی وادبی خدمات سے روشناس کیا جاسکے۔ آخر پر مرحوم کی یاد میں نوجوان شاعر سلیم ساغر کے کہے یہ اشعار ؎

پیکر صدق و صفا وہ صاحب عالی وقار
روٹھ کر ہم سے گیا اُردو ادب کا شہسوار

☆ ☆

Kashmir Treasures Collection, Srinagar

CC-0. In Public Domain. Digitized by eGangotri.

ڈاکٹر ریاض توحیدی
7006544358

عمر مجید کی افسانہ نگاری

معروضی جائزہ

عمر مجید (۱۹۴۰ء تا ۲۰۰۸ء) ایک مشفق اُستاد، صحافی اور تخلیق کار کے بطور صفت ثلاثہ کے مالک تھے۔ ان کے مدرسانہ، صحافتی اور تخلیقی خصائص کی صفت سرائی کشمیر کے ادباء، مفکر اور اساتذہ کرتے رہتے ہیں اور کشمیر سے باہر جن لوگوں کی نظروں سے ان کے افسانے گزرے ہیں وہ بھی ستائشی کلمات سے نوازتے رہے، مثلاً معتبر محقق اور نقاد پروفیسر عبدالقادر سروری ''کشمیر میں اُردو'' میں لکھتے ہیں :

''عمر مجید کو افسانے لکھنے کا ڈھنگ آتا ہے۔ ان کی نظر اپنے اطراف کی زندگی کا مشاہدہ کرنے کی صلاحیت رکھتی ہے اور ان مشاہدات کو وہ سلیقہ سے بیان کرنے کے اسلوب پر بھی قدرت رکھتے ہیں۔ نیچے کے طبقے کے لوگوں، کسانوں اور مزدوروں کی قابل رشک زندگی ان کا عام موضوع ہے''

اسی طرح ان کے افسانوں کے کردار اور موضوعات سے متعلق معروف افسانہ نگار نور شاہ لکھتے ہیں :

''عمر مجید کے افسانوں کا ایک الگ ہی انداز ہے۔ وہ افسانہ لکھنے کے ڈھنگ سے بخوبی واقف ہیں۔ وہ کردار زمین کی کھردری سطح پر تلاش کرتے ہیں اور چن چن کر اُنہیں اپنے افسانوں میں قید کر لیتے ہیں۔ اسلوب کا ستھراپن ان کی کہانیوں کی نمایاں خصوصیت ہے۔ کشمیر، کشمیریت اور کشمیر کی زندگی اُن کے محبوب ترین موضوعات ہیں''

مذکورہ اقتباسات میں عمر مجید کے افسانوں پر جو رائے زنی کی گئی ہے اُس میں مشترکہ طور پر افسانہ لکھنے کے رنگ ڈھنگ اور مقامی یعنی کشمیر کے موضوعات کی فنی عکاسی کا عمدہ اظہار کیا گیا ہے۔

جب ادب اور سماج کے مابین رشتہ، تعلق یا وابستگی کا مسئلہ آتا ہے تو ادب کو سماج کا آئینہ یا سماج کی عکاسی بھی کہا جاتا ہے۔ موضوعاتی طور پر یہ بات صحیح بھی ہے کہ زیادہ تر ادب میں سماجی زندگی کی عکاسی ہی ہوتی ہے کیونکہ ایک ادیب خود بھی ایک سماج کا حساس فرد ہوتا ہے۔ سماج کا مشاہدہ ہی اس کی فکر پر اثر انداز ہو جاتا ہے اور وہ الفاظ کے توسط سے شعر و فکشن یا دوسرے ادبی وسیلوں سے اپنے مشاہدے کو خیالات کا جامہ پہناتا ہے۔ اُردو یا کسی بھی زبان کے فکشن کی بیشتر موضوعاتی ساخت بھی سماجی زندگی پر اُستوار ہے جو سماج کے متنوع پہلوؤں کی فنی عکاسی کرتی ہے۔ اُردو فکشن (ناول/افسانہ) کی بات کریں تو اس میں بھی ابتداء سے لے کر عصر حال تک سماجی زندگی کی فنی عکاسی نظر آتی ہے یعنی ادب اور سماج کا رشتہ ہی ادب کو زندگی عطا کرتا ہے۔

درجہ بالا خیالات کے تناظر میں جب عمر مجید کے افسانوں کے موضوعات پر غور کریں تو ان میں کشمیری سماج کی زندگی کی روح دوڑتی نظر آتی ہے۔ کسی بھی تخلیق کار کی تخلیق میں جب مقامی زندگی کا ماحول فنی لوازمات کے ساتھ سانسیں لیتا ہے تو وہ اس کے ادبی اختصاص کی شناخت ثابت ہو سکتا ہے۔ اب اگر تنقیدی نظر سے دیکھیں تو عمر مجید

Kashmir Treasures Collection, Srinagar

CC-0. In Public Domain. Digitized by eGangotri.

کے افسانوں کے مطالعہ سے ظاہر ہے کہ ان کے افسانوں کے موضوعات کی تشکیلی ساخت "Morphologic structure" کشمیر کی سماجی زندگی کے اجزاء پر ترتیب پائی ہے اور ایک طرف ان کے افسانوں میں کشمیر کے رہن سہن اور حالات وواقعات اور سانحات کا سیاسی وسماجی، تہذیبی وثقافتی کا مشاہداتی اور لفظی وواقعاتی منظر نامہ "Lexical and Eventful Scenario" متاثر کن انداز سے سامنے آتا ہے تو دوسری جانب ان افسانوں کے کردار بھی مقامی رہن سہن اور نام وکام کی اچھی عکاسی کرتے ہیں۔ جیسے کرداروں کی مقامی شناخت کی بات کریں تو یعقوب، دینا ناتھ، عبدالخالق، فاطمہ، محمد شمیم، احمد، یوسف، محمد منور، سکینہ، غلام رسول، عبدالعزیز وغیرہ کردار مقامی ناموں کی عکاسی کرتے ہیں۔ اب عمر مجید کے افسانوں میں کون کون سے سماجی پہلو یا کن کن سماجی موضوعات کی فنی عکاسی کی گئی ہے تو اس کے لئے خصوصی طور پر درجہ ذیل افسانوں پر ارتکاز "Focus" کیا جاسکتا ہے۔ یہ افسانے سلیم سالک کی مرتب کردہ ایک اہم کتاب ''عمر مجید کے بہترین افسانے'' میں شامل ہیں۔ اگر اس کے علاوہ دوسرے افسانوں پر بھی کوئی بات کرے گا تو اور بھی بہتر رہے گا۔ چند افسانوں کے نام ملاحظہ کریں :

میری گلی کا غم، شہر کا اغوا، تلاشی، ماتم کے بعد، درد کا مارا، محمد شمیم کو کشمیر جانا ہے، مردہ چنار، پنڈورا کی نئی کہانی لاپتہ، گمشدہ جنت۔

فکشن شعریات کو پیش نظر رکھیں تو کامیاب افسانہ نگار کی ایک فنی خوبی یہ بھی ہوتی ہے کہ وہ افسانے یا کہانی کے موضوعاتی کینوس کے مطابق افسانے کی فضا بندی قائم کرتا ہے۔ تکنیکی طور پر کسی بھی افسانے کی فضابندی کے موضوعاتی کینوس کو کنٹرول میں رکھنا فن کاری کا اہم جز ہے جس کی وجہ سے افسانے کے پلاٹ میں فکر وفن اور تخیل کے مابین تخلیقی اشتراک "Creative Collaboration" قائم رہتا ہے۔ عمر مجید کے بیشتر افسانوں میں اس قسم کی فضا بندی یا منظر کشی ماہرانہ انداز سے نظر آتی ہے جو قاری کی سوچ کو ایک ہی جست میں موضوعاتی ماحول کی اسیر کردیتی ہے، جیسے افسانہ ''شہر کا اغوا'' کا یہ پہلا اقتباس دیکھیں جو کہ عنوان اور کہانی کے سیاق وسباق کی مطابقت "Contexual Adaptation" کے عین مطابق ہے :

> ''یہ کون سی جگہ ہے؟ یہ کیسی خاموشی ہے؟ یہ ویرانی کا عالم، یہ ڈرا دینے والی خاموشی، یہ مکان، یہ دکانیں، یہ سڑکیں خالی کیوں ہیں؟ ۔ ۔ اس شہر میں رہنے والے لاکھوں لوگ کہاں چلے گئے ہیں؟ یہ شہر جہاں زندگی متحرک تھی، جہاں اضطراب تھا، بھاگتی ہوئی بسیں اور موٹریں تھیں، سچ تھا، جھوٹ تھا، محبت تھی، نفرت تھی، وفا تھی، دغا تھی، لوگ ہر وقت تیزی سے اِدھر اُدھر بھاگتے رہتے تھے، وہ سب کہاں ہیں؟''

افسانہ نگار نے کردار کی سرگوشی میں شہر کی خاموش فضا کی منظر کشی کا فنی خاکہ اس انداز سے کھینچا ہے کہ قاری کا ذہن خود بخود کسی انجانے خوف ناک ماحول کی طرف چلا جاتا ہے جہاں کے ماحول پر جیسے آفت زدہ فضا چھائی ہوئی ہے جس کی وجہ سے زندگی کا پہیہ جام ہو چکا ہے۔

اسی طرح افسانہ ''میری گلی کا غم'' کی معنوی تہہ داری اور پھر کہانی کی فضا بندی اور موضوعاتی فنی برتاؤ "Artistic Treatment" کے درمیان بین المتن فکری ومشاہداتی کینوس اور وجودی کرب "Existential Agony" پر رد تشکیل تھیوری "Deconstruction theory" کے ضمن میں تجزیاتی نظر ڈالی

Kashmir Treasures Collection, Srinagar

CC-0. In Public Domain. Digitized by eGangotri.

جائے تو افسانہ ''میری گلی کا غم'' کی کہانی اور منظر نگاری کے زیر سطح کشمیر کی غم انگیز زندگی "Wailful life of Kashmir" کی دردانگیز سماجی نوحہ گری "Painful Social Mourning" کی المناک فنی عکاسی کی گئی ہے اور کہانی کار اس دردانگیز سماجی نوحہ گری کا ایک ایسا ہمدرد نوحہ گر "Sympathetic Lamenter" بن کر سامنے آتا ہے جو نہ صرف اپنی گلی اور اپنے شہر کے ماتم کناں ماحول کی داستان الم سنا رہا ہے بلکہ پوری وادی کی پُر آشوب فضا بھی کہانی کے اندر سمیٹ رہا ہے۔

عمر مجید اپنے افسانوں میں انفرادی درد کو اجتماعی درد بنانے کے ہنر میں بڑی مہارت رکھتے تھے جس کا مقصد یہ نکلتا ہے کہ بیشتر لوگ بظاہر زندگی کی کئی اہم چیزوں کے مالک ہونے کے باوجود داخلی طور پر کسی نہ کسی درد میں جیتے رہتے ہیں۔ افسانہ ''درد کا مارا'' بھی ایک ایسا ہی افسانہ ہے جس کا کردار بھی ایک ریٹائر سرکاری ملازم ہوتا ہے جو معاشی لحاظ سے خوشحال ہے کیونکہ اس کے بچے گلف میں جاب کرتے ہیں اور اس کی بچی ایک اچھے گھرانے میں بیاہی گئی ہوتی ہے، لیکن اس سب کے باوجود افسانے کی ابتداء میں مرکزی کردار کے داخلی درد کی عکاسی کی گئی ہے کہ قاری کے اندر کردار کے ذہنی تناؤ کو جاننے کا تجسس بڑھ جاتا ہے :

''میں صبح سے کسی مایوس، غمزدہ اور پریشان حال بے روزگار نوجوان کی طرح شہر کی خاک چھان رہا ہوں، بے مقصد بے مدعا ایک سڑک سے دوسری سڑک، ایک گلی سے دوسری گلی۔ جب دل کی وادی میں اندھیرا ہی اندھیرا چھایا ہو تو چلتے رہنا بھی کسی کام نہیں آتا۔ کوئی کہاں تک چلتا رہے جب دل کی ویران بستی میں اُمید کی کوئی رمق نہ ہو''

تو سوال کھڑا ہو جاتا ہے کہ یہ کون سا درد ہے جو کردار کو مادی طور پر خوشحال ہونے کے باوجود اندر سے کھائے جا رہا ہے اور اُسے ایک بے روزگار نوجوان کی طرح شہر کی خاک چھاننے پر مجبور کر رہا ہے۔ وہ غم ہوتا ہے اس کی بچی کا بانجھ پن، جس کی سزا اُسے طلاق کی اطلاع میں ملتی ہے اور یہی غم ایک والد کو سب کچھ ہونے کے باوجود اندر سے کھائے جا رہا ہے، تاہم افسانہ نگار انفرادی درد کو اجتماعی درد کی صورت اُس وقت عطا کرتا ہے جب وہ اسی پریشان حالت میں صبح سے بھوکا پیاسا میونسپل پارک کے ایک بینچ پر بیٹھا ہوتا ہے تو ایک پندرہ برس کی لڑکی پرانا پھٹا برقعہ اوڑھے گود میں چھ سات ماہ کا بچہ لئے اُس کے سامنے ہاتھ پھیلاتی ہے کہ :

''بابو جی! صبح سے کچھ نہیں کھایا۔ صبح سے بچہ بلک رہا ہے''

وہ اُسے پانچ سو کا نوٹ دیتا ہے تو اس کی آنکھوں میں ایک عجیب سی چمک عود آتی ہے اور وہ مسکرا کر کہتی ہے کہ :

''بابو جی! ۔ ۔ گھر میں بیوی نہیں''

اور ساتھ ہی ایک ادھ جلے مکان کی طرف اشارہ کرتی ہے کہ وہ پانچ منٹ بعد وہاں آجائے۔ اسی کے ساتھ افسانہ ختم ہو جاتا ہے۔ اس طرح سے افسانہ قاری کے سامنے یہ پیغام چھوڑ جاتا ہے کہ ایک انسان کو بچی کا بے اولاد ہونے کا غم ستا رہا ہے اور دوسرا انسان بچہ ہونے کے باوجود مفلسی کی وجہ سے کسی اور غم کا شکار نظر آتا ہے یعنی ہر انسان کسی نہ کسی درد کا مارا ہوا ہے اور درد کا مداوا درد سے ہی ہوتا ہے۔

بقول منظر لکھنوی ؎

غم میں کچھ غم کا مشغلہ کیجئے
درد کی درد سے دوا کیجئے

Kashmir Treasures Collection, Srinagar

CC-0. In Public Domain. Digitized by eGangotri.

اس طرح سے افسانے کا اختتام ایک ایسے کردار کی صورت میں سامنے آتا ہے جو بظاہر ہوس پرستی کی غمازی کرتا ہے لیکن افسانہ نگار نے اس کو مجبوری اور لاچاری کے طور پر پیش کر کے یہ جتلاتے کی کوشش کی ہے کہ مختلف انسانوں کے مختلف درد ہوتے ہیں، مختلف قسم کی پریشانیاں ہوتی ہیں۔ عمر مجید کے کرداروں سے متعلق سلیم سالک نے کتاب ''عمر مجید کے بہترین افسانے'' کے مقدمہ میں ایک خوبصورت بات کہی ہے کہ :

''عمر مجید کے کردار رومانوی کردار نہیں ہیں بلکہ ان سے حقیقت کے مختلف پہلو نمایاں ہوتے ہیں۔ حقیقت کی گہرائیوں تک جانا اُتنا آسان نہیں جتنا سمجھا جاتا ہے۔ ان کے افسانوں میں حقیقت کی جستجو ہے۔ ان میں کچھ نفسیاتی باریکیاں ہیں اور کہیں کہیں طنز کی لہر پوشیدہ ہے''

(ص : ۲۵)

سلیم سالک کا یہ اٹھائیس صفحات پر مشتمل مقدمہ عمر مجید کی افسانہ نگاری کے اہم پہلوؤں کو سمجھنے کے لئے بڑا اہم نظر آتا ہے کیونکہ انہوں نے عمر مجید کے افسانوں کا عمیق مطالعہ کر کے ان کے افسانوں کا فنی اور موضوعاتی طور پر جامع جائزہ لینے کی احسن کوشش کی ہے۔ عمر مجید کے بیشتر افسانے کشمیر کی تہذیب وثقافت اور یہاں کے آپسی بھائی چارے کی عمدہ عکاسی کرتے ہیں۔ ان افسانوں میں ''محمد شمیم کو کشمیر جانا ہے'' موضوع اور بیانیہ میں کشمیر کی تہذیب وثقافت اور آپسی بھائی چارے کا عمدہ نمونہ ہے۔ افسانے کے اہم کرداروں میں محمد انور حجام، اُن کا بیٹا، محمد شمیم اور کشمیری پنڈت وجے دھر ہیں۔ محمد شمیم ضلع مظفر نگر یوپی کا باشندہ ہوتا ہے جو کشمیر کے لئے رخت سفر باندھتا ہے تاکہ وہ کشمیر میں روزگار کما سکے لیکن یہ خبر سنتے ہی دوسرے لوگوں کے ساتھ ساتھ اُس کے والدین بھی پریشان ہو جاتے ہیں کہ کشمیر جیسی خطرناک جگہ کی طرف محمد شمیم جانا چاہتا ہے جہاں پر ہر وقت حالات خراب رہتے ہیں۔ اسی دوران یہ سن کر ایک کشمیری پنڈت وجے دھر جو مظفر نگر میں کلکٹر ہوتا ہے، ان کے گھر بیوی لاجونتی اور بیٹی انجلی کے ساتھ داخل ہوتا ہے اور اپنا تعارف پیش کرنے کے بعد کہتا ہے :

''ہم کشمیری ہیں۔ ہم محمد شمیم سے ملنے آئے ہیں جو کشمیر جا رہا ہے''

اس کے بعد افسانہ نگار نے اچھے ڈھنگ سے وجے دھر اور محمد انور کی باہمی گفتگو میں کشمیر کی تہذیب، یہاں کے بھائی چارے، یہاں کے چشموں کے میٹھے پانیوں، یہاں کی مہمان نوازی اور سماجی صورتحال کو کہانی کا روپ دیا ہے۔ محمد انور جب اپنے بیٹے کے کشمیر جانے پر تشویش کا اظہار کرتے ہوئے کہتا ہے کہ وہاں پر خون خرابہ بھی ہو رہا ہے تو وجے دھر پورے اعتماد سے اُس کا حوصلہ بڑھاتا ہے کہ :

''کچھ پروا نہیں ۔ ۔''

وجے دھر نے پانی کا ایک اور گلاس خالی کرتے ہوئے کہا :

''محمد شمیم کو کشمیر میں آنچ بھی نہ آئے گی۔ وہاں کے لوگ بڑے مہمان نواز ہیں۔ ہم تب تک خود کھانا نہیں کھاتے جب تک نہ اپنے مہمان کی دلجوئی کریں۔ میرے کشمیر کا ذرہ ذرہ مہمان نواز ہے''

مجموعی طور پر دیکھیں تو عمر مجید کے افسانے کشمیر کی تہذیب وثقافت، رہن سہن اور دُکھ درد کی دل نشیں عکاسی کرتے ہیں۔ ان کے افسانوں میں کشمیری سماج کی جیتی جاگتی تصویریں نظر آتی ہیں جو قاری کو فن اور حقیقت کے افسانوی پیکر سے محظوظ کرتی ہیں۔

☆ ☆

Kashmir Treasures Collection, Srinagar

CC-0. In Public Domain. Digitized by eGangotri.

مشتاق مہدی
6005656947

عمر مجید
میری یادوں کے آئینے میں

انسان مجموعہ رُاز ہے۔ اس کی شخصیت کے کئی پہلو ہوتے ہیں جن کو جاننے کے لئے ایک عمر درکار ہوتی ہے، پھر بھی ہم ظاہری طور کچھ منظر چرا ہی لیتے ہیں اور اندازہ لگا لیتے ہیں کہ آدمی ایسا ہے یا ویسا ہے، جب کہ اکثر ایسا ہوتا نہیں ہے ؎

نہ تجھ کو میں سمجھ پایا تو پھر سمجھے زمانہ کیا

بہرحال یہاں میں عمر مجید مرحوم کے ساتھ جڑی کچھ یادیں سمیٹنے کی کوشش کروں گا۔ عمر مجید صاحب کو میں نے پہلی بار غالباً ۱۹۷۵ء میں ''تلاش ادب'' کی ایک نشست کی صدارت کرتے ہوئے دیکھا تھا۔ یہ نشست بسکو اسکول میں منعقد کی گئی تھی۔ وہ اُس محفل کے منتظم تھے۔ بہت سارے نوجوان قلم کار حضرات وہاں موجود تھے۔ مجھے اُس محفل میں اپنا ایک افسانہ پڑھنے کی دعوت دی گئی تھی۔ اس افسانے کا نام ''مٹی کے دئے'' تھا۔ بعد میں اس پر اچھی خاصی بحث ہوئی۔ عمر مجید نے بھی اپنے زرّیں مشوروں سے نوازا۔ اُسی محفل میں مجھے معلوم ہوا کہ مجید صاحب ''آفتاب'' کے ادبی ایڈیشن کے انچارج ہیں۔ بس پھر کیا تھا، میں نے بھی کہانیاں اور نظمیں بھیجنا شروع کیں۔

''شیرازہ''، ''تعمیر'' یا کہیں پر بھی میرا افسانہ شائع ہوتا تو مجید صاحب ضرور ایک خوبصورت خط لکھ کر اپنی آراء سے آگاہ کرتے۔ وہ خلوص ومحبت کے پیکر تھے، اَنا اور عناد سے کوسوں دور۔ ہمیشہ ایک بڑے بھائی کی طرح پیش آتے۔

۱۹۷۶ء کی ایک خوبصورت شام کا ذکر ہے۔ وہ شاہین تھیٹر خانیار آ گئے۔ اُن کے ہاتھ میں ''شب خون'' نام کا ایک ادبی جریدہ تھا۔ اس میں سوہن لال کی ایک کہانی ''میں بوند بوند زہر پیتا ہوں'' شائع ہوئی تھی، جو اُن کو بہت پسند آ گئی تھی۔ مجھے یہ جریدہ پڑھنے کے لئے دیا۔ کہانی واقعی بہت عمدہ اور دلچسپ انداز میں بیان کی گئی تھی۔ اس جریدے میں شامل افسانے، مضامین اور شاعری عام روش سے ہٹ کر تھے بلکہ کہنا چاہئے کہ جدید ادب کے ترجمان تھے اور یہ میرے لئے ایک نئی چیز تھی۔ بس پھر کیا تھا، ٹھیک اُسی دن سے میں ''شب خون'' کا گرویدہ ہو گیا اور مضبوطی کے ساتھ اس سے منسلک رہا۔ میری نظمیں اس میں شائع ہوتی رہیں۔

میرا افسانہ ''دیوتا'' جو کہ علامتی تھا ''تعمیر'' میں شائع ہوا، تو کچھ ہی روز کے بعد مجید صاحب کا ایک طویل خط موصول ہوا۔ ایسا لگا یہ طرز نگارش اُنہیں پسند نہ آئی تھی۔ اس خط میں علامت نگاری سے اُن کی بیزاری کا صاف اشارہ ملتا تھا۔ علامتی اسلوب کو وہ ادب عالیہ کے لئے سم قاتل اور قاری کے لئے کوفت جان سمجھتے تھے۔ بہرحال کچھ روز بعد میں اُن سے ملاقات کی غرض سے بسکو اسکول گیا۔ سہ پہر کا وقت تھا۔ وہ کمرے میں اکیلے بیٹھے تھے۔ حسب عادت مسکرا کر ملے۔ علیک سلیک کے بعد میں نے اپنا نیا افسانہ ''شنکر بابا'' پڑھنے کے لئے دیا اور ساتھ ہی ایک کوشش بھی کی، اُن کے سامنے علامت نگاری کی وہ ساری خوبیاں بیان کیں جنہوں نے مجھے متاثر کیا تھا۔ وہ بس سنتے رہے۔ ایسا لگا کہ میری دلیل سے وہ زیادہ مطمئن نہ ہوئے، بحث بھی نہیں کی، بس سنتے رہے۔

Kashmir Treasures Collection, Srinagar

CC-0. In Public Domain. Digitized by eGangotri.

۸۰ کی دہائی کا ذکر ہے۔ ایک دوست کے ساتھ کھلن مرگ جاتے ہوئے میں نے ایک پڑاؤ پر عمر مجید کو لڑکوں کے ایک ہجوم میں گلے میں مفلر لٹکائے ہوئے دیکھا۔ بڑے ہی تروتازہ اور خوش پوش تھے۔ مجھے بہت مسرت بلکہ حیرت بھی ہوئی۔ وہ اُس وقت قلم کار کم اور سپورٹس مین زیادہ لگ رہے تھے۔ وہ کوہ پیما ٹیم کے لیڈر تھے اور بچوں کو کوئی ہدایت دے رہے تھے۔ میں قریب گیا تو مسکرائے۔ پرتپاک انداز میں ملے، پوچھا :

''کیا پروگرام ہے بھئی؟ ۔ ۔ کہاں جانا ہے؟''

''کھلن مرگ''

جواب سن کر بولے :

''ٹھیک ہے۔ لنچ کر کے جانا''

نزدیک ہی دو تین دیگوں میں کچھ پک رہا تھا۔ جلتی آگ کے گرد کچھ لڑکے خانساماں بنے آپس میں ہنسی مذاق کرتے ہوئے منظر کو خوش نما بنا رہے تھے اور ہم دونوں اس سے لطف اندوز بھی ہو رہے تھے۔ بہرحال انکار کے باوجود بھی ہمیں بغیر لنچ کئے جانے نہ دیا۔

عمر مجید صاحب کا ادبی سفر قریب پانچ دہائیوں پر محیط تھا۔ ان کا پہلا افسانوی مجموعہ ''اُجالوں کے گھاؤ'' کے نام سے شائع ہوا۔ پھر اس کے بعد ۱۹۷۰ء میں پہلا ناول ''یہ بستی یہ لوگ'' اور ۱۹۷۶ء میں ''درد کا دریا'' نام سے دوسرا ناول شائع ہوا۔ ان کی وفات کے بعد سلیم سالک نے بھی ''عمر مجید کے بہترین افسانے'' کے نام سے ایک خوبصورت افسانوی مجموعہ ترتیب دیا۔

عمر صاحب نے مختصر افسانے بھی لکھے اور ایک لمبے عرصے تک اخبار ''آفتاب'' کے لئے کالم نگاری بھی کی۔ وہ ادب برائے زندگی کے قائل تھے۔ ایک مخصوص طرز نگارش کے مالک تھے۔ زبان سادہ، سلیس اور خوبصورت تھی۔ ان کے افسانوں کا کینوس کشمیر تھا اور کشمیری معاشرت کے عام مسائل ان کے افسانوں میں بکھرے پڑے ہیں۔ انہوں نے سیاسی اور معاشی استحصال کے مارے افراد اور خاص کر نچلے طبقہ کے لوگوں کی خوب نمائندگی کی ہے۔ ''چھوٹا آدمی''، ''گمشدہ جنت'' اور ''شہر کا اغوا'' ان کے بہترین افسانے ہیں۔

۹۰ کی دہائی میں یہاں جو تحریک چلی، اُس میں سب کچھ تباہ ہو گیا۔ ہزاروں انسانی جانوں کا زیاں ہوا۔ اس خون آشام دور نے یہاں کے فرد فرد کو متاثر کیا بلکہ پوری وادی کا نظام درہم برہم کر دیا، جس کی زد میں عمر مجید جیسے ہزاروں معصوم حساس لوگ بھی آ گئے۔ روز روز کی خوں ریزیوں نے ان کے اندروں کو جھنجھوڑ کے رکھ دیا۔ لوگ اپنے اپنے ڈربوں میں چھپ گئے کہ باہر موت کا تانڈو تھا۔ ساری ادبی سرگرمیاں ٹھپ ہو کر رہ گئیں۔ اُس خون آشام دور میں لال چوک کی ویران سڑکوں پر عمر مجید کو جب بھی دیکھا تو بے حد پریشان اور اُلجھنوں میں گرفتار پایا۔ جانے کیا غم ستائے جا رہا تھا اُنہیں ۔ ۔ ! پھر اسی ماتمی صورت حال میں ایک روز یہ خبر سنی کہ ہمارا ہر دل عزیز افسانہ نگار، ایک بہترین مدرس اور نیک سیرت انسان اس جہانِ فانی سے کوچ کر گیا۔

☆ ☆

اُردو سیکھئے اور سکھایئے

اس زبان میں دستیاب جرائد و رسائل خود بھی پڑھیں اور دوسروں کو بھی پڑھنے کو دیں۔

Kashmir Treasures Collection, Srinagar

CC-0. In Public Domain. Digitized by eGangotri.

ڈاکٹر قسیم اختر
9470120116

''غبارِ خاطر'' کا اسلوبیاتی تناظر

موضوعات ومواد کے برخلاف مولانا ابوالکلام کی نثر کی پہلی خصوصیت ان کا پرشکوہ اسلوب ہے۔ ان کے اسلوب میں علم کی گہرائی کا احساس بسا ہے تو ان کی علمی انانیت کا پس منظر بھی۔ کیونکہ تشکیل اسلوب کا معاملہ انسان کی داخلیت سے بھی جڑا ہوتا ہے، اس لئے یہ کہنے میں کوئی مضائقہ نہیں کہ لفظی انتخاب کا معاملہ نفسیاتی معاملات سے بھی متعلق ہوتا ہے، حالانکہ بہت سے اسلوبیاتی ناقدین یہ تسلیم کرتے ہیں کہ اسلوب کا مطالعہ دراصل معروضی مطالعہ ہوتا ہے۔ ہمیں بھی یہ تسلیم ہے کہ اسلوبیاتی مطالعہ ایک معروضی مطالعہ ہے، تاہم یہ بات بھی اہم ہوسکتی ہے کہ اسلوبیات، لسانیات سے حد درجہ قریب ہونے کے باوجود لسانیاتی سروکار سے قدرے مختلف ہوتی ہے۔ کیونکہ لسانیات میں فقط الفاظ کے استعمال اور صوتی آہنگ سے زیادہ رابطہ رکھا جاتا ہے تاہم اسلوبیات میں صوت مزاج کے ساتھ معنیاتی نظام کو بھی زیر بحث لایا جاتا ہے۔ ظاہر ہے جب معنیاتی نظام کو زیر بحث لایا جائے گا تو از خود اسلوبیاتی کی معروضیت میں لچک پیدا ہوگی۔ اسلوبیاتی کے تناظر میں پروفیسر گوپی چند نارنگ نے اپنی کتاب ''ادبی تنقید اور اسلوبیات'' میں لکھا ہے :

''صوتیات، لفظیات، نحویات اور معنیات کا تعلق اسلوبیاتی تجزیے سے ہے''

وہ مزید لکھتے ہیں :

''زبان ان چاروں سے مل کر متشکل ہوتی ہے۔ خالص لسانیاتی تجزیوں میں کسی بھی سطح کو الگ سے بھی لیا جاسکتا ہے لیکن ادبی اظہار کے تجزیے میں ہر سطح کے تصور میں زبان کا کلی تصور شامل رہتا ہے، اس لئے معنی لفظ ہے اور لفظ معنی۔ معنی کی اکائی کلمہ ہے اور کلمہ لفظ یا لفظوں کا مجموعہ ہے اور خود لفظ آواز یا آوازوں کا مجموعہ ہے۔ یعنی اسلوبیاتی تجزیے میں خواہ ایسا ظاہر نہ کیا گیا ہو اور سائنسی طور پر محض کسی ایک سطح کا تجزیہ کیا گیا ہو''

اس اقتباس سے تشکیل اسلوب کے معاملات سامنے آتے ہیں، یعنی اسلوب کا معاملہ فقط لفظی انتخاب سے نہیں ہوتا ہے بلکہ معانی سے بھی اسلوب میں زور پیدا ہوتا ہے۔ اسلوب اور معنی ہم آہنگ ہوکر صوتیات کو مضبوطی فراہم کرتے ہیں۔ گوپی چند نارنگ کا خیال ہے کہ زبان کو معانی سے الگ نہیں کرسکتے۔ اسلوبیات میں نتائج اخذ کرتے ہوئے اس طرح کے خطرے سے آگاہ رہنا ضروری ہے کہ اسلوبیاتی تجزیہ محض ہیئتی تجزیہ نہیں جس پر ''نئی تنقید'' کا دارومدار ہے۔ اُردو میں مسعود حسین خان اور پروفیسر نارنگ نے اسلوبیاتی حوالوں سے بہت کام کیا ہے۔ ان کے اسلوبیاتی تجزیے میں ہم اس بات کو محسوس کرتے ہیں کہ انہوں نے اسلوبیاتی نظام کو معنیاتی نظام سے الگ نہیں کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے اسلوبیاتی مطالعے میں تنقیدی احساس بھی بسا ہوا ہے اور لسانیاتی معاملات بھی۔ اس لئے ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ غبارِ خاطر کے مطالعے میں ہم ادبی اسلوبیات کے اصولوں سے ہی سروکار رکھیں۔

مولانا ابوالکلام کے نثری اسلوب میں ان کی زندگی اور خاندانی پس منظر کا بھی بڑا عمل دخل ہے اور ان کے خطیبانہ آہنگ کا بھی۔ اسی طرح کم

Kashmir Treasures Collection, Srinagar

CC-0. In Public Domain. Digitized by eGangotri.

عمری میں انہوں نے جو کچھ حاصل کیا ہے اُس سے بھی کسی خوداعتمادی کی کیفیت پیدا ہوتی ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ مولانا ابوالکلام آزاد ایک ایسی ہی شخصیت کا نام ہے جو آج بھی ہماری بے توجہی کے باوجود زندہ ہے، وجہ ظاہر ہے کہ مولانا آزاد وہ دیدہ ور تھے جو نرگس کے ہزاروں سال آنسو بہانے کے بعد پیدا ہوتا ہے۔ صرف چودہ سال کی عمر میں مشرقی علوم کا نصاب مکمل کر لینا اور پندرہ سال کی عمر میں ماہنامہ جاری کرنا ان کے Legend ہونے کا ثبوت ہے۔ وہ ایک جادو بیان خطیب، بے مثال صحافی، اصول پسند سیاست داں، قوم وملت کا ہمدرد رہنما اور مفسر قرآن ہونے کے ساتھ ساتھ اپنی طرز کے ایک منفرد انشاء پرداز بھی تھے۔ ان کے خطوط کا مجموعہ ''غبارِ خاطر'' ان کے اسلوب کا نادر تحفہ ہے۔ قلعہ احمد نگر میں اسیری کے دوران مولانا آزاد نے یہ خطوط لکھے تھے، حالانکہ یہ اسیری بڑی سخت تھی، کسی سے ملنے یا خط وکتابت پر بھی پابندی تھی۔ مولانا کسی سے مراسلت نہیں کر سکتے تھے مگر دل کا غبار نکالنے کے لئے قلم وقرطاس تو تھے ہی۔ یہ ''غبار'' جب یکجا ہو گئے تو ''غبارِ خاطر'' کی صورت میں سامنے آئے اور آج بھی اس کا ''غبار'' ہر قاری اپنے دماغ میں محسوس کرتا ہے۔

مولانا ابوالکلام آزاد کی زندگی کی مذکورہ خصوصیات کا سرا اگر ان کے اسلوب سے جوڑیں تو از خود واضح ہوگا کہ ان کے اندر خودداری اور خوداعتمادی کا جوہر تھا۔ دانشورانہ روایت اور خاندانی وجاہت کے ساتھ ان کے اندر صحافیانہ مزاج تھا۔ ظاہر ہے جب یہ تمام خصوصیات مدغم ہو کر ایک انسان کا اسلوب ٹھہرے تو اس میں پرشکوہ انداز ہوگا، جیسا کہ ہم مولانا ابوالکلام آزاد کے اسلوب میں پاتے ہیں۔ اس بات کی بھی وضاحت ضروری ہے کہ کسی صاحب قلم کے اسلوب میں موضوعات ومواد کی وجہ سے معمولی تبدیلی تو آتی ہے تاہم اس تبدیلی میں صاحب قلم کی انفرادیت ڈھونڈ لیتے ہیں۔

مولانا ابوالکلام آزاد نے مختلف موضوعات پر خامہ فرسائی کی ہے۔ اسلامی موضوعات اور سیاسی معاملات کو زیر بحث لایا ہے۔ ''غبار خاطر'' دراصل خطوط کا مجموعہ ہے، تاہم ان خطوط کی نوعیت علمی اور تحقیقی مزاج سے مل جاتی ہے۔ اس لئے ہم اس مجموعے میں اسلوب کے مختلف رنگ دیکھتے ہیں اور دیگر مقامات پر بھی ان کے اسلوب کے مختلف رنگ نظر آتے ہیں، تاہم ہر جگہ ان کا پرشکوہ انداز ہمیں متوجہ کرتا ہے۔

''الہلال'' اور ''البلاغ'' کے اداریے دیکھیں، اُن کا الگ ہی انداز ہے۔ ''تذکرہ'' کے لئے جو اسلوب اختیار کیا جانا چاہئے مولانا آزاد وہاں وہی اسلوب اپناتے ہیں۔ اسی طرح ''غبارِ خاطر'' میں ہمیں کوئی ایک اسٹائل نہیں ملتا بلکہ مکتوبات کے موضوعات جدا جدا ہونے کی بنا پر طرز نگارش بھی جدا جدا اختیار کی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہماری ملاقات کہیں آسان اور عام فہم نثر سے ہوتی ہے تو کہیں شاعرانہ چاشنی کچھ اور ہی لطف دے جاتی ہے اور کہیں فارسی آمیز علمی زبان ہماری فہم ولیاقت کا امتحان لیتی نظر آتی ہے۔ مولانا آزاد کی اسی طرز نگارش کا ذکر کرتے ہوئے عبدالقوی دسنوی لکھتے ہیں :

''ان میں کبھی دو انشائیہ نگار بن جاتے ہیں۔ کبھی کہانی کار، کبھی مورخ، کبھی فلسفی، کبھی محقق، کبھی ناقد، کبھی موسیقی نواز، کبھی انسانیت کے علمبردار اور کبھی محض ایک خط نگار۔ یہ سارے خطوط ''غبارِ خاطر'' میں جمع ہیں اور اُردو ادب میں اہم اضافہ ہیں''

عبدالقوی دسنوی کی ان تمام باتوں سے اتفاق کیا جاسکتا ہے، کیونکہ انشائیہ دراصل زبان کی ترنگ ہے۔ مولانا ابوالکلام آزاد نے لفظوں کے انتخاب میں جہاں صوتی آہنگ سے سروکار رکھا، وہیں انہوں نے تشکیل زبان میں ترنگ کو بھی سمویا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ''غبار خاطر'' کی

Kashmir Treasures Collection, Srinagar

CC-0. In Public Domain. Digitized by eGangotri.

قرأت کے دوران ہم زیرلب مسکرا بھی دیتے ہیں۔ یہی وہ خصوصیت ہے کہ ہم ان کے اسلوب کو انشائیہ سے جوڑتے ہیں۔ اسی طرح کہانی کے لئے بیانیہ ایک لازمی عنصر ہے اور بیانیہ اُس وقت دلچسپ ہوتا ہے جب پلاٹنگ کا خیال رکھا جائے۔ ''چڑیا چڑے'' میں بیانیہ اور واقعات کے معروضی ارتباط کا طریقہ موجود ہے۔ اسی لئے ہم ''غبارِ خاطر'' میں ایک بیان کنندہ ابوالکلام کو بھی دیکھتے ہیں۔ اس کے علاوہ مولانا اس میں مورخ بھی نظر آتے ہیں، وہ بھی نہ صرف ایسے مورخ جو فقط اپنے زمانے کی تاریخ بیان کررہا ہو، بلکہ اپنے سے ماقبل تاریخ کا تجزیہ بھی۔ تاریخی تجزیہ نہ صرف ابوالکلام آزاد کی علمیت کا ثبوت ہے بلکہ ان کی یادداشت پر عش عش کرنے پر مجبور کرتا ہے۔ رہی بات موسیقی کی تو اس کے متعلق طویل ترین مضمون اس میں موجود ہے۔ یہ مضمون جہاں ان کی علمیت کی طرف اشارہ کرتا ہے، وہیں اسلام اور موسیقی کے متعلق آگاہی اور علمی استحضار کی دلیل بھی فراہم کرتا ہے۔ اس لئے یہ عبدالقوی دسنوی کے ہر اشارے سے ان کے لئے اتفاق کرنا آسان ہے جس نے گیرائی کے ساتھ ''غبارِ خاطر'' کا مطالعہ کیا ہے۔ مولانا ابوالکلام کے اسی اسلوب کی تحسین کرتے ہوئے عبدالماجد دریابادی نے قلم توڑ دیا ہے۔ ان کے الفاظ میں :

> ''خدا جانے کتنے نئے اور بھاری بھرکم لغات اور نئی ترکیب اور نئی تشبیہیں اور نئے اسلوب ہر ہفتے اسی ادبی اور علمی ٹکسال سے ڈھل ڈھل کر باہر نکلنے لگے اور جاذبیت کا یہ عالم تھا کہ نکلتے ہی سکہ رائج الوقت بن گئے۔ حالی وشبلی کی سلاست، سادگی سر پیٹتی رہی اور اکبرالہ آبادی اور عبدالحق سب ہائے ہائے کرتے رہ گئے''

یہ سچی بات ہے کہ مولانا ابوالکلام آزاد کا اسلوب فقط بھاری بھرکم الفاظ سے ہی تشکیل نہیں پاتا ہے بلکہ نئی نئی ترکیبوں اور تشبیہوں نے ان کی نثر کو تازگی عطا کی ہے۔ شاعری میں تراکیب کی اپنی معنویت اور گیرائی ہوتی ہے۔ شاید ان ترکیبوں اور تشبیہوں نے ان کی نثر کو مالامال کیا ہے۔

مولانا ابوالکلام آزاد نے ''غبار خاطر'' کے کئی خطوط میں عام فہم زبان استعمال کی ہے۔ بعض علامتی کہانیوں میں بھی ان کا اسلوب سادہ اور سلیس ہے، اس لئے کہ بظاہر مکتوب ہونے کے باوجود یہ ایک کہانی ہے اور مولانا آزاد کہانی کے فن سے واقف تھے، مثال کے طور پر ''چڑیا چڑے کی کہانی'' کو دیکھا جاسکتا ہے۔

دوسری طرف جیسا کہ اوپر عرض کیا گیا شاعرانہ انداز بیان بھی اختیار کیا گیا ہے۔ یہ انداز غبار خاطر کا وصف خاص ہے۔ اس انداز بیان کے ساتھ اشعار کا استعمال بھی کثرت سے ملتا ہے۔ لیکن مولانا آزاد کو پورے طور پر سمجھنا ہر کس وناکس کے بس کی بات نہیں ہے۔ کیوں کہ اس میں عربی کے اشعار کے ساتھ ایسے نامانوس الفاظ اور ترکیبات کا استعمال بھی ملتا ہے جنہیں عربی زبان سے پوری واقفیت کے بغیر نہیں سمجھا جاسکتا۔ مولانا نے عربی فقرے، ضرب الامثال اور ترکیبوں کو تو اپنایا ہی، ساتھ ہی فارسی تراکیب اور الفاظ کا استعمال بھی کثرت سے کیا ہے۔ غبار خاطر کا آغاز ہی فارسی کے ایک شعر سے ہوتا ہے۔ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ مولانا آزاد اردو کے ہی نہیں عربی وفارسی کے بھی جید عالم تھے اور ان کی علمیت ان کی تحریروں میں عود عود کر آتی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔

مولانا آزاد کے ان مکتوبات میں طنز ومزاح کی چاشنی بھی ہے جو زبان کی مشکل پسندی کے باوجود ان کی تحریر کو دلچسپ اور دل نواز بناتی ہے۔ ان تحریروں میں مولانا آزاد کی شخصیت بھی جھلکتی ہوئی محسوس

Kashmir Treasures Collection, Srinagar

CC-0. In Public Domain. Digitized by eGangotri.

ہوتی ہے۔ سب سے حوصلہ افزا بات یہ ہے کہ قید و بند کی صعوبت میں بھی مولانا کی رومان پسندی نہیں جاتی۔ وہ اس انداز سے شرح دل کرتے ہوئے نظر آتے ہیں جیسے نہایت خوشگوار ماحول میں قلم کاغذ لیے بیٹھے ہوں۔ اور دنیا و مافیہا سے بے نیاز یادوں کے تہہ خانے کا در وا کر کے ہیرے جواہرات لٹا لٹا کر خوش ہو رہے ہوں۔ ان کے اسلوب کی یہی دلکشی ہے کہ حامدی کاشمیری ان خطوط کو خطوط نہیں انشائیہ قرار دیتے ہیں۔ یہ اقتباس ملاحظہ ہو :

''غور سے دیکھا جائے تو ''غبار خاطر'' کے مکتوبات، مکتوبات سے زیادہ انشائیہ نگاری کے تقاضوں کو پورا کرتے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مصنف نے حالت اسیری میں قلم ہاتھ میں لے کر اپنے حافظے میں محفوظ واقعات اور مشاہدات کو سپرد قرطاس کیا ہے اور ساتھ ہی اپنی علمیت، عقاید، افکار اور نظریات کا اظہار بھی کیا ہے۔ چنانچہ ''غبار خاطر'' میں مذہب، خدا، کائنات اور غم و مسرت جیسے گمبھیر مسائل سے لے کر حریفان سقف و بام یعنی چڑیوں سے محاذ آرائی جیسے مزاحیہ واقعے کے بیان تک مصنف نے پوری ذہنی آزادی اور طبیعت کی ترنگ کے مطابق اپنے خیالات و تاثرات کو قلمبند کیا ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان کی نگارشات انشائیہ نگاری ہی کے ذیل میں آتی ہیں''

اب تک میں نے ''غبار خاطر'' سے کوئی اقتباس درج کرنے سے گریز کیا لیکن اس کے بغیر ان کے اسلوب پر گفتگو نامکمل ہوگی۔ چند خطوط سے منتخب یہ اقتباسات ملاحظہ فرمائیں جو ان کے الگ الگ انداز بیان کو واضح کرتے ہیں:

اقتباس ۱

''موتی کے گھونسلے سے ایک بچے کی آواز عرصہ سے آ رہی تھی۔ جب وہ دانوں پر چونچ مارتی تو ایک دو دانوں سے زیادہ نہ لیتی اور فوراً گھونسلے کا رخ کرتی وہاں اس کے پہنچتے ہی بچے کا شور شروع ہو جاتا۔ ایک دو سکنڈ بعد پھر آتی اور دانہ لے کر اڑ جاتی۔ ایک مرتبہ میں نے گنا تو ایک منٹ کے اندر سات مرتبہ آئی گئی''

اقتباس ۲

اصحاف کہف کی نسبت کہا گیا ہے :

فَضَرَبْنَا عَلٰی اٰذَانِهِم فی الْکَهْفِ سِنِیْنَ عَدَدًا .

تو ایسی ہی ضرب علی الاذان کی حالت ہم پر بھی طاری ہوگئی، گویا جس دنیا میں بستے تھے وہ دنیا ہی نہ رہی:

کَانَ لَم یَکُن بَینَ الْحَجُون اِلی الصَّفَا
اَنِیسٌ وَلَم یَسْمَرْ بِمَکَّةَ سَامِرُ!

اقتباس ۳

ایں رسم و راہ تازۂ حرمان عہد ماست
عنقا بہ روزگار کسے نامہ بر نہ بود

صدیق مکرم!

وہی چار بجے صبح کا جانفزا وقت ہے، چائے کا فنجان سامنے دھرا ہے، اور طبیعت دراز نفسی کے بہانے ڈھونڈ رہی ہے۔ جانتا ہوں کہ میری صدائیں آپ تک نہیں پہنچ سکیں گی تاہم طبع نالہ سنج کو کیا کروں کہ فریاد وشیون کے بغیر نہیں رہ سکتی۔ آپ سن رہے ہوں یا نہ سن رہے ہوں، میرے ذوق مخاطبت کے لیے یہ خیال بس کرتا ہے کہ روے سخن آپ کی طرف ہے :

Kashmir Treasures Collection, Srinagar

CC-0. In Public Domain. Digitized by eGangotri.

اگر نہ دیدی تپیدن دل ، شنیدنی بود نالۂ ما

ان تین اقتباسات میں تین طرح کے اسالیب ہمارے سامنے ہیں۔ ایک بالکل عام فہم، دوسرا عربی شعر اور عبارت سے مملو اور تیسرا فارسی آمیز۔ ایک چوتھا اسلوب بھی ہے اور یہ اس قدر دلکش ہے کہ سر دھننے کو جی چاہتا ہے، ملاحظہ ہو یہ اقتباس :

''قید خانے کی چار دیواری کے اندر بھی سورج ہر روز چمکتا ہے اور چاندنی راتوں نے کبھی قیدی اور غیر قیدی میں امتیاز نہیں کیا۔ اندھیری راتوں میں جب آسمان کی قندیلیں روشن ہو جاتی ہیں تو وہ صرف قید خانے کے باہر ہی نہیں چمکتیں، اسیران قید و محن کو بھی اپنی جلوہ فروشیوں کا پیام بھیجتی رہتی ہیں۔ صبح جب طباشیر بکھیرتی ہوئی آئے گی اور شام جب شفق کی کلگوں چادریں پھیلانے لگے گی، تو صرف عشرت سراؤں کے دریچوں ہی سے ان کا نظارہ نہیں کیا جائے گا، قید خانے کے روزنوں سے لگی ہوئی نگاہیں بھی انہیں دیکھ لیا کریں گی۔ فطرت نے انسان کی طرح کبھی یہ نہیں کیا کہ کسی کو شاد کام رکھے، کسی کو محروم کرے۔ وہ جب کبھی اپنے چہرے سے نقاب الٹتی ہے، تو سب کو یکساں طور پر نظارۂ حسن کی دعوت دیتی ہے''

مولانا آزاد کے اس اسلوب میں شجاعت اور درس کا عنصر پایا جاتا ہے تاہم تبلیغی معاملات کو بھی انھوں نے ایسا شگفتہ انداز عطا کیا جو کبھی ہمیں تبلیغی تناظر اور فرحت و مسرت کے تناظر میں ملتفت کرتا ہے، تو کبھی اسلوب کا سہل ترین نمونہ ہمیں اپنی جانب متوجہ کرتا ہے۔ اس لیے یہ کہا جاسکتا ہے کہ مولانا ابوالکلام آزاد نے موضوعات کے مدنظر اسلوب کو تشکیل دیا ہے۔

امام الہند کا یہ اسلوب انہی کے لئے مخصوص تھا۔ الہلال کی اشاعت کے دوران دوسرے لکھنے والوں کی بھی یہ کوشش ہوتی تھی کہ وہ ابوالکلام جیسی نثر لکھیں مگر اصل اور نقل کا فرق واضح ہے۔ اوپر دیے گئے یہ اقتباسات اس بات کی طرف اشارہ کرتے ہیں کہ مولانا آزاد کے اسلوب کو کسی ایک طرز اظہار کا نام دے کر محدود نہیں کیا جاسکتا۔ عبدالقوی دسنوی نے ٹھیک ہی کہا ہے کہ وہ اپنے خطوط میں انشائیہ نگار بھی ہیں، محقق بھی، فلسفی اور مورخ بھی، ناقد اور موسیقی نواز بھی۔ کم لفظوں میں ہم یہی کہہ سکتے ہیں کہ ابوالکلام آزاد نے موئے قلم سے جو نقش و نگار بنائے ہیں وہ ہر نظر کو حیرت اور روح کو تازگی عطا کرتے ہیں۔ ''غبار خاطر'' کی دلکشی اس کی حیات آفریں طرز تحریر ہے۔ اسی دلکشی کے قربان جاتے ہوئے نیاز فتح پوری نے مولانا آزاد کو ایک خط میں لکھا تھا'' آگر آپ کی زبان میں مجھے کوئی گالیاں بھی دے تو ہل من مزید کہتا رہوں گا۔'' اور حسرت موہانی نے اپنی حسرت کا اظہار اس طرح کیا:

جب سے دیکھی ابوالکلام کی نثر
نظم حسرت میں کچھ مزا نہ رہا

''غبار خاطر'' سے یہ اشکال بھی ہوتا ہے کہ کیا خطوط بے ساختگی اس میں باقی ہے یا فقط تصنع ہی تصنع ہے۔ مولوی عبدالحق نے لکھا ہے :

''خط دلی جذبات و خیالات کا روزنامچہ اور اسرار حیات کا صحیفہ ہے''

آل احمد سرور نے لکھا ہے :

''اچھا خط وہ کہا جاسکتا ہے کہ جس میں لکھنے والا اپنے مخاطب سے باتیں کرتا ہوا نظر آئے، جس میں بے تکلفی، بے ساختگی، خلوص، فطری رنگ، انفرادیت اور ذاتی تاثرات کی جھلک ہو''

Kashmir Treasures Collection, Srinagar

CC-0. In Public Domain. Digitized by eGangotri.

ان معزز ناقدین کی رائے اپنی جگہ اہم ہے، مگر پہلی بات یہ ہے کہ مولانا ابوالکلام نے ''غبار خاطر'' میں کتنے لوگوں کو مکتوب الیہ بنایا؟ دوسری بات یہ ہے کہ کیا واقعی ان خطوط کے تبادلے ہوئے؟ تیسری بات یہ کہ ان خطوط کو لکھتے وقت مولانا ابوالکلام آزاد نے کتابوں سے استفادہ کیا؟ چوتھی بات یہ کہ قید و بند کی زندگی میں کتنی رنگا رنگی ہو سکتی ہے کہ ہر خط میں ذاتی احوال ہوں؟

ان چار سوالوں میں سے دو باتیں انتہائی اہم ہیں۔ مکتوب الیہ کے تناظر میں، دوم کتابوں کے استفادے کے معاملے میں۔ مکتوب الیہ کے تناظر میں نواب صدر یار جنگ مولانا حبیب الرحمٰن شیروانی کا نام ہے۔ ظاہر ہے مولانا ابوالکلام آزاد نے جن مباحث کو خطوط میں پیش کیا وہ ان دونوں کے درمیان بے تکلفی کی حیثیت رکھتے ہوں۔ ایسی بحث کو ایک سادہ بحث مانتے ہوں۔ اسی طرح مولانا ابوالکلام آزاد نے علمیت کے لیے اظہار کے لیے خط لکھتے وقت کسی کتاب سے استفادہ نہیں کیا۔ گویا علمی مباحث ان کی تکلفی کے زمرے میں آتے ہیں۔ پھر جیل کی زندگی میں کوئی رنگا رنگی نہیں ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے جیل کی زندگی کے مناظر بیان کرتے تھے اور اسی تناظر میں علمی گفتگو کرتے تھے۔ رہی بات غالب کے خطوط کی تو ان کے یہاں مکتوب الیہ بہت ہیں اور سب کی ذہنی سطح ان کے سامنے تھی اور وہ قید و بند کی زندگی میں مبتلا نہیں تھے۔ اس کے لیے ان کے یہاں بے تکلفی زیادہ اور مولانا آزاد کے یہاں کچھ کم۔ یہی وجہ ہے کہ ''غبار خاطر'' کے اسلوب میں ایک علمی فضا ہے اور یہی اس کی انفرادیت بھی ہے۔

ترکیب، تشبیہ، صوتی آہنگ اور فکری ارتباط سے ایک شعری ڈھانچہ تیار ہوتا ہے۔ ابوالکلام کی نثر میں یہ تمام خصوصیات بدرجہ اتم موجود ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی نثر کو لوگوں نے شاعری اور الہامی زبان سے ملانے کی کوشش کی ہے۔ مولانا آزاد کے اس اسلوب کے پرشکوہ انداز کی وجہ دراصل یہ تھی کہ وہ ایک متضاد شخصیت تھے۔ کیوں کہ انھوں نے میدانِ سیاست، اسلامی تناظر، ادبی سروکار اور فکری معاملات کو یکساں طور پر وقت دیا۔ ظاہر ہے جس انسان کے اندر متضاد صلاحیتوں اور خصوصیتوں کا انضمام ہو وہ نہ صرف اپنی فکر سے ہمیں متاثر کرے گا بلکہ ان کے اظہار کے رویے بھی ہمیں سوچنے پر مجبور کریں گے۔ اس کے علاوہ مولانا ابوالکلام کی مشق و مزاولت بھی اپنی جگہ ہے۔ کیوں کہ انھوں نے قید و بند کی زندگی کے باوجود بہت کچھ لکھا۔ ظاہر ہے لکھتے لکھتے ایک صاحب قلم کا اپنا اسلوب متعین ہوتا چلا جاتا ہے۔ مولانا ابوالکلام آزاد کے متعلق مرزا خلیل احمد بیگ نے لکھا ہے:

> ''خطبات کے اسلوب کی سادگی کی ایک وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ یہ اسلوب آزاد کی شعوری کوشش کا نتیجہ نہیں، بلکہ زبان کے فوری اور برجستہ استعمال کے نتیجے میں معرضِ وجود میں آیا ہے''

یہ سچی بات ہے کہ مولانا آزاد کے اسلوب میں برجستہ پن ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ ان کی تفہیم ہر ایک کے لیے آسان نہیں۔ کیوں کہ ان کی علمیت نے ان کے اسلوب کو گہرا اور تہہ دار بنایا ہے۔ گویا ان کو سمجھنے کے لیے مختلف میدانوں کے استعارے اور کنایوں کو سمجھنا ہوگا۔ اس لیے یہ کہنا ہے کہ ان کے اسلوب میں ثقالت ہے، کوئی مناسب و معقول بات نہیں ہوگی۔ کیوں کہ ان کو سمجھنے کے لیے ہمیں ان تمام پہلوؤں کو نظر میں رکھنے کی ضرورت ہے جن پہلوؤں کو بروئے کار لاتے ہوئے مولانا آزاد اپنی نثر کو تشکیل دیتے ہیں۔ گویا جو چیزیں اور معاملات ہمارے لیے علمیت کے زمرے میں آتی ہیں وہ چیزیں مولانا آزاد کی زندگی کے عام معاملات سے متعلق ہیں۔ اس لیے ان کی تفہیم

Kashmir Treasures Collection, Srinagar

CC-0. In Public Domain. Digitized by eGangotri.

وترسیل ہماری ذہنی سطح سے نہیں ہوسکتی ہے بلکہ ان کی ذہنی سطح کو سمجھنے کی ضرورت ہے۔

جیسا کہ ابتدائی سطور میں یہ مفروضہ قائم کیا گیا تھا کہ معروضیت کے باوجود اسلوب کے مطالعے میں یک گونہ لچک کی کیفیت پائی جاتی ہے۔ پروفیسر خلیل احمد بیگ نے مولانا ابوالکلام آزاد کی زندگی کو سامنے رکھتے ہوئے جس طرح ان کے اسلوب کا مطالعہ کیا ہے اس سے بھی اندازہ کرنا کوئی مشکل نہیں کہ اسلوب کی تشکیل میں خاندانی پس منظر اور انسان کی داخلیت کا معاملہ پوشیدہ ہوتا ہے۔ اسلوب یا لفظی انتخاب کے معاملے میں اگر مولانا آزاد شعوری کوشش نہیں کرتے تھے تو گویا لاشعوری معاملات کا ان کے یہاں عمل دخل ہوتا تھا۔ وہ بغیر تامل کے ایسے الفاظ اور استعارے استعمال میں لاتے تھے جو بہت قلم کار سوچنے کے باوجود استعمال میں نہیں لا سکتے تھے۔ اس لیے یہ کہنا پڑے گا کہ اسلوب کی تشکیل دراصل لاشعور سے بھی جڑی ہوتی ہے۔ مولانا کے لاشعوری نظام میں ایسے بھاری بھرکم الفاظ پیوست تھے جنھیں وہ بلا تکلف وکوشش استعمال میں لے آتے تھے۔

حواشی

۱۔ ''ادبی تنقید اور اسلوبیات'' ؛ گوپی چند نارنگ
ص : ۱۷ ؛ سنگ میل پبلی کیشنز، دہلی (۱۹۹۱ء)

۲۔ ''ابوالکلام آزاد (مونوگراف)''
عبدالقوی دسنوی ؛ ص : ۱۷۷ تا ۱۷۸
ساہتیہ اکادمی، دہلی (۱۹۸۷ء)

۳۔ ''ابوالکلام آزاد، ایک ہمہ گیر شخصیت''
مرتب: رشید الدین خان ؛
بحوالہ تاریخ ادب اُردو، وہاب اشرفی

۴۔ ''مولانا آزاد کی ادبی شخصیت، غبار خاطر کے آئینے میں'' ؛ ص : ۱۶۹
ایوان اُردو، مولانا ابوالکلام آزاد نمبر۔

۵۔ ''غبار خاطر'' ؛ مولانا ابوالکلام آزاد
ص : ۶۹ ؛ ساہتیہ اکادمی، دہلی (۱۹۶۷ء)

۶۔ ''غبار خاطر کا تنقیدی مطالعہ''
ملک زادہ منظور احمد ؛ ص : ۵۵
لارٹوش روڈ، لکھنؤ۔

۷۔ ''اسلوبیاتی تنقید ۔ نظری بنیادیں اور تجزیے''
مرزا خلیل احمد بیگ ؛ ص : ۲۲۶
این سی پی یو ایل، دہلی (۲۰۱۴ء)

☆ ☆

فرد قائم ربط ملت سے ہے تنہا کچھ نہیں
موج ہے دریا میں اور بیرون دریا کچھ نہیں
(بانگ درا سے)

Kashmir Treasures Collection, Srinagar

CC-0. In Public Domain. Digitized by eGangotri.

ڈاکٹر احسان عالم
9431414840

مظہر امام
شخصیت اور شاعری

دربھنگہ صدیوں سے علم وادب کا گہوارہ رہا ہے۔ یہاں کے اسلاف نے ایسے نقوش چھوڑے ہیں کہ اُن سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہا جاسکتا۔ دربھنگہ ضلع کی سب سے اہم خصوصیت یہاں کے علمی ادارے اور دربھنگہ میڈیکل اسپتال ہے۔ بیتا، الل پٹی اور لہریا سرائے میں ڈاکٹروں، مریضوں اور دواخانوں کی بھیڑ بھاڑ نظر آتی ہے۔ میڈیکل کالج ہونے کے سبب شمالی بہار میں سب سے زیادہ ڈاکٹر دربھنگہ شہر میں موجود ہیں۔

دربھنگہ کو ولیوں کا گہوارہ بھی کہا جاتا ہے۔ یہاں بے شمار خانقاہیں اور غیر مسلموں کے مٹھ ہیں۔ یہاں کا کلچر گنگا جمنی ہے۔ عام طور پر لوگ نرم اور میٹھی زبان بولتے ہیں۔ یہاں کے باشندے چورا، دہی اور اچار زیادہ پسند کرتے ہیں۔ اس علاقے کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ یہاں ہر مذہب اور ذات برادری کے لوگ آپس میں بڑے میل محبت سے رہتے ہیں۔ ایک دوسرے کے تہواروں، شادی بیاہ اور دُکھ درد میں شریک ہوتے ہیں اور ایک ایسی فضا قائم کرتے ہیں جس کی بنیاد انسانیت اور بھائی چارگی پر ہے۔

دربھنگہ میں ادب ودانشوری کی تاریخ بہت قدیم ہے۔ یہ صدیوں سے مفکروں، دانشوروں، ادیبوں، صوفیوں، سنتوں اور شاعروں کی سرزمین رہی ہے۔ عہد قدیم کے بعد عہد وسطیٰ میں بھی مسلمانوں کی علمی وادبی، ثقافتی اور تہذیبی کاوشوں نے دربھنگہ کی تاریخ کو روشن کیا ہے۔ ایسے ہی دانشوروں میں مظہر امام کا نام بہت نمایاں ہے۔

مظہر امام ۱۲ر مارچ ۱۹۲۸ء کو ریاست بہار کے مونگیر شہر میں پیدا ہوئے۔ ایام طفولیت میں شفقت پدری سے محروم ہوگئے۔ مظہر امام کی ابتدائی تعلیم مدرسہ حمیدیہ، قلعہ گھاٹ دربھنگہ میں ہوئی۔ موضع چھتون کے مولوی محمد یوسف باقاعدہ گھر پر رہا کرتے تھے اور گھر کے تمام بچوں کو پڑھاتے تھے۔ قرآن شریف، اُردو کی چوتھی اور فارسی میں گلستاں بوستاں تک تعلیم ختم کرنے کے بعد مظہر امام کو انگریزی کی تعلیم دی جانے لگی۔ اس کے لئے باضابطہ ایک اُستاد رکھا گیا لیکن وہ زیادہ اہل ثابت نہ ہوئے، لہٰذا مظہر امام کا داخلہ مارواڑی ہائی اسکول دربھنگہ کے آٹھویں درجہ میں کرادیا گیا۔ یہاں دو سال پڑھ کر دسویں اور گیارہویں درجے کی تعلیم نارتھ بروک ضلع ہائی اسکول دربھنگہ میں حاصل کی۔ یہیں سے ۱۹۴۲ء میں میٹرک سیکنڈ ڈویژن میں پاس کیا اور مقامی سی ایم کالج سے ۱۹۵۱ء میں امتیازی حیثیت سے بی اے کیا۔ ۱۹۶۹ء میں پرائیویٹ امیدوار کی حیثیت سے بہار یونیورسٹی سے فارسی میں ایم اے کیا اور یونیورسٹی میں اوّل آگئے۔ ۱۹۷۱ء میں مگدھ یونیورسٹی سے ایم اے کیا اور وہاں بھی یونیورسٹی میں اوّل آئے۔ اس طرح دونوں جگہوں سے طلائی تمغے حاصل کئے۔ انہوں نے حکومت ہند کی وزارت داخلہ کا ہندی امتحان ''پراگیا'' بھی امتیاز کے ساتھ پاس کیا۔ انہوں نے فلم اینڈ ٹیلی وژن انسٹی ٹیوٹ پونے سے ٹی وی پروگراموں کی پیشکش اور تکنیکی امور پر ڈپلوما حاصل کیا۔ پروفیسر ظفر احمد نظامی نے ان کی شخصیت پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھا ہے :

Kashmir Treasures Collection, Srinagar

CC-0. In Public Domain. Digitized by eGangotri.

کتابی چہرہ ، بدن اکہرا
لمبی ناک ، انداز پرتپاک
ہردم نغمہ سنج ، مرنجا مرنج
بڑے بڑے کان ، خوش بختی کی پہچان
وسیع پیشانی ، ذہانت کی نشانی
سر پر خفیف بال ، ذہن غرقِ فکر و خیال
یہ ہیں شاعر باکمال ، ادیب بے مثال
شریعت سخن مجتہد ، آزاد غزل کے موجد
انفرادیت کے حامل ، اپنے اصولوں پر عامل
مقبول خواص و عام ، یعنی مظہر امام

پروفیسر احمد نظامی ؛ ششماہی ''رابطہ''
مظہر امام ۔ فن اور شخصیت نمبر
جنوری تا جون ۱۹۹۹ء ؛ ص : ۵

مظہر امام اپنے عہد کے ایسے تخلیق کار تھے جن پر ہر مکتبہ فکر کے نقاد نے تفصیلی روشنی ڈالی ہے۔ احتشام حسین، آل احمد سرور، غلام ربانی تاباں، فراق گورکھپوری، محمد حسن، وہاب اشرفی، مسعود حسین خاں، شمس الرحمٰن فاروقی، اعجاز حسین، شاہ تمنکت، حامدی کاشمیری، کرامت علی کرامت اور ان کے علاوہ بہت سی نامور شخصیتوں نے ان کے فن اور شخصیت پر لکھا ہے۔ چند شخصیتوں کے خیالات سے مختصر اقتباسات ملاحظہ کریں :

''مظہر امام ترقی پسندی سے چلے تھے۔ وہ جدیدیت کی طرف مائل ہوئے مگر ان کا شمار جدیدوں میں بھی نہیں کیا جاسکتا، ہاں ان دونوں میلانات سے انہوں نے اپنے ذہنی سفر میں اثر قبول کیا۔ ان کے پاس حساس ذہن ہے اور یہ زندگی کے اُس آشوب سے جو آج کے دور سے عبارت ہے، آشنا ہیں''

(آل احمد سرور)

''میں مظہر امام کی نظمیں اور غزلیں بڑے شوق سے پڑھتا ہوں۔ اظہار بیان کی تازگی کی وجہ سے وہ فوراً اپنی جانب متوجہ کرلیتی ہیں۔ مظہر امام نے اشاریت اور سپاٹ اظہار کے درمیان ایک راستہ نکالا ہے جو نہ تو ابہام کی طرف جاتا ہے نہ فرسودگی کی طرف بلکہ تازگی اور تنوع کا احساس دلاتا ہے''

(احتشام حسین)

''جدید فن شعر کا جو اظہار مظہر امام کے کلام میں ہے اُسے جدید شعری فکر کا اظہار کہہ سکتے ہیں۔ انہیں اپنے لہجے کی انفرادیت ثابت کرنے کے لئے کسی خارجی سہارے کی ضرورت نہیں ہے بلکہ حیات و کائنات سے ان کا رشتہ ایسا ہے کہ اس کا تصور کسی روایتی فکر سے وابستہ نہیں کیا جاسکتا''

(شمس الرحمٰن فاروقی)

''آج کی شاعری میں کئی طرح کی آوازیں ملتی ہیں جنہیں ہم مابعد جدیدیت کے زمرے میں رکھ سکتے ہیں، مثلاً متعینہ قدروں اور متعینہ اصولوں سے انکار کی کتنی ہی صورت اردو شاعری میں بھری پڑی ہے۔ مظہر امام کا یہ شعر ہماری معاونت کرتا ہے ۔''

نئے مکان میں قید کی کوئی جا ہی نہیں
خدا تو ہے یہ کہیں بندۂ خدا ہی نہیں

(وہاب اشرفی)

Kashmir Treasures Collection, Srinagar

CC-0. In Public Domain. Digitized by eGangotri.

''مظہر امام کی شاعری لطافت احساس اور طہارت فکر کی خوبصورت مثال ہے۔ ان کے یہاں ایک چٹیلا پن اور نشاط آمیز دل گرفتگی ہے جو ان کے کلام کو انفرادیت بھی عطا کرتی ہے اور دل نوازی بھی'' (فراق گورکھپوری)

اسکول چھوڑنے سے قبل ہی اُردو ادب اور شاعری کا ذوق پیدا ہوا۔ یہ ذوق وشوق ایسا پروان چڑھتا گیا کہ مظہر امام نے اپنا لڑکپن، جوانی اور ادھیڑ عمری یہاں تک کہ بڑھاپا بھی شعر وادب کے نام کر دیا۔ انہوں نے اپنے کیریر کا آغاز صحافت سے کیا۔ ۱۹۵۱ء میں وہ کلکتہ چلے گئے جہاں انہوں نے روزنامہ ''کارواں'' میں سب ایڈیٹر کے طور پر کام کیا۔ اُس وقت ان کی عمر غالباً اکیس سال کی رہی ہوگی مگر زیادہ دنوں تک صحافت سے وابستہ نہیں رہے۔ اسی دوران انہوں نے ٹیوشن پڑھانا شروع کیا۔

مظہر امام کی شخصیت کئی رنگوں کے امتزاج سے بنی لیکن یہ لمحہ لمحہ بدلتے رنگوں میں ظاہر ہوتی رہی اور ہر بار ان کی قوت کا احساس دلاتی رہی۔ کبھی وہ صبر وتحمل کے پیکر نظر آئے اور کبھی متلون مزاج اور سیماب فطرت۔ کبھی وہ بچوں کی معصومیت اور حیرت کے مظہر ہیں اور کبھی ایک جہاں شناس شخص کی طرح طنز کے تیر برساتے نظر آتے ہیں۔ وہ قاری کو لمحہ بہ لمحہ تغیر پذیر دنیا کا سفر کراتے ہیں اور کہتے ہیں ؎

چھپی تھی موج کی بانہوں میں روح تشنہ لبی
چمکتی ریت میں ڈوبا ہوا سفینہ تھا

ان کے شعری مجموعہ ''زخم تمنا'' میں شامل بیشتر غزلوں میں ان کا لب ولہجہ ان کے دوسرے مجموعہ ''رشتہ گونگے سفر کا'' اور تیسرے مجموعہ ''پچھلے موسم کا پھول'' سے مختلف ہے لیکن خاص تغزل کے اشعار غزلیہ لوازم کے ساتھ اس میں بھی موجود ہیں ؎

کاکل وقت میں سلجھاؤ نظر آتا ہے
آپ نے زلف پریشاں کو سنوارا تو نہیں؟
خواب دیکھے تو بہت میں نے شبستانوں میں
تو مرے خوابوں کی تعبیر ہے، معلوم نہ تھا
ان کو دے آئے ہیں خود اپنی محبت کے خطوط
غم گساروں کی ذرا نامہ بری تو دیکھو

کیا ہوا مجھ پہ اگر عقل کا الزام آیا
آپ کا راز کسی طرح چھپایا تو سہی
عشق کو بے نیاز پایا ہے
حسن کی بے بسی بھی دیکھی ہے
آج کی رات خیال لب لعلیں ہی سہی
کس کو معلوم کہ کل رنگ سحر کیا ہوگا
محو ہوتی ہی نہیں یاد تری
کوئی بچپن کا سبق ہو جیسے
تارے تو چمک اپنی دکھاتے ہیں سحر تک
دل ڈوبنے لگتا ہے مگر پچھلے پہر سے
دشمنی احتیاط سے کیجئے
دوستی کی ادا نہ آجائے

صنعتی شہروں میں بڑھتی ہوئی بے چہرگی اور فریب شکستگی کی آگہی نے مظہر امام کو عشق اور انسانی رشتوں کے اُن رومانی تصورات کی بے ضابطگی سے آگاہ کیا جو شباب کی معصومیت کے عہد میں ان کا اوڑھنا

Kashmir Treasures Collection, Srinagar

CC-0. In Public Domain. Digitized by eGangotri.

بچھونا تھا اور جن کی بنا پر وہ عہد حاضر میں سانس لینے کے باوجود ہمارے لئے اجنبی تھے۔ ''رشتہ گونگے سفر کا'' ان کے ذہنی سفر کے ایک نئے موڑ کا پتہ دیتا ہے۔ اس میں شامل نظمیں استعاراتی پیرائے اور غزلوں کے اشعار علامتی انداز میں اُس دُکھ اور کرب کا احساس دلاتے ہیں جو رومانیت سے عصری حسیت تک کے تکلیف دہ سفر کو طے کرنے میں انہیں جھیلنا پڑا ہے۔ پیش ہے ایک نظم ''دھوپ'' کے چند اشعار ؎

تم کہاں جاؤ گے؟
آج کے دن کہاں جاؤ گے؟
صبح سے ہی ہوا گرم ہے
آفتاب اپنے خیمے سے پگھلا ہوا شیشہ برسا رہا ہے

(دھوپ میں ایک مشورہ)

مظہر امام کی ایک پُر اثر نظم ''انتظار'' کے عنوان سے ہے۔ اس نظم میں انہوں نے ایک مشرقی تہذیب کی پروردہ لڑکی کے عشق میں مبتلا ہونے پر دل میں اُٹھنے والے جذبات کا نقشہ بڑے خوبصورت انداز میں کھینچا ہے۔ نظم کا صرف ایک بند ملاحظہ کریں ؎

تو مرے انتظار میں ہوگی
میری یادوں کے نرم و نازک لب
تیرے خوابوں کو چومتے ہوں گے
میری باتوں کے میگھ دوت اکثر
دل کی وادی میں گھومتے ہوں گے
تو خیالوں میں ڈھونڈتی ہوگی
میرے ہونٹوں کی گم شدہ لذت
تکیے آنسو سے بھیگتے ہوں گے
بھیجتی ہوگی دل پہ تو لعنت

مظہر امام نئی نسل کے اُن شاعروں میں ہیں جن کی آواز اور لہجہ جانا پہچانا ہے۔ ان کا مجموعہ ''زخم تمنا'' ان کی اُنیس برس کی کاوشوں کا انتخاب ہے۔ مظہر امام کا پہلا شعری مجموعہ ''زخم تمنا'' کے نام سے شائع ہوا تھا جس میں ۵۲ غزلیں شامل ہیں۔ اس کتاب کی ابتداء اس شعر سے ہوئی ہے ؎

ڈھونڈا ہے اگر زخم تمنا نے مداوا
اک نرگس بیمار کی بات آ ہی گئی ہے

پیش نظر شعر مظہر امام کی ذہنی کیفیت کا عکاس ہے۔ بہت سارے حادثات زندگی میں آتے رہتے ہیں اور انسان کی ہر خواہش کا مکمل ہونا ممکن نہیں مگر کچھ ایسی خواہشیں ہیں جو کبھی کبھی زخم کی صورت اختیار کر لیتی ہیں اور ان کا مداوا یا علاج بہت مشکل ہو جاتا ہے۔ ان ہی اُلجھنوں سے دوچار مظہر امام کی شاعری نظر آتی ہے جس میں غم دوراں بھی ہے اور غم جاناں بھی۔ ان کے یہاں ترقی پسند عہد کی وہ خصوصیات موجود ہیں جن کی بنا پر انہیں زندگی کی مثبت قدروں کا شعور عطا ہوا ہے لیکن اس شعور کے اظہار میں وہ کبھی بلند آہنگی کا شکار نہیں ہوتے۔ مظہر امام کی شگفتہ بیانی، اسلوب کی تازگی، لب ولہجہ کی نرمی، برتے ہوئے الفاظ کی خوش سلیقگی اور فکر محسوس کی رعنائی ان کی شاعری کو فن کے اعلیٰ منصب سے نیچے نہیں گرنے دیتی۔

۱۹۴۳ء تک ان کی شاعری تجرباتی دور سے گزرتی رہی۔ اس دوران انہوں نے ہیئت اور اسلوب میں کوئی خاص تجربہ نہیں کیا لیکن اپنی بات کہنے کے ہنر کو قارئین کے سامنے دلچسپ انداز میں پیش کیا۔ شاعری شخصیت کا آئینہ ہوتی ہے اور مظہر امام کا یہ مجموعہ اس لحاظ سے ان کی شخصیت کو سمجھنے میں معاون ہے۔ انہوں نے پوری ایمان داری کے ساتھ اپنی شخصیت کے ہر پہلو، مزاج کے ہر رنگ اور فکر و احساس کے

Kashmir Treasures Collection, Srinagar

CC-0. In Public Domain. Digitized by eGangotri.

اُتار چڑھاؤ کی ترجمانی کی ہے۔ یہ شاعری موجودہ دور کے متوسط طبقے سے تعلق رکھنے والے ایک ایسے نوجوان کی کہانی ہے جس نے نامساعد حالات، خراب صحت، مایوسی اور محرومی کا مقابلہ جسمانی اور ذہنی طور پر کیا۔ اس جدوجہد میں ان کی آواز میں یاسیت کا گہرا عکس نظر آتا ہے۔ مظہر امام کی غزلیں متاثر کرتی ہیں۔ ساتھ ہی ان کی نظمیں ''سیاست دوراں'' کو سمجھنے کی کوششوں سے بھی عبارت ہیں جو غم ذات اور غم جاناں کی آئینہ دار ہیں۔ نظمیں ہوں یا غزلیں دونوں ایک ہی دل ودماغ کی پیداوار ہیں، اس لئے یہ کہنا مناسب نہیں معلوم پڑتا کہ ان کو کس صنف سے طبعی مناسبت ہے۔ شاعری اصناف میں بٹی ہوئی نہیں ہے بلکہ شاعروں کے جذبات اور خیالات اپنی مناسبت سے اصناف کا انتخاب کر لیتے ہیں۔ اسی لئے مظہر امام غزلوں اور نظموں میں اپنے انکشاف ذات میں یکساں کامیاب نظر آتے ہیں۔

مظہر امام کے اندر تجربہ کرنے کا جذبہ موجود تھا۔ اس تجربہ کی دلچسپی کے تحت انہوں نے اوائل عمری (۱۹۴۵ء) میں آزاد غزل کا تجربہ بھی کیا جس کے لئے اُنہیں ہدف ملامت بنایا گیا، حالانکہ آزاد غزلیں آج تک مقبولیت حاصل نہیں کر سکی ہیں لیکن وہ آخری دم تک اس کو استحکام بخشنے کی کوشش میں لگے رہے۔ ۱۹۸۸ء میں انہوں نے ''آزاد غزل کا منظر نامہ'' تحقیقی مقالہ لکھ کر یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ آزاد غزل بطور صنف قبولیت کا درجہ حاصل کرنے لگی ہے۔ مظہر امام کی پہلی آزاد غزل ملاحظہ فرمائیں اور غور کریں کہ یہ کس قدر معنویت سے بھرپور ہے

ڈوبنے والے کو تنکے کا سہارا آپ ہیں
عشق طوفاں ہے سفینہ آپ ہیں
آرزوؤں کی اندھیری رات میں
میرے خوابوں کے اُفق پر جگمگایا جو ستارا آپ ہیں
کیوں نگاہوں نے کیا ہے آپ ہی کا انتخاب
کیا زمانے بھر میں یکتا آپ ہیں

ان کی ایک اور آزاد غزل کے چند اشعار ملاحظہ ہو ؎

مکیں ہیں نئے ان کی قدریں نئی ہیں
ستم آزمودہ گلی میں ابھی تک ہمارا پرانا مکاں ہے
نشے میں خوش گماں صبح تھے اتنے
کسی نے زخم شب پر آج تک پھاہا نہیں رکھا

سرینگر میں مظہر امام کا قیام تقریباً ۱۴ سال رہا۔ یہاں انہوں نے جو غزلیں کہیں وہ ''کشمیری غزل'' کے نام سے مشہور ہوئیں۔ ان ہی کے حوالے سے آل احمد سرور، مسعود حسین خان، شمس الرحمٰن فاروقی، اسلوب احمد انصاری، ڈاکٹر عالم خوندمیری اور حامدی کاشمیری جیسے علم ذوق صاحبان نے اپنے تنقیدی محاکموں کے ذریعہ عصری غزل میں ان کی حیثیت کو مستحکم کر دیا۔ ان کے غزلوں کے مجموعے ''پچھلے موسم کا پھول'' پر انہیں ۱۹۹۴ء میں ساہتیہ اکادمی ایوارڈ ملا۔ مظہر امام صاحب کی ادبی خدمات کے بارے میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ ان کی شاعری ان کی جدت فکر، انفرادیت اور سادگی و پرکاری کی مظہر ہیں۔ ان کے دو اشعار پر اپنی تحریر ختم کرتا ہوں ؎

وقت کا شور سدا روح کے ہمراہ رہا
ہم اکیلے بھی رہے پر کبھی تنہا نہ ہوئے

خود غرض ہیں انجمن آرائیاں ، تنہائیاں
آدمی کا آدمی سے اب کوئی رشتہ نہیں

☆ ☆

Kashmir Treasures Collection, Srinagar

CC-0. In Public Domain. Digitized by eGangotri.

کرشن بھاوک
8847482834

قاضی نذرالاسلام

بغاوت کا بگل اور موسیقی کا بلبل

قاضی نذرالاسلام کو تمام ناقدین نے نوبیل انعام یافتہ شہرۂ آفاق بنگلہ ادیب وشاعر گرورابندرناتھ ٹیگور کے دور میں اُن کے بعد دوسرے عظیم شاعر وموسیقار کا درجہ عطا کیا ہے۔ چند دیگر ناقد نذرالاسلام کو شاعر سے بھی بڑے ایک موسیقار گردانتے ہیں۔ فی الاصل یہ شاعرِ اعظم موسیقی پر اوائل سے ہی جان ودل سے فدا رہے تھے۔ لہٰذا ناقدین کی رائے سے بلاشک اتفاق کیا جاسکتا ہے۔ ایک تو نذرالاسلام نے اُردو شعراء کی روایت کے بموجب علمِ شاعری سیکھنے کے لئے کسی بھی دنیاوی شخص کو تاعمر اپنا اُستاد نہیں بنایا تھا، دوئم حد درجے کے خود دار ہونے کے موجب وہ کسی بھی ہم عصر شاعر یا موسیقار سے اکبرالہ آبادی کا یہ ایک شعر بڑے طنز کے ساتھ کہہ سکتے تھے ؎

تم سے استادوں میں میری شاعری بے کار ہے
ساتھ سارنگی کا بلبل کے لئے دشوار ہے

ویسے بھی نذرالاسلام کی حیات میں اُن کے بڑے فرزند ''بلبل'' کا بھی ایک اہم رول رہا ہے کیونکہ اُسی کی وفات کے بعد ہی یہ شاعر ادبیت وسیاست دونوں ہی محاذوں پر بے طرح ٹوٹ گئے تھے۔

سوانح حیات

اب ہم نذرل کی سوانح عمر کا مختصر تعارف پیش کرنے کے بعد ہی اُن کی شاعری میں بغاوت کے عناصر اور اُس کے بعد ایک نایاب اور لاجواب موسیقار کی حیثیت سے چند عنوانات کے تحت اُن کی لاجواب شخصیت کی بابت اظہار خیال کرنے کی سعی کریں گے۔

پیدائش

مغل بادشاہ شاہ عالم کا زمانہ تھا۔ ایک مسلم خاندان حاجی پور ترک کرکے دردہمان کے چڑلیا نام والے دیہات میں آکر سکونت پذیر ہوگیا تھا۔ ان کے اجداد میں کبھی کسی کو ''قاضی'' خطاب سے نوازا گیا تھا جس کا لفظی معنی ہے ''مفکر''۔ ان کے اہل خاندان میں دورِ قدیم سے ہی اپنے نام سے قبل ''قاضی'' لفظ جوڑنے کی روایت چلی آرہی تھی۔ ان کے والد کا نام قاضی فقیر احمد تھا۔ نذرالاسلام کی ولادت ۲۴ رمئی ۱۸۹۹ء کو منگل وار کے دن ہوئی تھی۔ جلج بھاوڑی نے اپنی ترجمہ شدہ کتاب میں ولادت کی یہی تاریخ درج کی ہے۔ بنگابد کے ۱۱ جیٹھ سنہ ۱۹۰۶ بنتا ہے کیونکہ بنگابد اور عیسوی سنہ میں فقط ۷ سال کا ہی فرق ہوتا ہے۔

دوسری جانب گوپال حالدار نے نذرالاسلام کی پیدائش کا یوم ۲۵ رمئی دیا ہے اور سال وہی ہے یعنی سن ۱۸۹۹ء۔ جب نذرالاسلام کی عمر فقط ۸ سال کی تھی تو ان کے والد ماجد اس جہان فانی سے رحلت کر گئے۔ گھر میں مفلسی اس قدر طاری تھی کہ لوگ ان کو طنزیہ انداز میں ''دکھو میاں'' کہہ کر بلایا کرتے تھے۔ چونکہ ان کی والدہ نے ایک تانترک سادھو تارا کھیاپا (کھیپا) جس کے لفظی معنی ہیں ''دیوی کالی ماتا کا بھگت'' سے

Kashmir Treasures Collection, Srinagar

CC-0. In Public Domain. Digitized by eGangotri.

اپنے لئے ایک بیٹے کی پیدائش کے لئے فریاد کی تھی اور خواہش کی تکمیل ہونے کے بعد اپنے اوّل فرزند کا نام بھی ان ہی کے نام پر رکھا تھا جو کہ بہت دنوں کے بعد درگزر بھی کر دیا گیا تھا، لیکن مابعد الطبیعات وروحانیت کی جانب نذرالاسلام کی رغبت تاحیات ہی بنی رہی تھی۔ انہوں نے ''چڑلیا'' میں موجود ایک ہی مکتب سے مولوی فضل احمد سے عربی فارسی کی ابتدائی تعلیم حاصل کی اور وہیں بطور معلم بھی چند دنوں تک کام کیا تھا۔ ایک دینی ومذہبی مسلمان ہونے کے باوصف نذرالاسلام نے کم عمر میں ہی قرآن کے علاوہ بنگلہ زبان میں ترجمہ شدہ رامائن، مہابھارت اور ہندوؤں کے پُرانوں جیسے دیگر صحیفہ کتب کا مطالعہ کر کے اپنی مذہبی فراخ دلی اور قومی یکجہتی والے فی الواقع جذبات کے متعدد ثبوت فراہم کرنے شروع کر دئے تھے۔ وہ اکثر قریبی دیہاتوں کے سادھوؤں، حاجی پہلوان جیسے فقیروں، صوفی فلسفے سے متاثر باؤل گلوکاروں، آزاد فطرت پسند صوفیوں اور درویشوں کی صحبت میں خاصے محظوظ ہوا کرتے تھے۔ گاؤں میں باقاعدہ تعلیم کا اہتمام نہ ہونے کی وجہ سے وہ ''لیٹو دل'' جیسے گروپوں یا ٹولیوں کی جانب راغب ہو گئے تھے، جو کہ مختلف سماجی وسیاسی مسئلوں پر طنز کرنے والی نوٹنکیاں پیش کیا کرتی تھیں اور عوام الناس میں بے حد مقبولیت حاصل کر رہی تھیں۔ معاشرے کے خلاف بغاوت کے عناصر وہیں سے انکی شخصیت میں پیوست ہونے لگے تھے۔ اس سے وہ مقامی گیتوں، ادب وادیبوں سے بھی بے حد مرعوب ہونے لگ گئے تھے۔ انکے ایک چچا ''لیٹو بینڈ'' کے ممبر تھے اور وہ اپنے ہمراہ انہیں بھی اسی میں لے گئے تھے اور ایک دن وہ اسکے ایک اہم سربراہ یا پیشوا بن گئے تھے۔

وہاں سے وہ بڑے ریلوے جنکشن اور کوئلہ کان کے مرکز مانے جانے والے شہر آسنسول چلے گئے۔ ابتداء میں تو انہوں نے ریلوے گارڈ کوارٹروں میں گھریلو کام انجام دیا بعد ازاں وہ ایک کارآموز "Apprentice" کا کام ترک کر کے ڈبل روٹیوں کے کارخانے میں فقط ایک روپیہ مہینے کی تنخواہ پر روٹیاں سیکنے والے کارکن بن گئے۔ یہ اور بات ہے کہ اپنے کام سے وہ جب بھی فارغ ہوتے تھے، تب موسیقی کی محفلوں میں جا کر بانسری بجا کر اپنے فنِ موسیقی کا حتی لا مکان مظاہرہ کرتے ہوئے اپنی ذہنی تسکین بھی بدستور حاصل کرتے رہتے تھے۔ وہیں پولس کے شری اشوک کمار 'یمن' نے اپنی موسیقی پر مبنی ضخیم کتاب ''سنگیت رتناولی'' میں جن خیالات کا اظہار کیا ہے، انکا ترجمہ اس طرح ہے :

> ''اس کے بعد تو یکے بعد دیگرے متعدد رسائل میں ان کی بے شمار نظمیں شائع ہوئیں۔ یہ ہندوستان میں انگریزی زبان کے سخت مخالف تھے اور اسی وجہ سے ملک کی آزادی کے لئے ہر مہم میں یا محاذ پر ہمیشہ پیش پیش رہا کرتے تھے۔ برطانیہ سرکار نے انہیں سب رجسٹرار کے عہدے پر فائز کرنا چاہا لیکن انہوں نے انکار کر دیا، البتہ یہ ''دھوم کیتو'' نامی رسالے کے ساتھ وابستہ ہو گئے۔ نتیجتاً سرکار نے انہیں سنہ ۱۹۲۳ء میں گرفتار کر لیا تھا۔ ایک سال کی قید کاٹنے کے بعد یہ کرشن نگر نامی شہر میں جا بسے تھے''

اس متذکرہ بالا گیت کا اشارہ واضح طور پر نرگس کی جانب ہی تھا۔ اس کے بعد نذرل کوملہ میں ۱۹۲۱ء میں سین گپت خاندان کے زیر سایہ، ۱۸ر جون سے ۶ر جولائی تک یعنی تقریباً تین ہفتے تک رہے تھے۔ اس طرح وہ سین گپت کے خاندان کے ساتھ اپنے نزدیکی مراسم کی نشان دہی ''ریشمی ڈور'' نظم میں اس طرح سے کرتے ہیں :

تورا کو تھا ہوتے کیمنے ایشے منی مالا رمتو، آمار کنٹھے جڑالی ۔ ؟

Kashmir Treasures Collection, Srinagar

CC-0. In Public Domain. Digitized by eGangotri.

''یعنی تم لوگ کہاں سے آئے ہو اور تم لوگ کیسے میرے گلے سے منی مالا کی مانند لپٹ گئے ہو ۔ ۔ ۔ ؟''

اسی طرح ''سنیہ آتر'' عنوان والا گیت بھی اسی گھر کے افراد کے تئیں ایک خراج عقیدت کہا جاسکتا ہے۔ اس طرح اگرچہ انہوں نے اپنے ذہنی خلا کو بھرنے کا کام کیا تھا تاہم مایوسی ویاس کا عالم ہی اُن کی لاتعداد نظموں اور گیتوں کا موضوع رہا تھا۔ بطور استثنا ''پلک'' موسومہ نظم ضرور دیکھی جاسکتی ہے جس میں قنوطیت کی بجائے رجائیت پسندی کا لہجہ نمایاں ہے۔

شاعری میں بغاوت

ایک افریقی شاعر نے کبھی لکھا تھا کہ شاعری تو غصے کی ہی پیداوار ہوا کرتی ہے "Poetry blossoms out of anger" یہ بات اگرچہ ایک حد تک تو متنازع بھی ہوسکتی ہے تاہم یہ بات نذرالاسلام کی شاعری پر تقریباً صادق آتی ہے۔ ان کا گیت ''بھنگار گان'' اسی ضمن میں ملحوظِ خاطر اور قابلِ استدراک ہے۔ اس میں ان کا یہی لڑاکو اور جنگجوانہ تیور آشکارا ہوا ہے۔ وہ کہتے ہیں :

''کارارا وہی لوہ کپاٹ، بھینگے پھیل کار۔ رے لو پاٹ، رکت جامات، سکال پوجار پاشان ویدی۔ یعنی اس قید خانے کے آہنی دروازوں کو توڑ ڈالو۔ خون آلود سنگ کی ویدی کو پاش پاش کردو جو کہ فقط زنجیروں کے دیوتا کی عبادت کے مقصد سے ہی کھڑی کی گئی ہے''

قومی تحریک میں ان کی نظم ''ودروہی'' نے پہلے سے جنگ آزادی کی سلگ رہی آگ میں گویا گھی ڈالنے کا کام ہی انجام دیا تھا۔ اس کی یہ سطور خاطر نشیں مانی گئی تھیں :

بالو ویر، بالو، انت مم شیر ۔ ۔ ۔

''یعنی بولو او بہادر، بولو، میرا سر بلند ہے''

شری وریندر کمار گھوش کی ادارت میں شائع ہونے والے ہفتہ وار اخبار ''بجلی'' میں مدیر نے شاعر سے رابطہ قائم کرکے ۶ جنوری ۱۹۲۲ء کو اس نظم کو شائع کردیا تھا۔ رسالے کے شمارے کو قارئین کی زبردست مانگ پر دوبارہ شائع کرنا پڑا تھا۔ جب نذرل نے بذات خود رابندر ناتھ ٹیگور کے پاس جاکر انہیں مکمل نظم سنائی، تب انہوں نے انہیں مستقبل کے متعلق آشیرواد بھی دیا تھا۔ اس سے نذرل عوام الناس میں راتوں رات اور بھی زیادہ مقبول ہوگئے تھے۔ سن ۱۹۲۲ء میں نذرل نے ہفتہ وار رسالہ ''دھوم کیتو'' کی اشاعت شروع کرکے اپنی ایک پارینہ خواہش کو پایۂ تکمیل تک پہنچا دیا تھا۔ جریدہ کا اول شمارہ ۱۲/اگست ۱۹۲۲ء کو رابندر ناتھ ٹھاکر، شرت چندر چٹرجی، وریندر کمار گھوش وغیرہ معزز، نامور اور مشاہیر ہستیوں کی نیک دعاؤں کے ساتھ نکلا تھا۔ اسی کی یہ سطور تھیں :

جاگئے دے رے چمک میرے، آچھے جارا اردھ چیتن

''یعنی جو لوگ اب بھی اردھ چیتن (یعنی نصف بیدار یا بابوش) ہیں، انہیں چمک مارتے ہوئے جگاؤ''

نذرل روس کے انقلاب اور روسو کے اصول ''آزادی، مساوات اور اخوت'' کے جذبات سے بے حد متاثر و مرغوب تھے۔ ۱۶/جنوری ۱۹۲۳ء میں اُن کی قید کے موجب ''دھوم کیتو'' کی اشاعت بند کردینی پڑی تھی۔ یہ قید گیارہ ماہ تک چلی تھی۔ اس سے قبل جب نذرل نے ''نو یگ'' نام سے ایک رسالہ نکالا تھا، وہ تب تک اپنی باغی صحافت کی بدولت بنگال کی کمیونسٹ پارٹی کے پیشوا بن چکے تھے۔ جوانی میں ہی وہ اس پارٹی کے سرپرست جناب مظفر آمید سے رابطہ قائم کرچکے تھے۔ ۱۹۲۲ء میں انہوں نے ''یگ وانی'' نام سے بھی ایک مجلّہ شائع

Kashmir Treasures Collection, Srinagar

CC-0. In Public Domain. Digitized by eGangotri.

کرنا شروع کر دیا تھا۔ ان کے ہمہ گیر اثر و مقبولیت کا ایک ثبوت یہ ہے کہ ہندی زبان کے مقبول عام شاعر شری سمترا نندن پنت جی نے اپنے ایک شعری مجموعے کا نام بھی یہی رکھا تھا۔ برطانیہ سرکار نے ان کی باغیانہ حرکات و سرگرمیوں سے بیزار و خفا ہو کر انہیں کئی دفعہ قید کر کے جیل بھیجا۔ انہوں نے جنوری ۱۹۲۳ء میں ۴۰ دنوں تک جیل میں بھوک ہڑتال بھی کی تھی۔ محترم رابندر ناتھ ٹھاکر نے اُنہیں اپنی بھوک ہڑتال توڑنے کے لئے ایک خط لکھا، لیکن نذرل تب بھی نہ مانے۔ پھر جب اُن کی والدہ اُن کو ملنے جیل آ گئی، تب انہوں نے وہ بھوک ہڑتال ختم کی۔ اتنا ہی نہیں، ایک بار نیتا جی سبھاش چندر بوس نے جیل میں بیٹھ کر اُن کے اس باغیانہ جذبے کی تعریف کرتے ہوئے کہا :

''ہم جیسے انسان جو موسیقی سے دور بھاگتے ہیں، ہمارے اندر تک بھی ایک زبردست جوش جاگ رہا ہے کہ ہم بھی نذرل کی مانند گیت گانے لگ جائیں گے۔ اب آگے سے ہم مارچ پاسٹ کے وقت ایسے ہی نغمے گایا کریں گے۔ ان کے گیت سننے سے اور گانے سے تو ہمیں یہ قید بھی قید محسوس نہیں ہوتی ہے''

دوسری جنگ عظیم کے بعد تو نذرل فقط ادب و موسیقی کے ساتھ ہی کاملاً جڑ گئے تھے۔ اگرچہ دوسری جانب ان کی مالی حالت حسب معمول ہی چل رہی تھی تاہم اُن کی جنگ آزادی سے متعلق سرگرمی میں مطلق کمی نہ آئی تھی۔ ۱۹۲۴ء میں سارا بنگال ایک جانب مہاتما گاندھی کی تحریکِ غیر تعاون کی پشت پناہی میں مصروف تھا، دوسری جانب نذرالاسلام کے سیاسی گیت و نظمیں بے حد مقبول ہو رہے تھے۔ مثلاً ۔ ''مرن مرن'' گیت کی اوّل سطر ہی یہ تھی :

ایشو ایشو ۔ ۔ ایشو او گو مرن

یعنی، آؤ، تم آؤ، او موت ۔ ۔ !

اصل میں یہ کہہ کر وہ عوام کو آزادی کی حصولیابی کے لئے بے خوف ہو کر موت کے روبرو کھڑے ہونے کے لئے مہمیز کر رہے تھے۔ اس کے بعد کی لکھی گئی نظموں اور گیتوں میں اُن کی ذاتی زندگی منعکس ہوتی رہی اُن کے گیتوں کی متعدد سطور اسی حقیقت کی غماز ہیں۔ مثلاً ''دپہرا بھی سار'' گیت میں وہ یوں رقم طراز ہیں :

جاش کوتھا شوئی ایکیلا اور توئی

نذرل نے لکھنؤ پیکٹ میں کانگریس اور مسلم لیگ دونوں سیاسی پارٹیوں کی مصنوئی یک جہتی پر طنز کرتے ہوئے ایک گیت لکھا تھا :

بدنا گاڈور پیکٹ ۔ ۔ ۔

وہ کہنا چاہتے تھے کہ خلافت تحریک کی وجہ سے ہندو مسلمانوں کی یک سوئی فقط دو دنوں کی چاندنی کی مانند مستحکم نہ ہو کر صرف وقتی کاوش ہی ہے۔ اُنہوں نے چالیس کروڑ ہندوستانیوں کو تنبیہہ کرتے ہوئے لکھا تھا :

چالیس کوٹی منش ہم بھارت واسی، بھن بھن بنے، ڈھاؤں ڈھاؤں بسے، تبھی بنے پرادھین، کھودی آزادی یعنی، ہم ہندوستانی لوگ چالیس کروڑ کی تعداد میں ہیں، لیکن ہم تمام افراد الگ الگ مقامات پر قیام پذیر ہیں اور الگ الگ عقیدے رکھتے ہیں اور اسی کے موجب غلام بھی ہیں اور اسی کے نتیجے میں ہم نے اپنی آزادی تک گنوا ڈالی ہے۔

اسی طرح وہ تمام تر فسادات کا حل بتاتے ہوئے اپنے ملک کے باشندوں سے یہ نصیحت بھی کرتے ہیں:۔

'' پھر ایک بار ہم سنگھٹت ہوویں، جاتی دھرم بھید بھلا

Kashmir Treasures Collection, Srinagar

CC-0. In Public Domain. Digitized by eGangotri.

دیویں، تو شانتی سامیہ ان وستر پُنہ سبھی پاویں''

یعنی ہم سب کو ایک بار دوبارہ باہم منظم ہو جانا چاہئے۔ جاتیوں، نسلوں اور مذہبی تفرقات کو فراموش کر دینا چاہئے تو اس طرح سے ہم امن وامان، مساوات، اناج اور کپڑے پھر سے دستیاب کر سکتے ہیں۔

وہ ہمالیہ پہاڑ کو ظالم و جابر حکمران انگریزوں کا مظہر بناتے ہوئے یہ لکھ کر اپنی جواں مردی اور دلیری کا ہی ثبوت فراہم کر گئے تھے :

بول ویر کر اُنت سر، شکھر ہمادری نے کیا نت اپنا، دیکھ اُنت میرا سر ۔ ۔ !

یعنی، اے بہادر! اپنے سر کو بلند کر اور بتا مجھے! ہمالیہ کی چوٹیوں نے بھی تو دیکھو، کیا اپنا بلند سر آج تک کبھی جھکایا ہے ۔ ۔ ؟ مفہوم یہی ہے کہ ہر چند نہیں جھکایا ہے۔ لہٰذا تم بہادروں کو بھی ہرگز اپنا سر نہیں جھکانا چاہئے۔

نذرل کی بعد کی نظموں میں شادی والے پرانے حادثے کی صدائے بازگشت رہ رہ کر سنی جاتی رہی۔ بعد میں بھی نرگس ان سے تعلق قائم کرنے کی ناکام کاوشیں کرتی رہی، لیکن انہوں نے آخر میں اس کے آخری خط کا انکار میں جواب لکھ دیا تھا، ساتھ ہی یکم جولائی ۱۹۳۷ء کی تاریخ کو ایچ ایم وی کمپنی کے ریکارڈ کے لئے جس گیت کی تخلیق کی اُس کا اوّل مصرعہ ہی یہ تھا :

جارہا تھے دئے مالا، دتے پارو نائیں، کینی منے راکھا تارے؟ بھولے جاؤ تارے، بھولے جاؤ ایکے بارے

یعنی جس کے ہاتھ میں مالا دے کر بھی تم دے نہ سکے، اُسے کیوں یاد رکھتے ہو؟ اُس کو بھول جاؤ، بھول جاؤ ایک دم!

کوملہ میں سکونت اختیار کرتے ہوئے نذرل نے مہاتما گاندھی کی تحریکِ آزادی سے مرغوب و مرعوب ہو کر چرخے وغیرہ پر مبنی متعدد گیتوں و نظموں کی تخلیق کر کے مقبولیت حاصل کر لی تھی۔ انہوں نے گاندھی جی کا خیر مقدم ان الفاظ میں کیا تھا :

اے کون پاگل پتھک چھوٹے ایلو بندنی مار آنگنائے ؟
تریس کوٹی بھائی مرن ہرن گان گئے تار سنگے جائے۔

یعنی غلام ماتا کے آنگن میں یہ کون دیوانا راہی دوڑتا ہوا بے تحاشہ چلا ہی جا رہا ہے؟ اس کے عقب میں اسی کے تیس کروڑ بھائی بھی اس کے ساتھ موت تک کو للکارتے ہوئے نغمے گاتے ہوئے چلے جا رہے ہیں۔

نذرل جی گاندھی جی کی تحریک میں ''سوراج'' کے عقیدے سے کاملاً متفق تو نہیں تھے اور اس کی جگہ قدیم ضوابط و روایات کی قیدوں سے بغاوت کے سبق کی ہی تلقین کرنے کو ترجیح دیا کرتے تھے۔ اس ضمن میں ان کا یہ مقولہ قابل حوالہ ہے :

''راج بندیر زبان بندی'' کا مقصد صاف ہے۔ گاندھی جی جسے ''دُشٹ سرکار'' کہتے تھے، اُس سرکار کی اور مزید اُس کے قانونی واہتمامی اوزاروں کی کھلی تنبیہہ کرنا ہی آج مقصود ہے۔ ایک شاعر خدا کی چنندہ آواز ہوتی ہے جو ہمیشہ حق کی ہی پشت پناہی کیا کرتی ہے، ہندوستان کی موجودہ حالت کی حقیقت کی تائید کرتی ہے۔ وہ خدا اور انصاف کی جانب داری کرتی ہے اور تمام قابل نفرت اشیاء کو نیست و نابود کرنے کا ایک اوزار یا وسیلہ ہے''

آگے بھی کہتے ہیں کہ :

''مجھے صاف طور پر یہ واضح ہوا ہے کہ میں اُسی خدا کا ہی دنیاوی بغاوت کرنے کے لئے بھیجا ہوا ایک لال فوجی یا

Kashmir Treasures Collection, Srinagar

CC-0. In Public Domain. Digitized by eGangotri.

سینک ہوں۔ سچ کی حفاظت اور انصاف کی حصول یابی کے مقصد سے وارد کیا گیا ایک فوجی ہوں۔ اُس نے مجھے بنگال کی اس سرسبز زمین پر ایک پیغمبر اور ناقوس بجانے والے کی صورت میں دنیا میں وارد کیا ہے، ایک ایسی زمین پر جو کہ کسی وشیکرن کے زیر اثر ہے۔ میں تو فقط ایک معمولی سا فوجی ہوں اور اُسی کی ہدایات کی تکمیل وتشکیل کرنے کے لئے میں نے حتی المقدور سعی کی ہے''

مندرجہ ذیل قومی گیتوں میں بھی نذرل کی باغی فطرت وحب الوطنی کے جذبات گاہے بگاہے نمایاں ہوئے ہیں :

دُرگم گری کانتار مرو دُستر پارا وار، لانگھتے ہو بے راتری
نشیتھے یاتری راہُشیار

یعنی، نارسا کوہ، خوفناک صحرا اور دقیق سمندر ہر سمت محیط ہیں۔ شب کی تاریکی میں انہیں پھر سے پار کرنا ہوگا۔
مسافرو! ہوشیار ۔ ۔ !

یہاں نذرل جی نے اوّل جنگِ آزادی کی ناکامی کی جانب مطلق سا اشارہ کرتے ہوئے ہندوستانیوں کو ایک بار پھر سے جوشِ جنوں کے ساتھ اپنے مقصد کامل آزادی کی حصولیابی کی خاطر جنگجو بننے کے لئے مہمیز کیا ہے۔

ایک گرپ گیت یا نغمے میں نذرل نے اپنے مانند چند باغی نوجوانوں کی قیادت کرتے ہوئے جو گیت گایا تھا، اسکی چند سطور یہ ہیں :

آمرا شکتی آمرا بل آمرا چھاتر دل!
یعنی ہماری تمام طاقت اور ہماری قوت ہمارے طلباء کا یہی اجتماع ہے۔

ایک کورس گیت میں، جو کہ مارچنگ سانگ کی ہیئت یا ترکیب میں ہی ہے، شاعر نے لکھا تھا :

چل، چل، چل! اور دھوے گگنے باجے مادل، نمنے اتلے دھرنی تل، ارُن پرانتیر ترُن دَل!، چل رے، چل رے، چل ۔ ۔ !
یعنی چلو، چلو، اوپر فلک پہ ڈھول پکار رہے ہیں، نیچے زمیں لرزاں ہے۔ وقتِ افق کے نوجوانو! آگے، آگے اور آگے بڑھو ۔ ۔ !

موسیقی میں یدطولیٰ (مہارت)

نذرل اوائل زمانے سے ہی شاعری سے کہیں زیادہ موسیقی کی جانب راغب تھے اور ان کی اس رغبت کو ان کے دیہات میں کلاسیکی موسیقی کے ماہر ستیش چندر کانجی لال نے بالخصوص اور بھی پروان چڑھایا تھا۔ ان کو ہارمونیم، ڈھولک اور طبلہ بجانے میں خاصی مہارت تھی۔ وہ خود بجاتے ہوئے گایا بھی کرتے تھے۔ شری اشوک کمار یمن نے ان کے ضمن میں لکھا ہے کہ :

''وہ مختلف احساسات کی بنیاد پر مختلف تراکیب کے سنگیت کا استعمال کیا کرتے تھے۔ ایک ''چھندسی'' نامی گیتی ناٹکا میں انہوں نے سنسکرت زبان کے دس چھندوں (بحروں) کا بخوبی استعمال کیا ہے۔ انہوں نے تقریباً پانچ سو گیت عشق کے موضوع سے وابستہ تحریر کئے تھے اور تقریباً اتنی ہی تعداد میں آکاش وانی کے لئے بھی بنائے تھے۔ ان کی اس نوعیت کی تخلیقات ''نورنگ مالکا'' میں باقاعدہ شائع ہوتی رہیں۔ انہوں نے متعدد نئے راگوں کا بھی اختراع کیا تھا۔ ان کے تشکیل کئے گئے اہم قابل ذکر راگ یہ ہیں :

Kashmir Treasures Collection, Srinagar

CC-0. In Public Domain. Digitized by eGangotri.

اُداسی بھیرو، ارُن بھیرو، رُدر بھیرو، آشا بھیرو، شوانی بھیرو، ارُن رنجنی، یوگنی، دیویانی، دولن چانپا، بینوکا، سندھیا مالتی، ون کنتلا، شنکری، نیناکشی، روپ منجری، نرجھنی (شاید صحیح نام نرجھرنی ہی درکار ہے)، شوسرسوتی، رکت ہنس سارنگ وغیرہ۔

امیر خسرو کی مانند نذرل نے بھی راگوں کی طرح نئے تالوں کا بھی اختراع کیا تھا، مثلاً ان کا ایجاد کیا ''نونند تال'' بیس ماتراؤں کا ہے۔ توپریا چھندا نامی تال سات ماتراؤں کا ہے۔ فی الاصل انہوں نے فقط اُن ہی راگوں کو استعمال کرنے کو فوقیت دی ہے جو کہ بنگلہ زبان وموسیقی میں مطلوبہ احساسات کو پیدا کرنے میں معاون ثابت ہوسکتی ہیں۔ انہوں نے خاص کر عوامی موسیقی، کلاسیکی موسیقی اور چند غیر ملکی موسیقی بالخصوص عربی موسیقی کو اپنی تخلیقات میں خاص مقام عطا کیا ہے۔ ایسا بتایا جاتا ہے کہ ۱۹۳۰ء تا ۱۹۴۰ء کے درمیان وہ ہر روز کم از کم ایک درجن نئے گیت تخلیق کیا کرتے تھے۔ انہوں تقریباً ۳۰۰۰ گیت بنائے تھے جن میں سے آج تک ہمیں فقط نصف ہی دستیاب ہو پائے ہیں اور بقیہ محنت کش اور عرق ریزی کرنے والے محققوں کی راہ دیکھ رہے ہیں۔ اُمید ہے کہ اس بلند پایہ ومایہ ناز شاعر وموسیقار کی مختلف خدمات کو نشان زد کرنے کے لئے جلدی ہی کوئی باضابطہ اہتمام کیا جائے گا۔ نذالاسلام کو کولکتا یونیورسٹی نے ۱۹۹۵ء میں مطلوبہ ونایاب ''جگ تارینی پرسکار'' دے کر نوازا تھا۔ اسی طرح ہند سرکار نے انہیں ''پدم بھوشن'' کا اعزاز عطا کیا تھا۔ ''رویندر بھارتی'' نامی ادارے نے انہیں ''ڈی لٹ'' کی بلند ڈگری سے نوازا تھا، وہیں بنگلہ دیش کی ڈھاکہ یونیورسٹی نے بھی دے کر گویا از خود کو نوازا تھا۔ آخر کار کئی لاعلاج مرضوں سے لڑتے ہوئے آزادی، باہم محبت، مساوات، اخوت اور انسان دوستی کا یہ نمائندہ شاعر وموسیقار ۱۹ راگست ۱۹۷۶ء کو اس جہان فانی کو خیر باد کہہ کر جنت نشین ہوگیا۔ اس نے سرسوتی دیوی کے خزینے میں اپنے گیتوں، نظموں اور راگوں وتالوں کے گوہروں سے جو بے بہا اضافہ کیا ہے، وہ بے مثال ہی گردانا جائے گا۔ ہندوپاک کو ہی نہیں بلکہ تمام دنیا کو اس دولت پر ہمیشہ ناز وفخر رہے گا۔

حواشی

۱۔ ''انتخاب اکبر آبادی''
تصحیح وترتیب : ڈاکٹر صدیق الرحمٰن قدوائی
ص : ۷۰ ؛ جیبی کتابیں، جامعہ نگر، نئی دہلی
پہلی بار : اگست ۱۹۸۴ء

۲۔ ''مانوتاوادی نذرل کے گیت'' (ہندی کتاب)
مترجم : جلج بھاوڑی ؛ پاریجات پبلی کیشنز، کولکاتا
پہلی بار : ۱۹ رفروری ۱۹۹۲ء ؛ ص : ۱۰۹

۳۔ ''قاضی نذرالاسلام'' (ہندی ترجمہ شدہ کتاب)
گوپال حالدار ؛ مترجم : ونود بھاردواج
ساہتیہ اکادمی، نئی دہلی۔
پہلی بار : ۱۹۷۷ء ؛ ص : ۱۲ تا ۱۴

۴۔ ''سنگیت رتناولی'' ؛ اشوک کمار
ابھی شیک پبلی کیشنز، سیکٹر ۷ اسی، چندی گڑھ
پہلی بار : ۲۰۰۸ء ؛ ص : ۷۱۳

۵۔ ''مانوتاوادی نذرل کے گیت''
مترجم : جلج بھاوڑی ؛ ص : ۱۱۵

☆ ☆

Kashmir Treasures Collection, Srinagar

CC-0. In Public Domain. Digitized by eGangotri.

عرفان رشید
9622701103

وحشی سعید بحیثیت ناولٹ نگار

جموں وکشمیر اپنے ادبی سرمائے کی بدولت برِصغیر میں اپنا ایک الگ مقام رکھتا ہے جہاں اس سرزمین نے شیخ العامؒ اور لل دید کو جنم دیا ہے وہیں دوسری طرف کلہن ، ارن مال اور ابھینو گپت جیسے دانشوروں اور قلمکاروں نے اپنے ادبی کاوشوں سے دنیائے ادب کو مالا مال کیا ہے۔ جموں وکشمیر کے ادیبوں نے خاص طور سے تین زبانوں یعنی فارسی ،کشمیری اور اردو زبان میں ادب تحریر کیا ہے۔اردو ادب کی بیشتر اصناف کو اس خطے نے وسعت عطا کی ہے اور خاص طور پر اردو فکشن کو یہاں کے ادباء نے نئے نئے ممکنات سے ہمکنار کیا ہے۔جس طرح سے اردو ناول اور افسانہ نے یہاں کے قلم کاروں کو اپنے طرف متوجہ کیا ہے اسی طرح ''ناولٹ'' جیسی نئی صنف میں بھی یہاں کے تخلیق کاروں نے اپنے جوہر دکھائے ہیں۔وحشی سعید ساحل بھی ایک فکشن نگار کی حیثیت سے اردو ادب میں متعارف ہوئے ہیں۔انہوں نے ناول اور افسانہ کے ساتھ ساتھ کئی اچھے ناولٹ بھی تحریر کیے ہیں۔ان کے ناولٹوں کا مجموعہ ''ماضی اور حال'' ۲۰۱۵ء میں شائع ہو چکا ہے جس میں پانچ ناولٹ شامل ہیں حالانکہ انہوں اس میں وہی تحریریں شامل کی ہیں جو انہوں نے دورِ شباب میں قلم بند کی تھیں لیکن وحشی سعید نے اپنے ماضی کی نگارشات کو حال سے ملانے کی ایک کامیاب کوشش کی ہے۔ان میں شامل ایک ناولٹ ''قحط'' کو چھوڑ کر باقی چار ناولٹ کا نام بھی تبدیل کر کے ایک نیا حسن پیدا کیا ہے جس کی وضاحت انہوں نے اس کے پیش لفظ میں بیان کی ہے۔اس کے علاوہ ان کے دو ناولٹ ''پتھر پتھر آئینہ'' اور ''ایک موسم کا خط'' بھی منظرِ عام پر آ چکے ہیں۔حقیقی معنوں میں یہاں بے ساختہ حالی کا قول یاد آجاتا ہے کہ انہوں نے کہا تھا کہ جس طرح ریچھنی اپنے بدصورت بچے کو چاٹ چاٹ کر خوبصورت بنا دیتی ہے اسی طرح شاعر کو چاہئے اپنی شاعری کی نوک پلک کو بار بار سنوارے تاکہ شعر خوبصورت بن جائے۔اس سے اندازہ ہو جاتا ہے کہ یہ قول صرف شاعروں یا ادب تک محدود نہیں ہے بلکہ زندگی کے ہر شعبے میں اس کو بروئے کار لایا جاسکتا ہے۔وحشی سعید نے بھی اپنی زندگی کے حسین ماضی کو نکھار کر حال کے نئے تناظر میں ڈالنے کی ایک بہترین کوشش کی ہے۔

''عجب زندگی ،غضب موت'' وحشی سعید کا ایک اچھا ناولٹ ہے جس کا بنیادی موضوع حسن وعشق کی داستان ہے۔کہانی کو انہوں نے رومانوی انداز اور سادہ بیانیہ کی تکنیک میں پیش کیا ہے۔اس ناولٹ کا جو موضوع ہے وہ اصل میں دو حصوں میں منقسم ہے یعنی ''عجب زندگی'' اور دوسرا حصہ ''غضب موت''۔اس کہانی کی شروعات اس کے مرکزی کردار ''جبار'' سے ہوتی ہے جو جیل کی سلاخوں میں زندگی کے آخری دن کاٹ رہا ہے۔اسی درمیان فلیش بیک تکنیک کا سہارا لے کر ناول نگار نے کردار کو اپنی زندگی کے ماضی میں غوطہ زن کیا۔اس طرح سے موصوف نے مرکزی کردار کے ذریعے کہانی کو اختتام تک پہنچایا ہے۔جبار اپنے بچپن کی زندگی اور اپنی ہم جولی ''گلابو'' کو یاد کر کے اپنے عالیشان گھر ،جس میں نوکر چاکر اور کھیتی باڑی اور گلابو کے ساتھ صبح وشام کھیلنا اور پھر جوانی تک پہنچنا ، یہ سب ان کی زندگی کا مشغلہ تھا اچانک ''یوسف'' نامی غنڈے کی وجہ سے ان کی زندگی اجیرن بن

Kashmir Treasures Collection, Srinagar

CC-0. In Public Domain. Digitized by eGangotri.

جاتی ہے۔ گلابو اور پھر شہری لڑکی ''نسرین'' کا داخل ہونا بھی کسی مصیبت سے کم نہیں ہے۔ جب جبار کو اس بات کا علم ہو جاتا ہے کہ گلابو کو یوسف نے طلاق دیا ہے اور جس کی تاب نہ لا کر انہوں نے اپنی زندگی کا خاتمہ کیا ہے۔ اسی جوش میں انہوں نے آخر پر یوسف کا قتل کیا ہے اور قتل کے الزام میں انہیں پھانسی دی جاتی ہے اور کہانی کو ناولٹ نگار نے متذکرہ نام دے کر اس کو خوبصورت انداز میں پیش کیا ہے۔

ناولٹ کا موضوع اچھوتا نہیں ہے لیکن وحشی نے جس انداز سے اسے برتا ہے وہ نرالا اور اچھوتا ہے۔ کہیں کہیں قاری کو محسوس ہوتا ہے کہ وہ ناولٹ نہیں پڑھ رہا ہے بلکہ وہ کسی فلم کا سین دیکھ رہا ہے۔ Dialogue delivery بھی کچھ اس انداز کی دیکھنے کو ملتی ہے کہ قاری اُکتا نہیں جاتا بلکہ اُس کا تجسس برقرار رہتا ہے۔ اس کے فلمی انداز اور مکالمہ نگاری کا اندازہ مندرجہ ذیل اقتباس سے لگایا جاسکتا ہے :

''جانے دو جبار! یوسف کمینہ ہے۔ اس کے ساتھ جھگڑا مت مول لو، تم اس کو نہیں جانتے'' ۔ ۔ گلابو گھبرا گئی۔

''گلابو۔ تمہارا مطلب ہے کہ گالی سننے کے بعد بھی میں بزدلوں کی طرح بھاگ جاؤں۔ نہیں گلابو! میں بزدل نہیں ہوں ۔ ۔ !''

جبار جھاڑیوں سے باہر آیا۔ یوسف بھی اس کے نزدیک آ گیا تھا۔ جبار چیخ پڑا :

''زبان کو لگام دو ورنہ ۔ ۔ !''

یوسف کی آنکھیں غصے کی شدت سے سرخ ہو گئی تھیں۔

''کمینے گاؤں کی لڑکی کو ورغلاتا ہے۔ کیوں نہیں۔ تیری رگوں میں نیچ کا خون جو ٹھہرا'' ۔ ۔ ۔ ۔''

اس اقتباس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ وحشی سعید کو منظر نگاری، مکالمہ نگاری، اور کردار نگاری ایک اچھی خاصی دسترس حاصل ہے۔ انہوں نے سادہ پلاٹ اور عام فہم لفظیات کا خوبصورت استعمال کیا ہے۔ جہاں تک اس ناولٹ کے پیغام کا تعلق ہے تو اس حوالے سے وحشی سعید قاری کو مطلع کرانا چاہتا ہے کہ انسان کو ہمیشہ ایک صحیح راستہ اختیار کرنا چاہئے کیونکہ جس طرح سے جبار کے گھر میں برے حالات آنے کے بعد ان کو دور کرنے کے لیے دل میں غلط یعنی چوری کرنے کا ارادہ کرتا ہے اور اس ایک غلطی کی بدولت ان کی زندگی کا اختتام غضبناک موت پر ہو جاتا ہے۔ دوسری اہم بات یہ بھی ہے کہ انہوں نے ان عورتوں کی نفسیات کو بھی واضح طور پر عیاں کیا ہے جن کا مقصد شادی بیاہ یا ازدواجی زندگی نہیں ہوتی ہے بلکہ انہیں عیش و عشرت سے غرض ہوتی ہے۔ ناولٹ نگار نے اس میں شہری لڑکی کا نقشہ کھینچا ہے جس کی زندگی شہر کے آزاد فضا میں گزری ہوئی تھی اور جس کے خواب بڑے تھے جس کا غرض اپنے سسر اور ساس کے مقابلے میں اپنے شوہر سے ہوتا ہے لیکن حقیقی معنوں میں یہ صرف شہری لڑکیوں تک محدود نہیں ہے بلکہ گاؤں کی لڑکیاں بھی اس مرض کی شکار ہو گئی ہیں۔ دوسرے معنوں میں یہ کہانی اس سماج پر بھی طنز کرتی ہے جس نے ایسے سخت اصول مرتب کیے ہیں جس میں کئی جبار اور گلابو کی محبت نے دم توڑا ہوگا۔

''جائز ناجائز'' بھی ناولٹ ہے جس میں رومانیت اور انقلابِ فکر کا خوبصورت امتزاج دیکھنے کو ملتا ہے۔ ایک طرف ایک عام رومانی کہانی ہے تو سری طرف ایک احتجاجی فکر، انقلابی ذہن، جوش اور ولولہ کہانی کو نئے نئے ممکنات سے ہموار کر دیتی ہیں۔ کہانی کا پلاٹ سپاٹ ہے اور اس میں بھی بیانیہ تکنیک سے کہانی کو پرکشش بنایا گیا ہے۔ یوں تو اس کا قصہ ایک بڑے گھرانے کے لڑکے ''انور خان'' سے ہوتی ہے جس کے اندر آزادی کا جذبہ پنپ رہا تھا جو ہر وقت اسی بات کی رٹ لگائے

Kashmir Treasures Collection, Srinagar

CC-0. In Public Domain. Digitized by eGangotri.

ہوئے تھا کہ ''آزادی انسان کا بنیادی حق ہے'' لیکن گھر والوں کے کہنے پر رقیہ سے منگنی کرنے کے بعد انہیں حکومت کے خلاف سازشیں اور بغاوت کے عوض پھانسی پر لٹکایا جاتا ہے لیکن شادی سے پہلے انور نے اپنی منگیتر ''رقیہ'' سے جوانی کے شراروں کو قابو میں نہ لا کر انہیں حاملہ کر دیا۔ اب رقیہ کے گھر والوں نے رقیہ کے حرام بچے کو اپنے نوکر ''جمال'' کے سپرد کر دیا اور ساتھ ہی ساتھ انہیں اس گناہ کو چھپانے کے لیے پانچ لاکھ روپیے بھی دیے۔ جمال کو پہلے سے ہی ایک بیٹا ''بشیر'' نام کا تھا اور اب اس بچے کو انہوں نے ''افضل'' نام رکھا۔ اب جمال وہ جمال نہیں رہا تھا بلکہ جمال سیٹھ کے نام سے جانا جاتا تھا۔ افضل اب فوج میں کیپٹن بن گیا تھا اور اسی اثنا میں ایک دن چھٹی پر آتے ہوئے دونوں بھائی بشیر اور افضل سیٹھ رحمت اللہ کی پارٹی میں جاتے ہیں جو انہوں نے بیٹی ''رخسانہ'' کی سالگرہ پر رکھی تھی۔ بشیر کا دل پہلے سے ہی رخسانہ پر آ گیا تھا لیکن رخسانہ نے انہیں یہ کہہ کر جوش دلایا کہ ان کا چھوٹا بھائی بھی انہیں پسند کرتا ہے۔ بشیر کا خون ابل اُٹھا۔ اُس نے ماں سے سنا تھا کہ افضل ان کا بیٹا نہیں ہے بلکہ کسی کی ناجائز اولاد ہے جو ان کے گلے پڑ گیا۔ اب اسی غصے کو برقرار رکھتے ہوئے بشیر نے اپنی ماں کو ورغلا کر افضل کو گھر سے ہمیشہ کے لئے نکال دیا۔ جمال کو اس بات کا علم بخوبی تھا کہ وہ جو کچھ ہے آج افضل کے سبب ملے پانچ لاکھ روپے کی بدولت ہے جس سے انہوں نے اتنا بڑا کاروبار کھڑا کیا ہوا ہے۔ افضل اس صدمے کی وجہ سے کئی دنوں تک پیدل چلتے چلتے ایک دن ایک جھونپڑی کے باہر گر پڑا اور وہاں 'ناصر' نام کے آدمی نے اُسے بے ہوش پا کر اُٹھایا اور جھونپڑی کے اندر لیا۔ ناصر کو اپنے پیر صاحب نے کہا :

''ناصر تم کہاں تھے ۔ ۔ ؟''

''پیر صاحب! باہر ایک آدمی بے ہوش پڑا ملا۔ میں اس کو اندر لے آیا ہوں''

''بہت اچھا کیا۔ جب وہ ٹھیک ہو جائے تو اسے میرے پاس لانا۔ مجھے اس سے باتیں کرنی ہیں اور اس کا اچھی طرح خیال رکھو''

پیر صاحب نے من ہی من کہا ۔ ۔ ''شاید وہی ہوگا''

''میں کہاں ہوں ۔ ۔ ؟'' ۔ ۔ افضل اپنے آپ سے کہتا ہے۔

''آپ محفوظ ہیں اور شاہ کمال کے سائے میں آ گئے ہیں''

''السلام علیکم پیر صاحب! میں افضل ہوں''

''افضل کمال کہو''

''میں سمجھا نہیں۔ میں گنہگار ۔ ۔ !''

''تم میرے بعد اس گدی کے وارث ہو''

اس طرح سے پیر صاحب کی وفات کے بعد اور اس کی وصیت کے مطابق اب افضل نے ان کی گدی سنبھال لی اور پیر صاحب بن گئے۔ ایک دن انہوں نے پیر صاحب کو خواب میں پا کر دریافت کیا کہ کیا ہم جیسے آزادی کی تحریک میں حصہ لے سکتے ہیں تو اس حوالے سے جب پیر نے متعین بخش دیا تو انہوں ہوش میں آ کر ناصر سے کہا کہ بستی والوں کو بلا کر ہم ایک نئی تحریک جماعت آزادی کی تشکیل دیں گے۔ اس طرح سے انہوں نے ناصر سے مل کر ایک منظم تحریک چلا کر اپنے باپ 'انور خان' کا ادھورا خواب پورا کیا اور اپنے ملک کو آزاد کرایا۔

اصل میں وحشی سعید اس ناولٹ کی وساطت سے اپنے سماج تک یہ پیغام پہنچانا چاہتا ہے کہ پیدائشی کوئی ظالم، چور، مجرم، طوائف، زانی یہاں تک کہ حرامی نہیں ہوتا بلکہ یہ سب کے سب اعزاز انہیں سماج دیتا ہے۔ اچھے اور برے کی سرٹیفکیٹ سے انہیں یہی سماج نوازتا ہے۔

Kashmir Treasures Collection, Srinagar

CC-0. In Public Domain. Digitized by eGangotri.

جس چیز کو سماج حقیر اور گندی نظر سے دیکھتا ہے اُسی چیز کو جب لوگ کسی کام کی بدولت سر ہاتے ہیں تو یہی سماج واپس دنیائی غرض وغایت سے اُسے ہاتھوں ہاتھ لیتا ہے اور متذکرہ اقتباس جہاں پر پیر صاحب دل ہی دل میں سوچتے ہیں کہ

پیر صاحب نے من ہی من کہا ''شاید وہی ہو''

''شاید وہی ہو'' کے تین لفظ اپنے اندر معنی کی کثرت رکھتے ہیں۔ اگر ہم ان لفظوں کی تھوڑی تشریح کریں گے تو شاید کئی معنی آشکار ہو جائیں گے ۔ پیر صاحب کے دل کی آواز اس بات کا تعین کرتا کہ اللہ انسان کے دلوں کے خلوص کو دیکھتا ہے۔ یہاں حسب ونسب کا مول نہیں ہے ، یہاں نیک نیتی اور خلوص کی قیمت ہے۔ اسی لیے شاید پیر صاحب کو اندر سے آواز آئی ہوگی کہ یہی وہ اللہ کا نیک بندہ ہے جو بعد میں لوگوں کی خدمت کرے گا اور اپنے جوش وجنون سے لوگوں کا مستقبل سنوار لے گا۔ اب تک جو بھائی ، بیٹا اور شوہر کہنے سے کتراتے تھے کیوں کہ ان کے ساتھ لفظ ''حرام'' لگا ہوا تھا جس کی وجہ سے سبھی انہیں نفرت اور ذلت کی عینک سے دیکھ رہے تھے۔ افضل کے اندر ایک سچا انسان اور مخلص دوست چھپا تھا جس کی قدر تب تک سماج نے نہیں کی جب تک کہ انہوں نے وہ کارنامے انجام نہیں دیے جس کی وجہ سماج کو ماننا پڑا کہ حسب ونسل سے بڑھ کر اگر کوئی چیز ہے وہ انسان ، انسانیت اور محبت ہے۔

''فطرت ، محبت ، ندامت'' وحشی سعید کا بہترین ناولٹ ہے جس میں انہوں نے ایک انسان کی تین بنیادی خصلتوں کو بڑے ہی فنکارانہ انداز میں پیش کیا ہے۔ کہانی کا مرکزی کردار ''امین'' ہے جو کپڑے کا کاروبار کرتے کرتے ''امین سیٹھ'' بن جاتا ہے۔ اسی کردار کے حوالے سے کہانی آگے بڑھ جاتی ہے۔ اس کردار کو بنیاد بنا کر ناولٹ نگار نے ایک انسان کی تین خصلتوں کو مختلف انداز سے پیش کیا ہے۔ اگر ہم ناولٹ کے موضوع پر دھیان دیں گے تو موضوع سے ہی اندازہ ہوتا ہے کہ فطرت ، محبت ، ندامت حقیقی معنوں میں انسان کی بنیادی خصلتوں میں سے ہیں۔ ''فطرت'' انسان کی ایک ایسی چیز ہے جو ودیعتاً اللہ کی طرف سے ہوتی ہے۔ جس طرح سے کہانی میں امین سیٹھ نے امیر اور سیٹھ بننے کے لیے ایک گاؤں میں کپڑے کی فیکٹری قائم کرتا ہے اور غریبوں کا خون چوس لیا ہے۔ امین سیٹھ کو پہلے سے ہی ایک بری لت لگی ہوئی تھی کہ روز روز طوائفوں ، پارکوں اور دوستوں کے ساتھ ڈانس کلبوں میں جانا اور روز روز نئی لڑکیوں اور بہترین چیزوں سے آراستہ ہونا ان کا مشغلہ بن چکا تھا۔ دوسری ایک اہم خصلت ''محبت'' ہے یعنی اس کہانی میں امین اپنی بیوی شبنم اور تین بچے جن سے وہ بے حد محبت کرتا ہے جب ایک حادثے میں ان کی بیوی اور چھوٹی بچی کی موت ہو جاتی ہے اور بڑے بیٹے اقبال اور بیٹی گلنار حادثے میں بچ جاتے ہیں۔ اس طرح سے امین محبت کا پیاسا بن جاتا ہے اور آخر پر جب اسے اس بات کا علم ہو جاتا ہے کہ گلنار اس کی بیٹی ہے جسے ایک دفعہ طوائف سمجھ کر اس نے غلطی کا ارادہ کیا تھا اور اقبال بڑا بیٹا ہے جو اس کے کارخانے میں ایک چھوٹے ملازم کی حیثیت سے کام کر رہا ہے ۔ تب اس کے اندر پدرانہ محبت اور شفقت کا لاوا ابھر آیا اور اسے احساس ہوا کہ اس نے زندگی کے سب سے عظیم رشتے کو غلط نظروں سے دیکھ کر ایک بہت بڑا گناہ کیا ہے جس کا شاید اب ازالہ نہیں ہوگا۔ اس طرح سے کہانی کے آخر پر اس نے توبہ کی نیت سے سب گھر بار اپنے بچوں کے نام کر کے ایک چیرٹی اسپتال میں مریضوں کی خدمت میں خود کو وقف کیا اور اسی دوران ایک گاؤں میں ہیضہ کی بیماری پیدا ہوگئی جس میں امین سیٹھ بیماروں کی تیمارداری کرتے کرتے خود اس کا

Kashmir Treasures Collection, Srinagar

CC-0. In Public Domain. Digitized by eGangotri.

شکار ہوگیا۔ آخر پر ''ندامت'' نے انتہا پکڑ لی اور اس کے بیٹے اور بیٹی نے انہیں ایسی حالت میں دیکھ کر معاف کیا اور امین کی المیہ موت پر کہانی کا اختتام ہو جاتا ہے۔

متذکرہ ناولٹ وحشی سعید کا ایک طویل ناولٹ ہے جو ۶۵ صفحات پر مشتمل ہیں۔ سادہ پلاٹ اور بیانیہ کی تکنیک کا خوبصورت استعمال ہوا ہے۔ مکالموں میں فلمی انداز اور منظر کشی بھی عمدہ ہے۔ زبان و بیان کے حوالے سے بھی ایک کامیاب ناولٹ ہے۔ مجموعی طور ہم کہہ سکتے ہیں کہ وحشی سعید نے ایک کردار کے ذریعے سماجی حقیقت نگاری کی عمدہ عکاسی کی ہے اور ساتھ ہی اپنے قارئین کو سمجھانے کی کوشش کی ہے کہ ہر برائی کا انجام برا ہوتا ہے اور اچھائی کا اچھا۔

''وحشت محبت'' ایک خوبصورت ناولٹ ہے جس میں ناولٹ نگار نے ایک عورت کی نفسیات کو بیان کیا ہے کہ کس طرح سے ''رانی'' اصلی نام صنوبر نے ایک سادہ لڑکے 'اصغر' جو گاؤں سے شہر میں اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے لیے آتا ہے لیکن شہر کی گہما گہمی اور 'رانی' کی چالبازی کو دیکھ کر ان کا دیوانہ ہو جاتا ہے۔ یہاں تک کہ جو خواب اس کے غریب ماں باپ نے دیکھے تھے وہ سب چکنا چور ہو جاتے ہیں۔ وحشی سعید نے یہ دکھانے کی کوشش کی ہے کہ کس طرح سے ایک معصوم لڑکے نے اپنا مقصد بھول کر محبت (جسے موصوف نے ''وحشت محبت'' کے نام سے موسوم کیا ہے) کی رنگ رلیوں میں اپنی خوبصورت زندگی کو اجیرن بنا دیا۔ 'رانی' جس نے پہلے اصغر کو اپنے جھوٹے پیار کا جامع پہنایا اور اپنی والدہ کی انتقال کے فوراً بعد ایک نئے عاشق سے شادی کی اور جب اس خاوند کا انتقال ہو گیا تو واپس اپنے پرانی محبت 'اصغر' کے پاس آجاتی ہے۔ اصغر پیٹ میں بچے سمیت پھر اسے اپناتا ہے اس طرح 'رانی' پھر سے روپیوں کی لالچ میں آکر اصغر کے دوست کے ساتھ جسمانی تعلقات بنانے میں مصروف ہوگئی۔ جب اس نے دھوکا دے کر ایک ہوٹل کے مالک کے حوالے کیا جہاں پر ان کی عصمت کو تار تار کیا گیا۔ تب اسے احساس ہوا کہ اس نے بھلے انسان 'اصغر' کو دھوکہ دیا ہے۔ وہاں سے بھاگ کر پھر ایک مرد اور بعد میں فٹ پاتھ پر سو رہے بھکاریوں کی رات کی زینت بن گئی۔ اس طرح سے ان کی نفسیاتی حرص اور لالچ سے ان کا حسین چہرہ مسخ ہوگیا۔ آخر افسوس کرتے کرتے اسپتال میں دم توڑ دیتی ہیں اور اصغر بھی اپنے گاؤں لڑکھڑاتے ہوئے اپنی دہلیز پر جان دیتا ہے۔

اصل میں وحشی سعید نے اس ناولٹ کے حوالے دو باتوں کی طرف خاص اشارہ کیا ہے۔ ایک زندگی کا کوئی مقصد اور نصب العین ہونا چاہئے اور دوسری چیز انسان کو اپنے جذبات و احسات پر ضبط ہونا چاہئے تاکہ جہاں بھی کوئی حسین چیز اسے اپنی اور مائل کرے وہاں اس کا مقصد اور نصب العین کام آجائیں۔ جہاں تک لفظ ''وحشت محبت'' کا تعلق ہے یہ ایک مرکب ہے جسے موصوف نے ملا کر ایک نئے معنی سے ہمکنار کیا ہے۔ یہ وحشت محبت ہی تو ہے جسے 'اصغر' بار بار اپنا لیتا ہے اور جان کر بھی کہ اس کی معشوقہ 'رانی' کا کردار صحیح نہیں ہے لیکن اس کے باوجود اسے رشتہ قائم رکھنا یہی اندھی اور وحشت محبت کی علامت ہے ملاحظہ کیجئے ایک مثال:

> اصغر جب سو کر اٹھا تو اس کا دوست اور صنوبر نہیں تھے۔ اس نے صنوبر کو دوسرے کمرے میں دیکھا، وہ وہاں بھی نہیں تھی وہ کھڑکی سے باہر دیکھ ہی رہا تھا کہ دونوں ایک دوسرے کے ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے مکان کے پاس نظر آئے، وہاں رک کر اس کے دوست نے صنوبر کے ہونٹوں پر پورا الوداعی بوسہ دیا اور چلا گیا۔

Kashmir Treasures Collection, Srinagar

CC-0. In Public Domain. Digitized by eGangotri.

''ارے تم سو کر اُٹھ گئے۔اب طبعیت کیسی ہے ۔ ۔ ؟''

''ٹھیک ہے۔تم کہاں گئی تھی ۔ ۔ ؟''

''وہ تمہارا دوست ہے نا، اسی کے ساتھ تھوڑا باہر کی سیر کو گئی تھی''

''بات دوستی تک ہی رہی یا پھر تمہارے اور اس کے رشتے میں کچھ اضافہ بھی ہوا''

اصغر نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''مجھے اس قسم کا مذاق بالکل پسند نہیں۔اگر تم نے مجھ پر شک کیا تو میں تمہارے دوست کے ساتھ ہی شادی کر کے تم سے دور چلی جاؤں گی''

اصغر معصومیت سے اس کا منھ تکنے لگا۔

وحشی سعید اس ناولٹ کے ذریعے قارئین کو باخبر کرانا چاہتے ہیں کہ جس طرح سے ایک کامیاب مرد کے پیچھے ایک عورت کا ہاتھ ہوتا ہے اسی طرح ایک ناکام مرد کے پیچھے بھی ایک شاطر اور چالباز عورت کا ہاتھ ہوتا ہے جس کی زندہ مثال ناولٹ کا مرکزی کردار ''اصغر'' ہے جو اپنے ماں باپ کے خوابوں کو شرمندہ تعبیر کرنے کے دوران ہی ایک چالاک اور چالباز لڑکی کے پیچھے جاتا ہے جس سے اس کے سارے خواب ایک دم ٹوٹ جاتے ہیں۔زندگی دردسر بن جاتی ہے اور آخر اپنے زندگی سے تنگ آکر اپنے گاؤں جہاں اب ان کا کوئی یار و مددگار نہیں ہے وہیں اپنی دہلیز پر دم توڑ دیتا ہے۔اس طرح سے کہانی اصغر کی المیہ موت پر ختم ہو جاتی ہے۔

اس کہانی میں وحشی سعید نے دانستہ طور پر اپنے سماج کے ان جوانوں پر طنز کے تیر برسائے ہیں جو اپنی زندگی میں اپنے مقصد اور نصب العین سے غافل ہیں وہ انہیں کہیں نہ کہیں اس بات کی طرف لے جاتے ہیں کہ زندگی میں کئی پڑاو پر مکر اور چالباز لڑکیاں رقص کرتی ہیں اور وہی کامیاب ہوتا ہے جس کے قدم لڑکھڑاتے نہیں ہے بلکہ ان کو دھکیل کر آگے بڑھ جاتے ہیں تاکہ اپنے مقصد کی اعلیٰ چوٹی کو چھو سکیں۔

''قحط'' ان کا ایک اور ناولٹ ہے جس میں جاگیردانہ نظام کے ظلم و جبر اور استحصال کو دکھایا گیا ہے۔ایک طرف انسان کی لالچ، مکاری، دھوکہ بازی اور مادہ پرستی کو طشت از بام پر لایا گیا ہے وہیں کہانی کے دوسرے رخ میں جاوید اور انور کی پریم کہانی کو ایک نئے انداز میں پیش کر کے کہانی کو نئے امکانات سے روشناس کیا گیا ہے۔کہانی میں سب سے زیادہ جس بات پر توجہ یا فوکس اور کہانی کا تانا بانا تیار کیا گیا ہے وہ امانت اور دیانت داری ہے۔

وحشی سعید کے ان متذکرہ ناولٹوں سے اندازہ ہو جاتا ہے کہ انہیں اردو فکشن کی شعریات پر ایک خاص دسترس حاصل ہے۔زبان و بیان میں ایک خاص قسم کی چاشنی اور دلکشی ہے۔اسلوب اور ڈکشن کا خوبصورت امتزاج انہیں اپنے معاصرین سے ممتاز کرتا ہے۔مکالمہ نگاری میں ایک اچھوتا پن دیکھنے کو ملتا ہے اور کہیں کہیں قاری بھول جاتا ہے کہ وہ ناولٹ پڑھ رہا ہے بلکہ اسے یہی گمان ہوتا ہے کہ وہ کسی فلم کا سین دیکھ رہا ہے۔لیکن مثبت پہلوں کے ساتھ ساتھ کہیں کہیں منفی پہلو بھی دیکھنے کو مل جاتے ہیں خاص طور پر اگر ہم ان کے ناولٹوں کو مقابلہ ان کی افسانہ نگاری سے کریں گے تو یہاں پر ہمیں یہ بات ماننی پڑتی ہے کہ ان کے ناولٹوں کا کینواس افسانے کے کینواس سے محدود ہے جہاں ان کے ناولٹوں میں رومانیت کا غلبہ ہے وہیں ان کی افسانوی کائنات میں موضوعات کا تنوع ہے۔ان کے ناولٹ میں معنی کی تکثیریت نہیں ہے اور کہیں کہیں ضمنی موضوعات نے ان کے ناولٹوں میں پھیکا پن پیدا کیا ہے اور جہاں تک آخری ناولٹ ''قحط'' کا تعلق ہے تو اس میں پہلے

Kashmir Treasures Collection, Srinagar

CC-0. In Public Domain. Digitized by eGangotri.

قاری کا ذہن اس بات پر تیار ہو جاتا ہے کہ اس کا تانا بانا قحط پر پھیلا ہوگا لیکن آخر پر قحط کو سرسری طور پر دکھا کر جاوید اور انور کی پریم کہانی لفظ 'قحط' پر فوقیت پا جاتے ہیں۔

بہر حال ہر سکے کے دو رخ ہوتے ہیں اور جہاں تک وحشی سعید کے ان تمام ناولٹ کے منفی پہلوؤں کا تعلق ہے تو اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ ان کے منفی پہلوؤں پر ان کی مثبت پہلو سبقت رکھتے ہیں اور جو چیز ان ناولٹوں کو جاودان رکھے گی وہ ان کی زبان اور مکالمے ہیں۔

☆ ☆

افسانچہ ۔ ۔

میں اور میری سوچ

وحشی سعید

سورج دیکھتا ہوں تو سوچتا ہوں، کاش میں بھی سورج بن جاؤں اور گھر کے آنگن میں کھلتے اَن گنت رنگ برنگے پھولوں کے درمیان اپنے آپ کو کھیلتے ہوئے دیکھوں۔ سوچتا ہوں ایک ستارہ بن جاؤں اور اپنے آس پاس، اپنے اندر باہر جگمگاتی روشنی بکھیرتا رہوں۔ سوچتا ہوں چاند کی ٹھنڈی چاندنی کا لباس اوڑھ لوں اور پہاڑوں کے دائرے میں سوئی ہوئی ڈل جھیل کو اپنا مسکن بناؤں۔ ہاؤس بوٹوں اور شکاروں کا ایک نیا اور حسین شہر بساؤں ۔ ۔ خاموش اور پُرسکون شہر۔ چنار کے درختوں کو دیکھتا ہوں تو سوچتا ہوں کہ ان کی چھاؤں میں کچھ لمحوں کے لئے سو جاؤں اور میٹھے میٹھے سندر سندر خواب دیکھوں اور اُن خوابوں میں اُس اَن دیکھی حسینہ کو اپنے درد دل کی داستان سناؤں۔ کاش میرا سوچنا میرے بس میں ہوتا۔ مجھے اپنی سوچوں پر اعتبار ہوتا ۔ ۔ میری سوچ تو کرونا وائرس کے خوف وڈر سے بے حس ہو چکی ہے اور میں بہت کچھ سوچتے سوچتے بھی کچھ نہیں سوچتا ۔ ۔ ۔ کچھ سوچ بھی نہیں سکتا ۔ ۔ ۔ !

مشہور و معروف شاعر، ادیب اور صحافی

مرحوم اظہر جاوید کا خواب

''تخلیق''

لاہور، پاکستان

جو موصوف نے ۱۹۶۹ء میں دیکھا تھا، جس کی تکمیل کے لئے مرحوم کے فرزند سونان اظہر نامساعد اور ناموافق حالات کے باوجود بھی سرگرم عمل ہیں۔ فنون، نقوش، محفل، اوراق، نیرنگ خیال جیسے رسائل وجرائد کی موجودگی میں مرحوم ۲۰۱۲ء تک جس نہج پر ''تخلیق'' کو اطمینان کے ساتھ چلاتے رہے، اُسی نہج پر سونان اظہر نے بھی آج تک اسے گامزن رکھا۔

سونان اظہر اور اراکین تخلیق

داد و تحسین کے مستحق ہیں۔

''نگینہ انٹرنیشنل'' انہیں مبارک پیش کرتا ہے۔

Kashmir Treasures Collection, Srinagar

CC-0. In Public Domain. Digitized by eGangotri.

مظفر ایرجؔ
9596255405

غزلیں

۱

یا میرے جزیرے پہ مجھے ڈھونڈنے آجائے
یا سامنا کرنا ہو تو پھر سامنے آجائے

وہ گھر میں بہت خوش ہے ہمیشہ ہی خوش رہے
برسوں سے دُعا گو ہوں کبھی دیکھنے آجائے

کس کس سے کروں شوئی قسمت کی شکایت
کوئی مجھے خوش بختیاں بھی سونپنے آجائے

ہے میرے تعاقب میں وہ آنکھوں سے ستاروں تک
اِک بار وہ حجرے میں تو سچ بولنے آجائے

میں نے سب کے آگے رکھی اپنے دل کی بات
ناقص ہے میرا سچ تو کیوں سوچنے آجائے

اس وادیٔ غرقاب میں ہو وقت کرشمہ
جو مجھ کو ڈبوئے نہ ہی خود ڈوبنے آجائے

پھیلی ہیں چار سو میری منظر کشائیاں
جیسے مغنیہ کوئی لب کھولنے آجائے

میں کتنا کھرا کتنا وضع دار ہوں اب تک
غلطی سے سہی مجھ کو کبھی جانچنے آجائے

ایسا نہ ہو کوئی شہریار بھی ایرجؔ
سونے سے ترازو میں مجھے تولنے آجائے

☆

مظفر ایرج کی غزلوں کا پیش لفظ متنوع ہے، بسیط ہے۔ اس کی وسعت اور کشادگی دیدنی ہے۔ اس کا تنوع اس کے ہم عصروں سے تمیز کرتا ہے۔

راج ناتھ رازؔ

ایک التماس

"نگینہ" کا بھرپور مطالعہ کرکے اِسے دوسروں کو بھی پڑھنے کو دیں۔ یہ اُردو ادب کے تئیں آپ کی خدمت ہوگی۔

Kashmir Treasures Collection, Srinagar

CC-0. In Public Domain. Digitized by eGangotri.

(۲)

طوطے میں سامری کے ابھی اپنی جاں نہ رکھ
خود آپ اپنے ہونے کا کوئی نشاں نہ رکھ

یوں ہو کہ یوں نہ ہو مگر یوں ہو کہ یوں نہ ہو
وہم و گماں کے پیچھے بھی وہم و گماں نہ رکھ

کل تیرا نام ہو نہ رقم بزدلوں کے ساتھ
ارجن سے یدھ کے پہلے ہی اپنی کماں نہ رکھ

جتنی مٹھاس بانٹی ہے بانٹ ہوش سے
یہ نیم کا ہے پیڑ یہاں آشیاں نہ رکھ

اب ایسا کر کہ ایک سا ہر سو دکھائی دے
سر پر کسی کے چھت کسی کے آسماں نہ رکھ

جو بولنا ہے بول مگر میٹھا میٹھا بول
منتر کدورتوں کے ہی ورد زباں نہ رکھ

جس کا نہ سر نہ پیر، نہ لیلیٰ نہ ہی مجنوں
دنیا کے سامنے اچھی داستاں نہ رکھ

یہ کیسا شہر ہے یہاں ہر سمت ہیں لاشیں
اپنوں کا دُکھ بہت ہے غم رفتگاں نہ رکھ

لُٹ پٹ کے تیری پوٹلی میں کیا بچا ایرجؔ
ان خیمہ بستیوں میں حصولِ زیاں نہ رکھ

☆ ☆

"سخن آئینہ"

مظفر ایرج کا تازہ ترین
شعری مجموعہ

رابطہ :
کہکشاں ۔ ۔ نوگام بائی پاس
سرینگر ۔ ۱۹۰۰۱۵، کشمیر

"نگینہ انٹرنیشنل"

کی کچھ کاپیاں ہر بار ڈاک سے واپس آجاتی ہیں۔ ادارہ دو بار ڈاک خرچہ اور محنت کا متحمل نہیں ہوسکتا۔ آپ سے استدعا ہے کہ مکمل پوسٹل ایڈریس آفس میں لکھوایا کریں۔

Kashmir Treasures Collection, Srinagar

CC-0. In Public Domain. Digitized by eGangotri.

کرشن کمار طورؔ
9816020854

غزل

لطف روداد نہیں ہیں جاناں
شیریں فرہاد نہیں ہیں جاناں

سچ کہیں تجھ سے بچھڑ کر ہم بھی
کوئی آباد نہیں ہیں جاناں

دے کے آواز ہمیں دیکھ تو لے
ہم ترے بعد نہیں ہیں جاناں

تو نے جو وعدے کئے تھے ہم سے
کیا تجھے یاد نہیں ہیں جاناں

تجھ سے تجدید وفا کر ڈالیں
اتنے بھی شاد نہیں ہیں جاناں

اس زمانے میں سخن گوئی کی
غم ہی بنیاد نہیں ہیں جاناں

تو جو بدلا ہے تو پھر طورؔ سے لوگ
کیسے برباد نہیں ہیں جاناں

حسن رضا اطہرؔ
09431322360

غزل

سفر شعروں کا جاری ہے — غزل ٹاٹا سفاری ہے
مرے والد مجاور تھے — مرا بیٹا مزاری ہے
چلو اب مرلیا جائے — اسی میں ہوشیاری ہے
جسے شاعر سمجھتے ہو — وہ محفل کا مداری ہے
پرندے مسکراتے ہیں — بہت مخلص شکاری ہے
میں سب کچھ لکھ نہیں سکتا — قلم کی پہرے داری ہے
اگرچہ شخصیت ہلکی — مگر دستار بھاری ہے
مرے اعمال نامے میں — بہت بے روزگاری ہے
خزاں کے زرد موسم میں — فضا بادِ بہاری ہے
کسی کی زندگی ساکت — کسی پہ موت طاری ہے
کئی شاعر پریشاں ہیں — غزل اب تک کنواری ہے
ہمارے پاس ہے لیکن — ہماری کب ہماری ہے
مرے احباب نے اطہرؔ — مری عزت اُتاری ہے

☆ ☆

Kashmir Treasures Collection, Srinagar

CC-0. In Public Domain. Digitized by eGangotri.

ذکی طارق
09818860029

غزلیں

۱

وہ جو دستک سبت تھی در پر وہ دیوانے کی تھی
ایک بے معنی سی آہٹ دل کو بہلانے کی تھی

حادثاتِ نو بہ نو سیلاب بن کر بہہ گئے
تیز بارش میں بغاوت ایک بیگانے کی تھی

نرم ٹھنڈا ریشمی سایہ مسلسل کرب تھا
دل کی خواہش دھوپ میں رہ کر سکوں پانے کی تھی

چند یادیں دفن تھیں مجھ میں کئی لاشوں کے ساتھ
جسم میں یہ خشک سی آندھی تو ویرانے کی تھی

اِک شباہت عکس میں تبدیل ہوکر رہ گئی
خلوتوں کی یہ حقیقت وہم ہو جانے کی تھی

خواب منظر آنکھ میں تحلیل ہوکر رہ گئے
بدلی بدلی رُت یہ اُس کے لوٹ کر آنے کی تھی

ایک لطفِ بے کرم تھا ساتھ میں اُس کے ذکی
اور بے کیفی کی ضد ماحول پر چھانے کی تھی

۲

شہر سے کچھ دور اِک ویران خطہ جاگتا ہے
سو چکیں آبادیاں لیکن خرابہ جاگتا ہے

دھوپ زخمی ہوچکی سائے بھی لنگڑانے لگے ہیں
ایک ساعت بجھ رہی ہے ایک لمحہ جاگتا ہے

طاق سے اُٹھتا دھواں باتوں میں ہے مصروف لیکن
عظمت رفتہ کا جب گھر میں اثاثہ جاگتا ہے

جب بھی اِک مجذوب دیوانے کی آنکھیں نم ہوئی ہیں
ایک انجانی سی وحشت سے زمانہ جاگتا ہے

گھر کے آنگن میں ہر سو خوشبوئیں بکھری ہوئی ہیں
دیکھنا یہ ہے کہ کب اُس کا دریچہ جاگتا ہے

عہد ماضی کا کفن اوڑھے زمانے سو رہے ہیں
گھر کی بوسیدہ کتابوں میں فسانہ جاگتا ہے

اے ذکی کیوں سوچ کی یلغار کو روکے ہوئے ہو
کچھ تو ہے جو آپ کے سینے میں سوتا جاگتا ہے

☆ ☆

Kashmir Treasures Collection, Srinagar

CC-0. In Public Domain. Digitized by eGangotri.

احمد نثار
840924221

غزلیں

۱

الم سے گزرا تو ذکر ملال سے بھی گیا
حریف اب تو مرا قیل و قال سے بھی گیا

خبر ہے اس کو خسارہ ہوا ہے اجرت کا
بدن چرا کے میں رزقِ حلال سے بھی گیا

اسی کے مشک کی خوشبو بکھر رہی ہے ابھی
وہ اِک ہرن جو ہمارے خیال سے بھی گیا

فرات بھر چکا مشکیزے آب سے تو کھلا
یزید نعمتِ جام سفال سے بھی گیا

کہاں پہ مجھ کو یہ لایا ہے آج رقصِ جنوں
گیا جو دشت سے چشم غزال سے بھی گیا

جہاں میں اپنے لئے راہ خوش گوار نہیں
نمود بھر مرا ماضی تو حال سے بھی گیا

۲

گردش میں در و بام زمیں بھی نہیں ٹھہرے
ہم زعم سے نکلے تو کہیں بھی نہیں ٹھہرے

مخدوش ہوئی جاتی ہے دیوار ضیافت
مہمان جو نکلے تو مکیں بھی نہیں ٹھہرے

اس شہر میں گردن مری اب کون اُتارے
تلوار کسی طور قریں بھی نہیں ٹھہرے

اب مجھ کو گرانے میں تردد نہیں کوئی
بھائی تو مرے زیرِ نگیں بھی نہیں ٹھہرے

کس نور کی بارش ہوئی ہے شاخِ بدن پر
سینے میں مرے گوشہ نشیں بھی نہیں ٹھہرے

ہم جان نثاروں کی تو ہر بات جدا ہے
جب جنگ میں اُترے تو کہیں بھی نہیں ٹھہرے

Kashmir Treasures Collection, Srinagar

CC-0. In Public Domain. Digitized by eGangotri.

مسلم نواز
8420850620

غزل

اس طرح مرے دل کو تری یاد نے باندھا
سرخاب کو جس طرح کہ صیاد نے باندھا

جو میرے پڑوسی تھے سبھی جاگ رہے تھے
اِک ایسا سماں رات کی فریاد نے باندھا

آگے نہ نکل جاؤں میں رفتار میں اس سے
جادو سے بدن کو مرے ہمزاد نے باندھا

اِک روز نکالے گئے ہم اپنے ہی گھر سے
سامانِ سفر پھر دلِ برباد نے باندھا

میں دیو کے چنگل سے جب آزاد ہوا تو
پھر مجھ کو پرستاں کی پری زاد نے باندھا

میں شاعرِ اُردو ہوں مگر کیا کروں مسلم
ہر مصرع مرے شعر کا اُستاد نے باندھا

☆ ☆

شارق ریاض
8902922805

غزل

سب کی نظروں میں مجھ کو معتبر اُس نے کیا
ذکر میرا ہر غزل میں جان کر اُس نے کیا

مدتوں وہ مجھ کو اپنا ہم سفر کہتا رہا
چلتے چلتے راہ میں پھر دربدر اُس نے کیا

وہ تو سازش رچ رہا تھا اور میں تھا بے خبر
پھر بھی میرے ساتھ رہ کر دن بسر اُس نے کیا

رہ گزارِ عشق میں جب جب ہوئی رسوائیاں
مجھ سے اُلفت کا فسانہ مختصر اُس نے کیا

دل کی اس سونی حویلی میں صدا گونجی کبھی
ذکر تنہائی میں اُن کا رات بھر اُس نے کیا

پھول خوشبو چاند تارے استعارے ہیں مگر
ان سبھی لفظوں کو میرے نام پھر اُس نے کیا

ایک دن شارقؔ تری منزل قریب آجائے گی
تجھ کو بھی کرنا پڑے گا جو سفر اُس نے کیا

Kashmir Treasures Collection, Srinagar

CC-0. In Public Domain. Digitized by eGangotri.

ضرر وصفی
9848197429

غزلیں

۱

ڈوبتے کیوں ہیں سنگ پانی پر
بلبلا بھی ہے دنگ پانی پر

صف بہ صف ہیں ملنگ پانی پر
چھڑ گئی کیسی جنگ پانی پر

تیز امواج کے تھپیڑوں سے
اِک جزیرہ ہے تنگ پانی پر

کائی جمتی ہوئی کناروں پر
لگ گیا جیسے زنگ پانی پر

آبشاروں کی نغمگی کا فسوں
بن گیا جل ترنگ پانی پر

تیز مانجھے سے جس کو کاٹا تھا
گر پڑی وہ پتنگ پانی پر

آسمانوں پہ تھی دھنک وصفی
اُس کے لہرائے رنگ پانی پر

۲

غرق لمس شباب ہیں دونوں
خیمہ بے طناب ہیں دونوں

ایک دلکش کتاب ہیں دونوں
ایک ناول کے باب ہیں دونوں

کٹ گئی زندگی گناہوں میں
مبتلائے عذاب ہیں دونوں

زندہ درگور عشق میں ہو کر
کتنے عزت مآب ہیں دونوں

ہیر رانجھے کی راہ میں حائل
جیسے راوی چناب ہیں دونوں

جب بھی دیکھا فلک سے میں وصفی
دشت و دریا سراب ہیں دونوں

☆ ☆

Kashmir Treasures Collection, Srinagar

CC-0. In Public Domain. Digitized by eGangotri.

رفعت آسیہ شاہین
9515605015

غزلیں

۱

چلتے چلتے ہم کہاں تک آگئے
اِک نئے ہی امتحاں تک آگئے

بھول جانا چاہتے تھے جن کو ہم
پھر وہ افسانے زباں تک آگئے

تھی تمنا تو بہاروں کی مگر
بخت غنچوں کا ، خزاں تک آگئے

درد کے صحرا کو طے کرتے ہوئے
آبلہ پا ہم مکاں تک آگئے

زندگی کی دھوپ سہتے روز و شب
در ، دریچہ سائباں تک آگئے

ہم اندھیروں کے مسافر نامراد
جگنو اپنے کارواں تک آگئے

آج پھر شاہین گرتے گرتے ہم
ٹھوکروں کے درمیاں تک آگئے

۲

آنسو بھی اب بہانا ذرا دیکھ بھال کے
تم چشم تر ملانا ذرا دیکھ بھال کے

ہر اِک قدم اُٹھانا ذرا دیکھ بھال کے
موسم کو آزمانا ذرا دیکھ بھال کے

خنجر چھپائے پھرتے ہیں سب لوگ اب یہاں
تم بھی گلے لگانا ذرا دیکھ بھال کے

اپنوں کی بات اور ہے غیروں کی بات اور
تم راز دل بتانا ذرا دیکھ بھال کے

کیوں بے گناہ آج سزا پا رہے ہیں یوں
تم فیصلے سنانا ذرا دیکھ بھال کے

کاغذ کی ہے پتنگ بھی ، کپڑے بھی ہیں پڑے
گھر میں دیا جلانا ذرا دیکھ بھال کے

جتنے حسین خواب تھے شاہین وہ بکھر گئے
خوابوں کو اب بلانا ذرا دیکھ بھال کے

☆ ☆

Kashmir Treasures Collection, Srinagar

CC-0. In Public Domain. Digitized by eGangotri.

ڈاکٹر آفاق فاخری
9918617576

غزل

(۱)

جو کچھ باہر ہے وہ اندر نہیں ہے
کسی منظر کا پس منظر نہیں ہے

سلامت ہے کہاں دستار اپنی
مرے شانے پہ میرا سر نہیں ہے

ہم اہل عشق کی خاطر جہاں میں
کوئی دیوار بام و در نہیں ہے

سمجھ پاؤگے کیا اوروں کے غم کو
تمہارے پاس چشم تر نہیں ہے

خدا محفوظ رکھے ہر بلا سے
مرا دل ہے کوئی پتھر نہیں ہے

یہی تو ہے خسارے کا تصور
یہاں کوئی مرا سسر نہیں ہے

ہے میرے عزم پہ پرواز میری
کہ وہ محتاج بال و پر نہیں ہے

وہاں آفاقؔ کیوں ہم سر جھکائیں
جہاں پہ تیرا سنگِ در نہیں ہے

(۲)

کبھی کبھی ہم غور کریں

کبھی کبھی ہم غور کریں
کبھی کبھی ہم اس پر سوچیں
کہ سارے مسئلے ہمارے اندر ہیں
ہمارے باہر نہیں
باہر خزاں ہو یا کہ بہار
ریگزار ہو یا گلزار
آب رواں ہو یا دیوار
اگر ہمارے اندر کے
موسم سارے درست ہوں
تو باہر کے بادسموم
اور زہریلی ہوائیں
حبس زدہ فضائیں
اُس پر چنداں
اثر انداز نہیں ہو سکتیں
کبھی کبھی ہم غور کریں

☆ ☆

Kashmir Treasures Collection, Srinagar

CC-0. In Public Domain. Digitized by eGangotri.

آمنہ نقشبندی

غزلیں

۱

میں پچھلی بارش کا ٹھہرا پانی کہ مجھ کو آتی ہے باس مجھ سے
ہے زندگی بھی خفا خفا سی ، ہے روح میری اُداس مجھ سے

نہ سانس لینے کا کوئی ذریعہ ، نہ بہہ نکلنے کا کوئی رستہ
کسے میں روداد کہہ سناؤں ملے نہ کوئی شناس مجھ سے

میں وہ وتستا ہوں جس کے تٹ پر بسے ہیں کتنے شیوخ و برہمن
اور اب یہ عالم کہ ساری بستی کے مل رہے ہیں نکاس مجھ سے

بہت کٹی ، ہے ذرا سی باقی گزر ہی جائے گی جیسے تیسے
حیاتِ رفتہ کو بھی شکایت ، حیات نو ناسپاس مجھ سے

جہاں میں ڈھونڈا سکوں تو جانا جہاں بنا ہی نہیں سکوں کو
یہ مزر عینے آخرت ہے اس میں کرے گا کیا کوئی پاس مجھ سے

میں اب تلک تھی اس بھرم میں کہ اُس کا لطف وکرم ہے مجھ پر
کھلی ہے اب جا کے یہ حقیقت کہ لے رہا ہے قصاص مجھ سے

میں اپنے بابا کے کھائے گندم کا قرض اب تک چکا رہی ہوں
ملی نہ اب تک کوئی رعایت نہ جو چھنا تھا لباس مجھ سے

۲

میں اپنے دل کی ہر ایک دھڑکن نہ جانے کیوں تم سے جوڑتی ہوں
کوئی بھی مشکل کوئی بھی اُلجھن، نہ جانے کیوں تم سے جوڑتی ہوں

تمہاری یادوں کی بھیگی خوشبو برف رُتوں میں بہار لائے
ٹھٹھرتی شامیں، مہکتا ساون، نہ جانے کیوں تم سے جوڑتی ہوں

میں چاندراتوں کی خامشی میں تمہارے قدموں کی چاپ مانگوں
ذرا سی آہٹ ہوا کی سن سن نہ جانے کیوں تم سے جوڑتی ہوں

میں خواب نگری کی سرحدوں پر تمہارا رستہ نہارتی ہوں
شفق کی سرخی، ندی کا درپن نہ جانے کیوں تم سے جوڑتی ہوں

☆ ☆

Kashmir Treasures Collection, Srinagar

CC-0. In Public Domain. Digitized by eGangotri.

حسن امام فدائی
09031815471

غزل

حرارت خون میں اپنے وہی پھر شان پیدا کر
عمر فاروقؓ سا ہر دل میں تو ایمان پیدا کر

فتح حاصل ہوئی تھی تین سو تیرہ کے جنگوں سے
تو اپنے جذبۂ دل میں وہی ذیشان پیدا کر

قضا کا خوف کیسا ایک دن مرنا تو ہے سب کو
تو راہِ حق میں جاں دینے کی خاطر جان پیدا کر

جو غازی بن کر کفاروں کی لشکر چیر کر رکھ دے
تو خالد کی طرح اس عہد میں سلطان پیدا کر

جو میری قوم رکھتی تھی رگوں میں جوش ایمانی
خدا پھر قوم مسلم میں وہی عرفان پیدا کر

صداقت کی سبھی راہیں حسنؔ کی راہ سے گزرے
یہ میری قوم میں یارب میری پہچان پیدا کر

ڈاکٹر شبنم عشائی
9797795748

(۱)

کس المیہ نے جنمی
یہ ہوا
جو زندگی کو
سانس نہیں لینے دیتی
صرف موت اُگاتی ہے
موت کے جنگل
پوری کائنات میں
خودرو گھاس سے
پھیل رہے ہیں
انسان خود میں سمٹ رہا ہے
زندگی کا دم گھٹ رہا ہے
۔ ۔ حیات کے حیرت کدہ میں
انسانوں کے بھید پڑے ہیں
کہتے ہیں
خوف خدا کا
قتل ہوا ہے ۔ ۔ ۔

☆

Kashmir Treasures Collection, Srinagar

CC-0. In Public Domain. Digitized by eGangotri.

(۲)

شامل نہ کرو
مجھے اس تماشہ میں
جس کا مقصد کچھ بھی نہیں
سوائے دکھاوے کے ۔ ۔ ۔
بس اِک ہنگامہ ہے
اور ہوں میں منجمد
کسی بھید کے انتشار میں
باران رحمت کے انتظار میں
من کا بدن جھلس رہا ہے
بھید کا سچ اُلجھ رہا ہے
۔ ۔ میں بے چہرا
من کی تسبیح پھیرتی ہوں
کہ کوئی رتن ایسا چھولوں
جو اُلجھے بھید کھل جائیں
تماشہ بند ہو جائے
اُلجھن اُلجھن سلجھ جائے

☆

(۳)

اس کا من
تمہاری بصارت ہے
زیادہ دیکھ سکتا ہے ۔ ۔ ۔
جو وہ اپنے نہ ہونے کو کافی نہ سمجھتی
تم اس کو اپنے مقابل کھڑا دیکھ سکتے ۔ ۔ !
جو وہ کسی پُر اسرار حصار میں نہ ہوتی
تم اس کو سنہرے پانیوں میں
تیرتا دیکھ سکتے
۔ ۔ لٹنے کا لطف ہو
یا ہو لطفِ بربادی
اُس کی ڈبکی
تمہارے من کی سکت سے باہر ہے ۔ ۔ ۔

☆ ☆

Kashmir Treasures Collection, Srinagar

CC-0. In Public Domain. Digitized by eGangotri.

سمیع القاسم
ترجمہ : منور حسین
9140257359

دو فلسطینی نظمیں ۔ ۔

قیدی کا خط

ماں!
مجھے دُکھ ہوا ماں!
کہ تم پھوٹ پھوٹ کر روئیں
جب دوستوں نے
میرے متعلق دریافت کیا
مگر مجھے یقیں ہے ماں
کہ زندگی کا وقار
مجھے جیل نے ہی دیا
اور مجھے یقین ہے
میرا آخری ملاقاتی
نہیں ہوگا
ایک اندھا چمگادڑ
وہ بھور ہوگی
وہ ایک نئی صبح ہوگی

ایک اسرائیلی یہودی اور ایک عرب کے درمیان گفتگو

میرے دادا جلادئے گئے تھے اپنے گاؤں میں
میری ہمدردی اُن کے ساتھ ہے، مگر میرے جسم سے
علیحدہ کرو یہ زنجیریں
تمہارے ہاتھ میں کیا ہے؟
ایک مٹھی بیج
تمہارے چہرے پر غصے کا رنگ ہے
زمین کا رنگ ہے یہ
اپنی تلوار کو بدل ڈالو پھال میں
تم نے ذرا بھی تو زمیں نہیں چھوڑی
تم ایک مجرم ہو!
میں نے کسی کو ہلاک نہیں کیا، قتل نہیں کیا کبھی
اذیت نہیں دی کسی کو!
تم ایک عرب ہو!
اللہ تمہاری حفاظت کرے، لوگوں سے پیار کرو
اور تھوڑی سی دھوپ آنے دو

☆ ☆

Kashmir Treasures Collection, Srinagar

CC-0. In Public Domain. Digitized by eGangotri.

اشتیاق سعید
9224799971

بہ رضائے صنم

بس اسٹاپ پر سناٹا تھا۔ شاید بس ابھی ابھی گئی تھی۔ اب دوسری بس آدھے گھنٹہ سے قبل نہیں آنی تھی۔ اندھیری اسٹیشن سے ملت نگر کیلئے محض دو ہی بسیں چلا کرتی تھیں۔ میں آدرش نگر کے بس اسٹاپ پر کھڑا تھا۔ مجھے اندھیری جانا تھا اور اندھیری سے ہی میرا روڈ کے لئے تین بائیس کی ویرار لوکل پکڑنی تھی۔ فی الوقت پونے تین بج چکے تھے۔ اگر پانچ سات منٹوں کے دوران بس آجاتی تو مجھے بہ آسانی مطلوبہ لوکل مل جاتی۔ غالباً اسی اضطراب میں بس اسٹاپ کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک ٹہلنے لگا تھا۔ اس دوران کئی آٹو رکشے میرے قریب سے گزرے۔ ان میں سے کئی ایک نے رفتار دھیمی کر کے میری جانب پُر امید نگاہوں سے دیکھا بھی اور مایوس ہو کر آگے بڑھ گئے۔ اسی اثنا میں قریب کی بلڈنگ سے ایک سراپا قیامت حسینہ برآمد ہوئی۔ چست جینز اور قدرے مختصر ٹاپ زیب تن کئے ہوئے تھی۔ آنکھوں پر سیاہ مگر قیمتی دھوپ چشمہ تھا۔ نفاست سے ترشی ہوئی زلفیں شانوں پر بکھری پڑی تھیں۔ سرو قد، متناسب جسم، گوراعنابی رنگ، پیروں میں خوبصورت سی سینڈل، کلائی میں سنہری رنگ کی گھڑی ۔ ۔ یوں معلوم ہوتی تھی گویا کسی مجسمہ ساز کی انمول شاہکار ہو۔۔۔ وہ عین میرے قریب آکر ٹھہر گئی۔ کلائی اُٹھا کر گھڑی دیکھی، پھر جیسے شیشہ سے شیشہ ٹکراتا ہے اُسکی آواز کھنکی۔ ''ایکسکیوزمی''

میں نے اُس شاہکار کی جانب مست مگر ملائم نگاہوں کا جال ڈالا کہ کہیں میری نگاہیں اُس کے گداز و شفاف جسم پر خراشیں نہ ڈال دیں اور نہایت ہی شائستگی سے استفسار کیا۔

'' کہیئے ۔ ۔ ''

''اندھیری کے لیے بس ۔ ۔ ؟''

'' جی ''۔ وہ اپنا جُملہ مکمل بھی نہ کر پائی تھی کہ میں نے مختصراً اُسکے سوال کا جواب دے دیا۔ پھر وہ خاموش رہی لیکن اُس کی نِگاہیں بدستور مجھ ہی پر ٹِکی رہیں۔ پہلے تو میں نے کوئی خاص توجہ نہیں دی لیکن چند لمحے بعد ہی یک بہ یک مجھے محسوس ہوا جیسے وہ میرا چہرہ پڑھنے یا کہ میرے اندرون کا جائزہ لینے کی کوشش کر رہی ہو۔۔ میں گھبرا کر فوراً دو قدم آگے بڑھ گیا۔

'' ہیلو ''

دوبارہ اُسکی کھنک دار آواز میری سماعت سے ہم آہنگ ہوئی۔ میں نے کنکھیوں سے اُس کی سمت دیکھا، اُس کے لبوں پر معنی خیز تبسّم رقصاں تھی۔ میری گھبراہٹ سوا ہوگئی، دِل ہولنے لگا کیونکہ میں بمبئی کی اِن حسین بلاؤں سے بخوبی واقف ہو چُکا تھا اور اسی آن دور سے آتا ایک تیز رفتار آٹو رِکشا کو ہاتھ دِکھا کر رُکنے کا اِشارہ دے دِیا، وہ بجائے رُکنے کے اسی تیز رفتاری سے آگے بڑھ گیا شاید اُس میں سواری موجود تھی۔

'' ہیلو سلیم ''

'' آں '' ۔ ۔ میں چونک پڑا۔ اُس کی جانب استعجابیہ نگاہوں سے دیکھا۔ وہ بدستور مسکرا رہی تھی۔

'' پہچانا نہیں؟'' پھر اُس نے شیشہ سے شیشہ ٹکرایا۔

''Sorry ۔ ۔ !''

Kashmir Treasures Collection, Srinagar

CC-0. In Public Domain. Digitized by eGangotri.

میرے لہجے میں پشیمانی در آئی تھی جبکہ وہ قہقہہ بردوش ہوگئی تھی۔

''ارے بدھو، میں ریشما ہوں ۔ ۔ ۔ جاوید بھائی جان کی سالی''

''اوہ ۔ تم!''

جاوید بھائی کا نام سُنتے ہی یادداشت کی تمام دریں یک بہ یک وا ہوگئیں

''اوہ ریشما! بائی گاڈ میں تصوّر بھی نہیں کرسکتا کہ تُم اس طرح میرے سامنے اچانک آن کھڑی ہوؤ گی اور میں تمھیں پہچان بھی نہ سکوں گا، ویسے کافی صحت مند ہوگئی ہو پہلے کی بہ نسبت ۔۔ اور پھر حُلیہ بھی تو تبدیل کرلیا ہے تُم نے ۔۔۔!''۔ وہ بجائے کچھ کہنے کے بس تبسّم کا سُر پھونکتی رہی اور میں شُدہ شُدہ اس سُر کے زیر اثر ماضی کی وسعتوں میں گُم ہوتا چلا گیا۔

جاوید بھائی میرے ماموں زاد تھے۔ مجھ سے دو سال بڑے۔ بنارس آکاش وانی پر اناؤنسر تھے۔ گھر داماد کی شرط پر بنارس ہی میں ایک متوسط گھرانے میں شادی کرلی تھی۔ جب بھی میرا بنارس جانا ہوتا میں جاوید بھائی سے ضرور ملتا، ویسے جاوید بھائی سے ملنا نہ ملنا برابر تھا لیکن عرشی بھابی کی خدمت میں حاضری ناگزیر ہوتی۔ اگر کسی سبب اُن سے بغیر مِلے گاؤں لوٹ آتا تو وہ خفا ہوجایا کرتیں۔ آئندہ ملاقات پر بات تو کُجا، گھنٹوں مُنہ پھُلائے رہتیں ۔۔ میرے لاکھ خوشامد درآمد پر بھی مجال کیا کہ اُن کی خفگی کا بُت ٹوٹ جائے! ایسے میں ریشما میرے لیے معاون و مددگار ثابت ہوتی، وہ ایسی ایسی مسخرانہ حرکتیں کرتی، ایسے ایسے لطیفے موزوں کرتی کہ گھر کے سبھی افراد ہنس ہنس کر لوٹ پوٹ ہوجایا کرتے، بھابی بے ساختہ تو نہیں مگر زیرِ لب ضرور مُتبسّم ہوجایا کرتیں ۔۔ اُن دنوں ریشما دھان پان سی الھڑ دوشیزہ تھی، باتونی تو اس قدر کہ اللہ کی پناہ ۔۔۔ بات بات پر مذاق اُس کا خاصّہ تھا، حاضرِ دماغی کا تو جواب ہی نہیں۔ خواہ موضوع کوئی ہو تبادلۂ خیال میں اُسے کوئی دُشواری پیش نہیں آتی۔ غالباً یہی وجہ تھی جو وہ مجھ سے کچھ زیادہ ہی گھُلی مِلی رہتی تھی، جبکہ میں اُسے اندر ہی اندر چاہنے لگا تھا، ممکن ہے وہ بھی مجھے چاہتی رہی ہو۔ لیکن ہم دونوں نے کبھی اپنی چاہت کا برملا اظہار نہیں کیا تھا۔

''سلیم''

''آں''۔ ریشما کی آواز پر یک لخت ماضی سے رابطہ ٹوٹ گیا۔

''کہاں کھو گئے تھے؟''

''کھویا کہاں تھا، بس یوں ہی کسی کی تلاش میں ماضی کی پُر پیچ گلیوں میں جا نکلا تھا۔

''میں بھی تو جانوں ۔۔ بھلا کون ہے وہ خوش نصیب؟'' وہ پلکیں پٹپٹاتی استعجابیہ لہجہ میں استفسار کی تھی۔

''میرے روبرو موجود ہے''۔

وہ چونک کر اپنے دائیں بائیں دیکھنے لگی تھی۔ ''ایں! یہاں تو میرے اور تمھارے علاوہ تیسرا کوئی بھی نہیں''۔

''ممکن ہے وہ تُم میں یا مجھ میں ہی کہیں موجود ہو؟''۔

''مطلب!'' وہ سراپا استعجاب ہوگئی۔

''مطلب وطلب چھوڑو اور بتاؤ کہ بمبئی کو کب سے آباد کئے ہوئے ہو؟''

''افوہ سلیم ۔۔۔ یہیں کھڑے کھڑے سب کچھ جان لوگے یا کہیں اطمینان سے بیٹھ کے ۔۔۔!''

''Why not، کیوں نہیں!'' لمحہ بھر بھی ضائع کئے بغیر میں نے پیش قدمی کی چونکہ موضوع تبدیل کرنے کا شاید اس سے نادر موقع دوبارہ ہاتھ نہ آنے کا خدشہ تھا۔

''بولو کہاں چلنا چاہو گی؟''۔

Kashmir Treasures Collection, Srinagar

CC-0. In Public Domain. Digitized by eGangotri.

''جہاں مناسب جانو''

''تو پھر ایسا کرتے ہیں اندھیری چلتے ہیں، وہیں کسی ہوٹل کے فیملی روم میں بیٹھ کر جی بھر کے باتیں کریں گے ۔ ۔ کیوں؟''

میں نے اپنے والہانہ جذبات کا بھرپور اظہار کیا لیکن وہ بجائے خوش ہونے کے کچھ سوچنے لگی۔ میں چند لمحات اُس کی سوچتی آنکھوں میں جھانکتا رہا پھر اُس سے استفسار کیا :

''کیا سوچنے لگیں ۔ ۔ ؟''

''سوچ رہی ہوں بجائے اندھیری جانے کے کیوں نہ ہم چار بنگلہ چلے چلیں؟''

''کیوں؟ وہاں کیا ہے ؟''

''وہاں میرا غریب خانہ ہے ۔۔ میں سمجھتی ہوں غریب خانے پر ہوٹل سے زیادہ سکون میسر آئے گا''

''مگر وہاں تو تمھارے شوہرِ نامدار موجود ہونگے !۔۔۔ دیکھو بھئی ریشما، تُم اور ہم برسوں بعد مِلے ہیں، میں نہیں چاہتا کہ اِن انمول لمحات میں ہمارے درمیان شوہر جیسا کوئی بے مصرف شخص مخل ہو''

وہ میرے اس اندازِ گفتگو پر بے ساختہ ہنس پڑی۔ ''اجی قطعاً نہیں، ایسے قیمتی لمحات میں تو میں خود شوہر جیسے فضول شخص کو قریب پھٹکنے تک نہ دوں ،غالباً اسی لیے انھیں شہر سے نہیں بلکہ مُلک ہی سے کھدیڑ رکھا ہے''

''کیا !''۔ فرطِ حیرت سے میرا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔

''جی! وہ ان دنوں جدہ کی کسی کنسٹرکشن کمپنی میں سول انجینئر کی حیثیت سے اپنے فرائض انجام دے رہے ہیں''

''یعنی ۔ ۔ یعنی کہ ۔ ۔ تم تم تنہا رہتی ہو ۔ ۔ ؟''

''ہاں! لیکن اب تنہا نہیں رہوں گی''

''وہ کیسے؟'' میں سراپا سوال بن گیا۔

''تُم جو مِل گئے ہو''۔ اور شرارت آمیز نِگاہوں سے مجھے یوں دیکھا کہ خواہ مخواہ میری نِگاہیں جھُکتی چلی گئیں ۔ ابھی میری نِگاہوں کی چلمن اُٹھی بھی نہیں تھی کہ اُس کی شرارت اُنگلیوں میں در آئی اور میری کمر میں اُنگلیاں کھُبا کھُبا کر گدگدانے لگی، ساتھ ہی ساتھ اپنی مترنم آواز میں گُنگُنا بھی رہی تھی ۔

تم جو مل گئے ہو تو جہاں مل گیا ہے
ایک بھٹکے ہوئے راہی کو کارواں مل گیا ہے

میں شروع ہی سے شرمیلا واقع ہوا ہوں لہٰذا شرم سے گڑا جا رہا تھا لیکن اُس پر اس کا مطلق اثر نہ تھا۔ وہ تو اچھا ہوا کہ بس آ گئی اور میں اُسے کھینچتا ہوا بس میں سوار ہو گیا۔

ایک سات منزلہ عمارت کی پانچویں منزل پر ریشما کا تین کمروں پر مشتمل خوبصورت اور کُشادہ فلیٹ تھا۔ فلیٹ میں داخِل ہوتے ہی اُس نے اعلان کر دیا کہ آج میں سارا دِن ساری رات کے لیے اُس کا مہمان ہوں، چنانچہ کہیں اور آنے جانے کے تعلق سے قطعاً نہ سوچوں، اگر کسی سے ملنا از حد ضروری ہو یا کسی سے کوئی Appointment ہو تو بذریعہ ٹیلی فون اُس سے معذرت طلب کرلوں ۔ اُس نے اس والہانہ اور پُر خلوص لہجہ میں کہا تھا کہ میں چاہتے ہوئے بھی کوئی عذر پیش نہ کر سکا تھا۔

چائے ناشتہ سے فراغت کے بعد ہم بے تکلفانہ گُفتگو میں کچھ اس قدر محو ہوئے کہ وقت کے گُزرنے کا احساس ہی نہ رہا، چونکہ وہ بے تکان بولتی رہی تھی، اپنے تعلق سے، جاوید بھائی کے تعلق سے، اپنے شوہر کے تعلق سے اور نہ جانے کن کن موضوعات پر روشنی ڈالتی رہی تھی۔ میں بھی بغیر کسی اُکتاہٹ کے اُس کی کھنکتی آواز، بولنے کا انداز ، چہرے پر اُبھرتے معدوم ہوتے تاثرات ، پلکوں کے زیر و بم اور نِگاہوں کے

Kashmir Treasures Collection, Srinagar

CC-0. In Public Domain. Digitized by eGangotri.

غمزوں سے محظوظ ہوتا رہا تھا کہ اچانک فون کی گھنٹی بج اُٹھی تھی۔ وہ یوں ہی اپنے نُطق کے شیشوں کو کھنکاتی ایک نِگاہِ غلط ٹیلی فون کی جانب ڈالی اور دفعتاً چونک کر اُٹھ کھڑی ہوئی۔

''اُف اللہ آٹھ بج گئے''۔ اُس نے ٹیلی فون کے ساتھ رکھی ٹیبل واچ دیکھ لی تھی۔ ریسیور اُٹھانے سے قبل مجھ سے معذرت چاہی اور یہ بھی بتایا کہ فون کال غالباً دہلی دربار ریسٹورنٹ سے ہے۔ واقعی کال ریسٹورنٹ ہی سے تھی۔ وہ مجھ سے کچھ پوچھے بغیر کئی پکوان کے آرڈر نوٹ کروادیے اور فون کا سِلسلہ منقطع کرتے ہی جھٹ کچن کی جانب لپکی، پلک جھپکتے ہی دو خالی گلاس، دو سوڈا واٹر کی یخ بوتلیں اور ایک وہسکی کی بوتل لیے وارِد ہوئی۔ میں چونک پڑا۔ حیرت سے میری آنکھیں پھیل گئیں۔ ''ریشما! یہ کیا!!''

وہ ٹی پائی پر تمام لوازمات قرینے سے رکھتے ہوئے قدرے رسان سے بولی۔

''یہ زندگی کی بے کیفیوں کو کیف آگیں بنانے کا نُسخہ ہے''۔

''لیکن ۔ ۔ ریشما تم ۔ ۔ ؟''

''ہاں میں!''۔ اُس نے لفظ' میں ' پر کچھ اس انداز سے زور دیا تھا گویا' میں ' واحد متکلّم نہ ہو کر بہت سے معنوں کا مُخزن ہو۔

وہ اندر کسی کمرے میں چلی گئی تھی اور مجھے اپنے آپ سے خجالت سی محسوس ہونے لگی تھی، ضمیر ملامت کرنے لگا تھا کہ مجھے ریشما سے ایسا نہیں کہنا چاہیئے تھا کیونکہ ریشما اب وہ بنارس والی ریشما نہیں رہی، وہ بمبئی جیسے میٹروپولیٹین سِٹی کی ہائی فائی سوسائٹی میں آن بسی ہے جہاں مردوزن کا شراب سے شُغل معیوب نہیں سمجھا جاتا حتّیٰ کے جِسموں کی نُمائش نیز جنسی آزادی کو مشترکہ تہذیب کا ایک حِصّہ تصوّر کیا جاتا ہے۔ ریشما جب دوبارہ کمرے میں وارِد ہوئی تو لباس تبدیل کر چکی تھی، کسا ہوا جینس اور ٹاپ اُتار کر گلابی رنگ کی جھینی سی نائٹی زیبِ تن کر لی تھی۔ غالباً چہرہ دُھل جانے کی بِناء غازہ کا اثر جاتا رہا تھا چنانچہ شباہت میں غیر معمولی تبدیلی در آئی تھی، پہلی نظر میں تو مجھ پر کسی دوسری خاتون کا گُمان غالب ہوا تھا۔ میں نے اس کا برملا اِظہار بھی کر دیا تھا اور وہ اس پر کوئی تبصرہ کرنے کی بجائے محض مُسکرانے پر اِکتفا کر لی تھی۔

رات کے کس پہر تک ہم کھاتے پیتے رہے تھے مجھے کچھ ہوش نہیں۔ ہاں! ہوش جب بحال ہوا تو دِن چڑھ آیا تھا اور ہم بستر میں یوں گُتّم گُتّھا تھے جیسے میاں بیوی۔۔! میں نے خود کو اس تیزی سے بستر سے علاحِدہ کیا گویا جِسم سے بجلی کا ننگا تار مس ہو گیا ہو۔ وہ بھی چونک کر اُٹھ بیٹھی تھی اسی آن مجھے اپنی ستر پوشی کا خیال آیا جبکہ وہ اب بھی مجھے ہوس ناک نگاہوں سے تک رہی تھی اور میں تھا کہ شرم سے گڑا جا رہا تھا۔ مجھ میں اُس سے نگاہیں ملانے کی تاب نہیں رہی تھی، لاشعوری طور پر اپنے چہرے پر کالک کا گمان ہونے لگا تھا، تنفّس میں بے ترتیبی در آئی تھی۔ وہ چند لمحات یوں ہی میری متغیّر کیفیت سے محظوظ ہوتی رہی پھر ایک ادا سے دونوں ہاتھوں کو اُٹھا کر ایک طویل انگڑائی لی اور پلک جھپکتے ہی مجھے بستر میں۔۔۔۔۔!

پھر تو میں باقاعدہ طور پر ریشما کے ساتھ اُس کے فلیٹ میں رہنے لگا تھا۔ دِن بھر اپنے روزگار میں اُلجھا رہتا لیکن شام ہوتے ہی میرے اندرون میں ایک طرح کی کشمکش جاری ہو جاتی، دِل مضطرب ہو جاتا، حلق میں چُبھن سی ہونے لگتی، لبوں میں جنبش در آتی، جِسم کسی گداز جِسم کا تعارف چاہنے لگتا۔ غرض کہ چند ہی دنوں میں میرا رگ رگ شراب و شباب کا عادی ہو گیا تھا۔

ادھر کسی وجہ سے میرا گاؤں جانا ناگزیر ہو گیا تھا مگر ریشما مجھے یوں چھوڑنے پر قطعاً تیار نہ تھی۔ حالانکہ مجھے بھی اُس کی جدائی کھل رہی تھی۔

Kashmir Treasures Collection, Srinagar

CC-0. In Public Domain. Digitized by eGangotri.

چونکہ معاملہ کچھ زیادہ ہی پیچیدہ تھا چنانچہ دِل پر جبر کرنا پڑا، ریشما نے بھی چار و ناچار دل کو سمجھا لیا اور کُرلا ٹرمینس تک مجھے الوداع کہنے آئی تھی۔

گاؤں کے معاملات نمٹانے میں مجھے مہینہ بھر کا عرصہ لگ گیا تھا۔ اس مدت میں ریشما کی جدائی دل پر شاق گزرتی رہی۔ اس دوران شاید ہی ایسا کوئی لمحہ رہا ہو جو ریشما کی طلب کے بغیر گزرا ہو۔ بہر کیف! جون ہی واپسی کا جواز بنا پہلی فرصت میں ٹکٹ ریزرو کروایا اور اسٹیشن ہی سے بذریعہ فون ریشما کو اپنی آمد کی نوید سنائی۔ وہ تو سنتے ہی مارے خوشی کے باولی ہوگئی اور فون ہی پر ایک طویل بوسہ دے ماری۔ حالانکہ اُس کے بوسے کا لمس مجھے محظوظ نہ کر سکا البتہ بوسے کے تصوّر نے ایک طرح کا غیر مانوس حظ ضرور عطا کیا تھا۔ اِن لمحات میں میری سوچیں متحرک ہوگئی تھیں کہ کاش! مواصلاتی نظام میں کچھ ایسے بھی آلات ایجاد میں آجاتے جو بوسوں اور دیگر لمس کا احساس طوالت کے باوجود ایک دوسرے کے مابین جگانے میں کارآمد ہوتے۔

کال بیل کی سوئچ پر اُنگلی کا پور مس کرتے ہوئے سارا جسم ریشما کے گداز جسم سے مس ہونے کے لیے بیتاب ہوگیا۔ دماغ نے سوچا، وہ جوں ہی کِواڑ کھولے گی اُسے بانہوں کے حلقے میں دبوچ لے گا اور اُس کے لب ہائے گُلگوں پر اپنے تشنہ لبوں کی مُہر ثبت کر کے اس طویل جُدائی کا ازالہ کرلے گا۔ دِل نے بھی تائید کی، ساتھ ہی اندر لیچ کھُلنے کی ہلکی سی کِلِک سُنائی دی۔ دِل بے اختیار ہوگیا، اندرون میں ایک سرد لہر سی دوڑ گئی، آنکھوں میں ایک عجیب سی سرسراہٹ در آئی۔ کِواڑ کُھلا، دِل جو بلّیوں اُچھل رہا تھا، یکلخت تھم سا گیا کیونکہ دروازہ پر ریشما کی بجائے ایک دراز قامت خوبرو مرد آنکھوں میں انبساط اور ہونٹوں پر دِل آویز تبسّم بکھیرے موجود تھا۔ گو میرے سارے جذبات سرد پڑ گئے تھے چہرے پر ہوائیاں اُڑنے لگی تھیں اور آنکھوں میں خفت کے سائے لہرانے لگے تھے۔ لمحہ بھر کو خیال آیا کہ کہیں غلط دروازے پر تو نہیں آگیا، لیکن اگلے ہی پل دماغ نے باور کرایا کہ دروازے پر نام کی تختی ریشما ہی کی ہے۔ ابھی اسی اُدھیڑ بُن میں تھا کہ مرد کی آواز میری سماعت سے ٹکرائی۔

''آداب عرض ہے سلیم صاحب!''

میں نے چونک کر مرد کے چہرے پر اپنی نگاہیں مرکوز کردیں۔ تبسّم اب بھی اُس کے لبوں پر رینگ رہی تھی۔

'سلیم صاحب۔۔۔ آخر غچّہ کھا گئے نا آپ؟ آیئے۔۔۔ اندر تشریف لے آیئے''۔

اور لپک کر بیگ جو میرے قدموں میں پڑا تھا اُٹھا لیا، میرے حواس بجا نہ تھے۔۔ سوچنے سمجھنے کی صلاحیت سلب ہوچکی تھی تاہم میں جھٹ اُس کے ہاتھ سے اپنا بیگ تھامتے ہوئے قدرے لجاجت سے کہا۔

''جی شُکریہ!''۔

'' اجی شکریہ کس بات کا؟ یہ تو ہمارا فرض ہے۔ ۔ ۔ ''

اس دوران اندر کچن سے ریشما کی آواز گونجی۔'' کون ہے جی؟''

''آپ کے رفیق دیرینہ جناب محمد سلیم صاحب تشریف لے آچکے ہیں''

''کیا! سلیم آگئے''۔ اور لپک جھپک یوں ہی آٹے میں سنا پُتا ہاتھ لیے فوراً دروازے پر آن پہنچی، مجھ سے نگاہیں مِلتے ہی نہال ہوگئی، میری کلائی تھام کر غالباً کھینچتے ہوئے اندر لے آئی اور مجھے صوفے پر دھکیلتے ہوئے دھم سے خود کو میرے پہلو میں گرالی۔

''بتاؤ سلیم کیسے رہے اتنے دِنوں؟ خیریت سے تو تھے نا؟ میں یاد آتی بھی تھی یا۔۔۔ وہاں کوئی۔۔؟''

وہ تھی کہ بے تکان بولے جارہی تھی اور میں تھا کہ مارے شرم کے اپنے

Kashmir Treasures Collection, Srinagar

CC-0. In Public Domain. Digitized by eGangotri.

ہی وجود میں گڑا جا رہا تھا، چونکہ وہ مرد ہمارے عین سامنے ہی کرسی پر براجمان تھا۔ میں نے ایک بار اُس کی جانب دیکھا پھر انا یاس ہی میری پلکیں جھکتی چلی گئی تھیں، احساس پر ایک عجیب سی خفت طاری ہو چلی تھی، نتیجتاً مساموں سے ننھی ننھی بوندیں اُبل پڑیں اور دیکھتے ہی دیکھتے سارا جسم پسینے سے شرابور ہو گیا۔ ریشما میری اس کیفیت سے لرز اُٹھی، فوراً نبض ٹٹولی، پیشانی پر ہتھیلی کی پُشت رکھتے ہوئے نہایت ہی اپنائیت سے استفسار کیا۔

''سلیم۔۔ جی تو اچھا ہے نا ؟''۔

''ہاں ! ۔۔۔ ذرا پنکھا کھول دو گرمی ہو رہی ہے''۔

وہ اُٹھ کر سوئچ بورڈ کی جانب لپکی تھی کہ مرد اُس کے سوئچ بورڈ تک پہنچنے سے قبل ہی سوئچ آن کر چکا تھا۔ ریشما مرد کا شکریہ ادا کرتے ہوئے دوبارہ میری جانب متوجہ ہوئی، وہ ابھی کچھ کہنا چاہ رہی تھی کہ میں اُس وجیہہ مرد کی جانب اشارہ کرتے ہوئے بول پڑا۔

''ریشما پلیز۔۔۔ محترم کا تعارف تو کرا دو''۔

''اوہ مائی گاڈ! میں بھی کیسی باؤلی ہو گئی تمھیں دیکھ کر سلیم کے تعارف کا خیال ہی ذہن سے جاتا رہا۔ ویسے ابھی تُم نے انھیں محترم کہکر خطاب کیا ہے نا؟''۔

''ہاں ! '' میں نے لاشعوری طور پر سر کو جنبش دی۔

'' تو یہ جان لو کہ آپ واقعی محترم ہیں، میرے لیے بھی اور تمھارے لیے بھی !۔۔ میرے لیے یوں کہ یہ میرے خدائے مجازی ہیں ۔۔ اور تمھارے لیے یوں کہ تمھاری عزیزہ ۔۔ تمھارے دوست کے رفیق حیات ہیں۔۔۔ مسٹر آفاق قادری !۔۔۔ میرا خیال ہے کہ آفاق کو تمھارے تعلق سے بتانے کی چنداں ضرورت نہیں کیونکہ میں نے انھیں شُدہ شُدہ سب کچھ بتا دیا ہے۔

''سب کچھ !''۔ فرطِ حیرت سے میرے لب وا ہو گئے۔

''ہاں سب کچھ!''۔ ریشما آفاق کی جانب معنیٰ خیز نگاہوں سے دیکھتے ہوئے زیرِ لب مُسکرائی۔

'' مطلب ! ''

''مطلب وہ کچھ بھی جو مجھے اِن سے نہیں کہنا چاہیئے تھا''۔ آفاق نے بہ ظاہر قدرے متانت سے کہا تھا مگر چہرے پر سنجیدگی کا ملمع زیادہ دیر قائم نہ رکھ سکا اور بے اختیار ہنس پڑا تھا۔ جبکہ میں خواہ مخواہ ہی خجل سا ہو اُٹھا غالباً ریشما نے میری خجالت کو محسوس کر لیا اور آفاق کے بے محل ہنسنے پر ناگواری کا اظہار کرتے ہوئے ہم کلام ہوئی۔

'' آفاق ۔۔۔ سلیم فی الوقت ہمارے مہمان ہیں اور مہمان نوازی کے کچھ اپنے آداب ہوتے ہیں''۔

'' کچھ کیا۔ آداب تو بہت سے ہوتے ہیں اور وہ سارے آپ ہی کو بجا لانے ہیں، چونکہ بندہ تو خود آپ کی میز بانی میں ہے ۔۔ کیوں سلیم صاحب بجا فرمایا نا ہم نے؟''۔

''بالکل ۔۔ بالکل درست فرمایا آپ نے ۔۔۔ ہر وہ شخص جو عرصۂ دراز کے بعد گھر لوٹتا ہے چند دنوں تک اُس کی حیثیت اپنے گھر میں بھی مہمان کی سی ہوتی ہے''۔

''اب بھلا بتایئے، محترمہ تو مجھے مہمان تسلیم ہی نہیں کرتیں۔ اچھا ہوا آپ آ گئے سلیم صاحب، کم از کم آپ کی صحبت میں ہم بھی اِن کی میز بانی سے لُطف اندوز ہو سکیں گے''۔

آفاق کی اس بذلہ سنجی نیز زندہ دلی سے میں قدرے متاثر ہوا، ساتھ ہی ساتھ مجھے اُس پر بے اختیار ترس بھی آیا کہ وہ ایک ایسی جنس زدہ بیوی کا شوہر ہے جو اُس کی غیر موجودگی میں ۔۔۔؟ اِن لمحات میں مجھے ریشما نہایت کریہہ اور گھناؤنی معلوم ہونے لگی تھی۔ جبکہ آفاق کی

Kashmir Treasures Collection, Srinagar

CC-0. In Public Domain. Digitized by eGangotri.

معصومیت اسکی سادہ لوحی میرے دِل میں گھر کر گئیں اور میں نے گھنٹہ بھر میں ہی اُس سے ایسی دوستی گانٹھ لی جیسے ہم برسہا برس کے دوست ہوں۔۔۔ایک دوسرے کے سُکھ دُکھ کے ساتھی!۔

آفاق کے جدّہ واپسی کا ٹکٹ جس روز میں اُس سے مِلا تھا اُس کے ساتویں دِن کا تھا اور یہ ساتوں دِن وہ میرے ہی ساتھ ساتھ رہا۔ ڈھیر ساری باتیں، ہنسی مذاق اور چھیڑ چھاڑ کرتا رہا جو کہ اُس کا خاصہ تھا۔ کئی معاملات میں اُس نے مجھے اپنا راز دار بھی کرلیا۔ لیکن اُس نے ریشما کے تعلق سے کوئی تشکیک آمیز بات نہیں کی۔ البتہ جب بھی ریشما کا ذِکر چلتا وہ بس اُس کا بکھان ہی کرتا اور ایسے میں مجھے بے حد کوفت ہوتی۔ کبھی کبھی تو ذہن جھنجھنا اُٹھتا۔۔ جی میں آتا کہ اپنے اور ریشما کے درمیان قائم ناجائز تعلقات کا راز اُس پر آشکار کردوں، لیکن میں ایسا کرنے سے معذور تھا چونکہ ایسا کر کے خود کو اُس کی نگاہوں کی بلندی سے گرانا نہیں چاہتا تھا۔

بہر کیف! وہ اپنی روانگی سے ایک روز قبل مجھے اپنے ساتھ ایک عزیز کے یہاں لے گیا۔ وہاں ہم دیر رات تک شراب سے شُغل کرتے رہے تھے پھر شراب کا لُطف دوبالا کرنے کی غرض سے آفاق کے عزیز نے وی سی ڈی پر ایک عریاں فِلم چلادی تھی۔ فِلم نے واقعی اُن دونوں کا نشہ دوچند کردیا تھا جبکہ میرا نشہ بتدریج جاتا رہا تھا۔

آفاق نے اس قدر پی لی تھی کہ اُسے فلیٹ تک لے آنے میں مجھے کافی دشواریاں پیش آئی تھیں۔ میرے لاکھ سنبھالا دینے کے باوجود وہ ایک گلی میں گر کر گھٹنوں کو زخمی کر بیٹھا تھا۔ اگر ریشما اُسے اس حالت میں دیکھ لیتی تو یقیناً اُسے صدمہ پہنچتا اور میں اُسے اس کیفیت سے دو چار ہونے نہیں دینا چاہتا تھا۔ غالباً اسی لیے ریشما کو کواڑ کھولنے کی زحمت دینے کی بجائے اپنی چابی سے لیچ کھولا اور آفاق کو اُٹھا کر ہال ہی میں صوفے پر لِٹا دیا، اُس کے جوتے کھولے۔۔۔ موزے اُتارے۔۔۔ اپنا لباس تبدیل کیا اور استنجا کی غرض سے ٹوائلٹ میں چلا گیا۔ ٹوائلٹ باتھ روم سے لگ کر ہی ریشما کا بیڈ روم تھا، اندر روشنی ہو رہی تھی اور کِواڑ بھی ادھ کھُلا تھا۔ شاید وہ اب تک جاگ رہی ہو یہ سوچ کر ٹوائلٹ سے فارغ ہونے کے بعد اُس کے بیڈ روم میں جھانک لیا۔ وہ گلابی رنگ کی نائٹی میں ملبوس بیڈ پر چاروں شانے چِت بے خبر سو رہی تھی۔ اُسے اس حالت میں دیکھ کر میں ہوش سے بیگانہ ہو گیا۔۔۔ اور۔۔۔ اور۔۔۔۔ پھر میرا ہوش اُس وقت بحال ہوا جب ریشما ایک چیخ کے ساتھ اُٹھ بیٹھی تھی، اُس کے چہرے پر ایک نامعلوم سی اُلجھن مُترشح تھی۔۔۔ لبوں پر رعشہ اُتر آیا تھا اور اُس کی استجابیہ نِگاہیں مجھے گھور رہی تھیں۔ میں اُس کی یہ کیفیت دیکھ کر سہم گیا۔

''ریشما۔۔۔ اے ریشما''۔ میرے پکارنے پر بھی وہ بدستور مجھے گھورتی رہی تھی۔

''ریشما۔۔ دیکھو میں ہوں۔۔ میں! تمہارا سلیم''۔ کہتے ہوئے ہتھیلی سے اُس کے رُخسار کو تھپتھپایا کہ اُسی آن تڑاخ سے وہ ایک زوردار طمانچہ میرے گال پر جڑ دیا اور کسی زخمی ناگن کی مانند پھنکاری:

''نکل جاؤ میرے کمرے سے۔۔ نیچ، کمینے۔۔ یہی صلہ دیا تم نے میری بھلمنساہت کا۔۔!''

اور پھوٹ پھوٹ کر رو پڑی۔ میں حیران تھا کہ آخر آج اسے ہو کیا گیا ہے، جب کہ اب تک اُس کے لئے میری پل بھر کی جدائی بھی ناقابل برداشت ہوا کرتی تھی۔ رات تو رات دن میں بھی میری قربت کو مچلا کرتی تھی۔ میرے بغیر خود کو نامکمل تصور کرتی تھی۔ یہ بات جدا کہ اُس نے اپنے شوہر کو خدائے مجازی کے درجہ سے کبھی گرایا نہیں، مگر اُس کا ایمان اُس خدا پر اتنا پختہ بھی نہیں تھا کہ صرف اُسی کی پرستش کرتی۔ وہ

Kashmir Treasures Collection, Srinagar

CC-0. In Public Domain. Digitized by eGangotri.

اُسے بت کہا کرتی تھی۔ چنانچہ بت کی پرستش بے سود ۔ ۔ !

روتے روتے جب کچھ ڈھارس بندھی تو اُس نے میرے آگے ہاتھ جوڑ لئے اور گڑگڑانے لگی :

'' مجھے معاف کردو سلیم ۔ ۔ مجھے معاف کردو، اور ہو سکے تو میری زندگی سے دور ہو جاؤ''

''آخر کیوں؟ ۔ ۔ پلیز ریشما بتاؤ کہ معاملہ کیا ہے؟''

''کچھ نہیں، بس یوں ہی''

''پھر میں تمہارے اس برتاؤ کو کیا سمجھوں ۔ ۔ ؟''

''مجبوری ۔ ۔ !''

''میں یہی تو جاننا چاہتا ہوں کہ آخر ایسی کون سی مجبوری تھی جو تمہیں ۔ ۔ !''

میرا جملہ ابھی مکمل بھی نہ ہو پایا تھا کہ ریشما نے جھٹ میرے منہ پر اپنا ہاتھ رکھ دیا اور روہانسی ہوگئی۔

''سلیم تمہیں میری قسم ہے جو تم نے آگے ایک لفظ بھی کہا''

اُس نے اُٹھ کر الماری سے ایک لفافہ نکالا اور میرے جانب بڑھا دیا :

''لو ۔ ۔ اس خط کو پڑھ لو ۔ ۔ شاید کسی حد تک معاملے کی نوعیت کو سمجھ سکو''

لفافہ ائیر میل تھا جو جدہ سے ریشما کے نام آیا تھا۔ میں نے لفافے کے اندر سے پرچہ نکالا، تہہ کھولی اور میری نگاہیں تحریروں پر پھسلنے لگیں، لکھا تھا :

''ریشما! ۔ ۔ مجھے احساس ہے کہ تم پیاسی دھرتی کے مانند تپ رہی ہو۔ افسوس کہ میں ایک ایسا بادل ہوں جس کا برسنا تو درکنار، گھٹا بن کر چھا بھی نہیں سکتا۔ پھر بھلا تمہارا گلشن حیات کیونکر شاداب ہوگا؟ کیسے پھول کھلیں گے؟ ریشما! میں نہیں چاہتا کہ تاعمر تشنگی تمہارا مقدر بنے۔ چنانچہ تم جس کسی سے ۔ ۔ ۔ ! البتہ یہ خیال رہے کہ صرف اُس مدت تک جب تک کہ پھول ۔ ۔ ۔ ''

ابھی اتنا ہی پڑھا تھا کہ ذہن میں دھمک سے ہونے لگی۔ تن بدن بے طرح کانپنے لگا اور پرچہ انگلیوں کی گرفت سے چھوٹ کر فرش پر جا گرا۔ اُسی لمحہ کھڑکی سے ہوا کا ایک جھونکا آیا اور پرچہ کو ہال کی جانب اُڑا لے گیا۔ میں نے لپک کر اُسے پکڑنا ہی چاہا تھا، لیکن ۔ ۔ لیکن میرے قدم گویا فرش پر جم چکے تھے۔ ہلنے جُلنے تک کی سکت باقی نہ رہی تھی۔ پھر نہ جانے کب تک میں یوں ہی کھڑا رہا تھا، مجھے کچھ ہوش نہیں۔ ہاں، ہوش جب بحال ہوا تو دیکھا، ریشما گھٹنوں میں سر دئے بیٹھی ہنوز سسک رہی ہے اور آفاق دروازے پر ہاتھ میں پرچہ تھامے شرمسار سا کھڑا ہے۔

☆ ☆

بے خبر ! تو جوہر آئینۂ ایام ہے
تو زمانے میں خدا کا آخری پیغام ہے
(بانگ درا سے ۔ ۔)

Kashmir Treasures Collection, Srinagar

CC-0. In Public Domain. Digitized by eGangotri.

وحشی سعید
9419012800

یہ کیسے رشتے ۔ ۔ ؟

آج وہ اکہتر سال کا ہوگیا اور پچھلے ایک سال سے خود کو بہت کمزور اور لاغر محسوس کر رہا ہے۔ ایک سال پہلے ایسی بات نہیں تھی۔ وہ نہ ہی کمزور تھا اور نہ لاغر۔ ایک ہی سال میں ایسا ہوگیا۔ ایک سال پہلے وہ علی الصبح جاگتا تھا اور غسل خانے سے فارغ ہوکر چہل قدمی کے لئے نکلتا تھا۔ چہل قدمی کرتے کرتے وہ اپنی کالونی کی پاس والی پارک میں پہنچ جاتا تھا۔ وہاں اُس کو ایک خوبصورت کتا ملتا تھا۔ وہ کتا اُس کو اپنا دوست بنانا چاہتا تھا۔ لیکن اُس کو کتوں کے ساتھ سخت نفرت تھی، حالانکہ وہ جانتا تھا کہ کتا سب سے وفادار جانور ہوتا ہے۔ کتوں سے اُس کی نفرت کی وجہ یہ تھی کہ بچپن میں ایک پاگل کتے نے اُسے کاٹا تھا اور اُسے چودہ انجکشن لگانے پڑے تھے ۔ وہ کافی دنوں تک بیمار رہا تھا۔ وہ واقعہ اُسے یاد ہے۔

وہ ہر دن پارک کے اردگرد چکر لگاتا تھا اور پھر وہاں پہ لگے ہوئے ایک بینچ پر بیٹھتا تھا۔ کالونی میں چہل قدمی کرنے والے دوسرے لوگ اس کی خیریت وغیرہ پوچھتے تھے ۔ یہ سب ایک سال پہلے کی بات ہے۔ پارک میں چہل قدمی کے بعد وہ اپنے فلیٹ میں واپس آتا تھا۔ اُس کی بیوی ڈائننگ ٹیبل سجانے میں مصروف ہوتی تھی۔ آملیٹ، روٹی، چائے سب کچھ ٹیبل پر لگا ہوا ہوتا تھا۔ وہ مسکراتے ہوئے ڈائننگ ٹیبل کی کرسی پر بیٹھتا تھا۔ پھر دونوں اکٹھے صبح کا ناشتہ کیا کرتے تھے۔ یہ سلسلہ پچھلے بیس سال سے چلا آرہا تھا، جب سے وہ سرکاری ملازمت سے سبکدوش ہوا تھا۔ اس سے پہلے نوکری کی بھاگ دوڑ کے سبب وہ اتنے آرام سے ناشتہ نہیں کرتا تھا، لیکن اب تو آرام ہی آرام تھا۔

نیلما پینسٹھ سال کی ہوگئی تھی ۔ اب وہ بوڑھی اور ضعیف دِکھ رہی تھی ۔ اُس نے کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا :

''پارک میں سوم ناتھ تو نہیں ملا ۔ ۔ ؟ اپنے کسی آدمی کو بھیجتا، غسل خانے کی ایک پائپ لیک ہوگئی ہے''

اُس نے مزید کہا :

''آج کی رات بھی آرام سے نہیں کٹی۔ معدے میں اب پہلے سے زیادہ درد محسوس ہو رہا ہے۔ ڈاکٹر کے پاس جانا ہوگا''

''نیلما! ۔ ۔ تم کچھ زیادہ ہی فکرمند ہوگئی ہو۔ کبھی کبھی گیس کی وجہ سے بھی معدے میں درد ہوتا ہے۔ آج ایم آر آئی کی رپورٹ آرہی ہے۔ کل ڈاکٹر سے ملنے جائیں گے''

نیلما نے کہا :

''ٹھیک ہے۔ لاجونتی ابھی تک نہیں آئی۔ میں بہت کمزوری محسوس کر رہی ہوں۔ ڈاکٹر کو اس کے بارے میں ضرور بتانا ہوگا''

یہ سب ایک سال پہلے ہوا تھا۔

وہ واپس اپنے فلیٹ میں پہنچ گیا۔ آج بھی فلیٹ میں سب کچھ ویسے ہی تھا۔ ہر ایک چیز اپنی اپنی جگہ پر تھی۔ ٹیبل اپنی جگہ پر تھا، کرسیاں بھی اپنی جگہ پر تھیں۔ کتابیں سلیقے سے ریک پر رکھی گئی تھیں۔ ٹی وی بھی اپنی جگہ پر تھا۔ فلیٹ کی اندورنی سجاوٹ بھی پہلے ہی جیسے تھی۔ نیلما نے جس انداز سے چیزوں کو رکھا تھا، سب کچھ ویسے ہی تھا۔ اب کچن کی صفائی مطلوب تھی۔ لاجونتی کے آنے کی دیر تھی تاکہ وہ کچن صاف کرے اور

Kashmir Treasures Collection, Srinagar

CC-0. In Public Domain. Digitized by eGangotri.

کھانا پکا کر فرج میں رکھے۔

کمل نے ایک کپڑا ہاتھ میں لیا اور نیلما کی کرسی جو کہ پہلے سے ہی صاف تھی، اُسے مزید صاف کرنے لگا۔ یہی ایک کام وہ خود کرتا تھا۔ یہ کام کرنے کے بعد وہ رام اور سیتا کی مورتی کے سامنے کھڑا ہوتا تھا۔ اگربتی اور دیا جلاتا تھا۔ دونوں ہاتھ جوڑ کر اور آنکھیں بند کر کے پوجا کرتا تھا۔

لاجونتی آگئی۔ اُس نے کمل سے کہا :

''بابو جی! آپ ٹھیک ہیں ۔ ۔ ؟''

''ہاں میں ٹھیک ہوں۔ ایک چائے کا کپ دے دو''

لاجونتی بولی :

''بابو جی! ڈاکٹر صاحب کے پاس چیک اپ کے لئے جایئے''

کمل نے لاجونتی کی طرف دیکھا اور بڑی نرم آواز میں کہا :

''جاؤں گا''

سوا سال پہلے کی بات تھی، منگل کا دن تھا اور دن کے دو بجے تھے۔ کمل کا موبائل بج اُٹھا۔ فون ڈاکٹر موہن کا تھا۔ وہ کمل سے کہہ رہے تھے :

''کمل! آپ کو دن کے چار بجے مجھ سے ملنا ہے، اکیلے آیئے گا۔ نیلما بھابی کے آنے کی ضرورت نہیں ہے''

منگل کا دن تھا اور سہ پہر کے چار بجنے والے تھے۔ کمل کو محسوس ہو رہا تھا کہ جیسے کوئی بھیانک زلزلہ آنے والا ہے۔ اُسے لگ رہا تھا جیسے زمین گھوم رہی ہے۔ اُس کو اپنا یقین ڈگمگاتا ہوا لگ رہا تھا۔ ان ہی حالات میں ڈاکٹر موہن کمل سے نہایت ہی مایوسی کے ساتھ مخاطب ہوا :

''کمل! ۔ ۔ نیلما بھابی کے معدے میں کینسر ہے''

کمل نے چیخ کر کہا :

''Oh No ڈاکٹر ۔ ۔ !''

اُس نے مزید کہا :

''ڈاکٹر صاحب! کیا کوئی اُمید ہے ۔ ۔ ؟''

ڈاکٹر موہن بولے :

''کینسر ایڈوانس اسٹیج میں ہے۔ صرف تین چار مہینے کی فرصت ہے''

کمل بڑی افسردہ حالت میں فلیٹ پہنچا۔ نیلما نے پانی کا گلاس اُس کے سامنے رکھا۔ کمل نے اُس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیا :

''ڈاکٹر نے کہا، سب کچھ ٹھیک ہے۔ ہاں کچھ دوائیاں لکھ دی ہیں''

تین مہینے پہلے اُن دونوں نے اپنے بیٹے اکھلیش کے ساتھ فون پر بات کی تھی۔ کمل نے اپنے آپ سے کہا :

''اکھلیش کو سب کچھ بتانا پڑے گا''

اُس نے دیر رات گئے پریشانی کی حالت میں شکاگو امریکہ فون ملایا۔

اکھلیش نے فون اُٹھایا :

''ارے بابو جی! میں آپ کو فون کرنے ہی والا تھا۔ آپ کے لئے خوشخبری ہے۔ میں نے ڈائلیسس سینٹر کھولا ہے۔ انڈین کمیونٹی کے بہت سے لوگ آئے تھے۔ ہمارے علاقے کا میئر بھی آیا تھا ۔ ۔ ۔ ''

اکھلیش بولے جا رہا تھا۔ پھر اچانک اکھلیش رُک گیا اور بولنے لگا :

''بابو جی! ۔ ۔ آپ نے کیسے فون کیا؟ اماں کیسی ہیں؟ ۔ ۔ ذرا اُنہیں فون دیجئے''

کمل نے اپنی آواز میں ضبط لاتے ہوئے کہا :

''بیٹا! ۔ ۔ تمہاری ماں سو گئی۔ میں صبح اُس کو خوشخبری دوں گا۔ بہو اور بچے کیسے ہیں؟''

اکھلیش نے اپنے باپ کی بات کو کاٹتے ہوئے کہا:

''بابو جی! اماں اور آپ شکاگو آیئے۔ وہاں کیا رکھا ہے؟''

Kashmir Treasures Collection, Srinagar

CC-0. In Public Domain. Digitized by eGangotri.

کمل نے کہا :

''بیٹا! تمہاری اماں کی طبیعت ٹھیک نہیں رہتی ہے''

اکھلیش نے جواب دیا :

''آپ آجایئے۔ یہاں اماں کا اچھے سے اچھے اسپتال میں علاج کرائیں گے''

کمل کچھ کہہ نہ پایا۔ وہ صرف اتنا بول سکا :

''اکھلیش تمہاری زندگی کا اہم دن ہے۔ کل بات کریں گے''

فون ڈراپ ہوگیا یا ہینگ ہوگیا یا کاٹا گیا۔

آج کمل زندگی کے دشوار کن حالات سے گزر رہا تھا۔ اچانک وہ اکھلیش کے بچپن میں چلا گیا۔ اکھلیش اُن کا اکلوتا بیٹا تھا۔ وہ بچپن میں شرارتی تھا، لیکن پڑھنے لکھنے میں قابل تھا۔ ہمیشہ اپنے کلاس میں اوّل آتا تھا۔ اُسے میڈیکل کے مضامین میں خاصا لگاؤ تھا۔ اس وجہ سے اُس نے بارہویں جماعت میں نوے فیصد نمبرات لے کر شاندار کامیابی حاصل کی۔ وہ ڈاکٹری کے انٹرنس ٹیسٹ میں بڑی آسانی سے کامیاب ہوا۔

پانچ سال کے بعد اُس نے ایم بی بی ایس کا امتحان امتیازی نمبرات کے ساتھ پاس کیا۔ اُسے شکاگو یونیورسٹی سے ایک خط موصول ہوا، جس میں اُسے وہاں ایم ایس کی ڈگری حاصل کرنے کے لئے دعوت دی گئی تھی۔ اُس جیسے قابل طلباء کے لئے یونیورسٹی کی طرف سے وظیفہ بھی مقرر تھا۔ پھر بھی وہاں جانے اور رہنے کے لئے بہت پیسوں کی ضرورت تھی۔

کمل نے اپنا سنگل بیڈروم والا فلیٹ بینک کے پاس گروی رکھا۔ اُس کی ماں نے اپنے سارے سونے کے زیورات بیچ دیے اور اس طرح اکھلیش شکاگو پہنچ گیا۔

شکاگو اکھلیش کو راس آگیا۔ وہ وہاں کی زندگی اور کلچر میں گھل مل گیا۔ ایم ایس کی پڑھائی کا آخری سال تھا۔ ایک دن اُس نے اپنی ماں کو فون کیا :

''اماں! ۔ ۔ مجھے ہندوستانی فیملی کی ایک خوبصورت لڑکی ملی''

نیلما نے پوچھا :

''ٹھیک ہے۔ شادی کرنے کا ارادہ کب ہے ۔ ۔ ؟''

اکھلیش نے جواب دیا :

''شادی ہوگئی ۔ ۔ ! میں شادی کی ویڈیو بھیج رہا ہوں۔ بابو جی کو بھی دکھانا''

اُس دن کمل اور نیلما کا دل ٹوٹ گیا۔ اکھلیش کے ماں باپ ہر دوسرے دن اُس کو فون کیا کرتے تھے۔ اُس دن سے دونوں کئی کئی دنوں بعد اُسے فون کرتے تھے اور آہستہ آہستہ فون پر ملاقاتوں کا سلسلہ کافی کم ہوگیا۔

نیلما کو جب معلوم ہوا کہ اُس کے زندگی کے دن اب گنتی کے رہ گئے ہیں۔ آنسو بھری آنکھوں کے ساتھ اُس نے کمل سے سوال کیا :

''کیا اکھلیش آئے گا ۔ ۔؟''

کمل نے جواب دیا :

''اکھلیش نے ڈائلیسس سینٹر کھولا ہے، وہ اب کافی مصروف رہتا ہے

نیلما غم ناک آواز میں بولی :

''ماں تو ماں ہوتی ہے ۔ ۔ !''

کمل نے دلاسہ دیتے ہوئے کہا :

''میں رات کے دس بجے اکھلیش کو فون لگاؤں گا''

اُس رات جب کمل نے اکھلیش کو فون ملایا تو اُس نے بہت دیر کے بعد فون اُٹھایا۔

Kashmir Treasures Collection, Srinagar

CC-0. In Public Domain. Digitized by eGangotri.

''بابو جی نمسکار! ۔ میں نے اور پریتما نے اپنے جان پہچان والوں اور دوستوں کو ڈائلیسس سینٹر کھولنے کی خوشی میں ایک دعوت رکھی ہے۔ اماں کو میرا نمسکار کہنا''

یہ کہہ کر اُس نے فون رکھ لیا۔

اُس دن کے بعد کمل نے اکھلیش کو کبھی فون نہیں کیا اور نہ ہی نیلما نے اکھلیش کے ساتھ بات کرنے کی ضد کی۔

وہ رات بہت لمبی تھی۔ اُس رات کی صبح کا سورج بادلوں میں چھپ گیا تھا۔ نیلما چلی گئی۔ اب نیلما کو گئے ہوئے ایک سال ہو گیا تھا۔ لاجونتی گھر کی صفائی کرتی تھی۔ کھانا تیار کر کے اپنی گھر کو چلی جاتی تھی۔ اور کمل حسب معمول اپنے کمزور جسم کو کھینچتے ہوئے کالونی کے پارک میں چلا جاتا تھا۔ کچھ دیر کے لئے وہاں کے سیمنٹ کے بینچ پر بیٹھتا تھا۔ وہ سفید رنگ کا خوبصورت کتا اُس کے سامنے بیٹھتا تھا۔ کمل کے دل میں کتوں کے لئے جو نفرت تھی، اب وہ ہمدردی میں بدل گئی تھی۔ اب وہ ہر دن اپنے ہاتھ میں بسکٹ لاتا تھا اور اس خوبصورت کتے کو کھلا دیتا تھا۔ کتا اُس کے پاؤں اور ٹانگوں کو چاٹتا تھا۔ اب وہ کتا اُس کا دوست بن گیا تھا۔ یہ روز کا معمول تھا۔ لیکن اچانک وہ کتا غائب ہو گیا۔ اُس نے پارک کے چوکی دار سے پوچھا :

''وہ کتا کہاں گیا ۔ ۔ ؟''

چوکی دار بولا :

''کتا پارک میں آنے والوں کو تنگ کرتا تھا۔ میونسپلٹی والوں نے اُس کو ڈاگ یارڈ میں رکھا ہوگا''

کمل چوکی دار پر برس پڑا۔

چوکی دار بھی واپس بولا :

''آپ مجھ پر کیوں برس رہے ہیں۔ کتے کے ساتھ اگر اتنی محبت ہے تو آپ ڈاگ یارڈ جا کر اُس کو لے آیئے اور اپنے گھر میں رکھئے ۔ ۔ ۔ ۔ !''

کمل نے اُسی وقت گاڑی لی اور ڈاگ یارڈ چلا گیا۔ وہاں کے انچارج سے بولا :

''آپ نے ہماری کالونی سے ایک کتا اُٹھایا ہے۔ وہ آپ مجھے دیجئے۔ میں اُسے پالنا چاہتا ہوں''

انچارج کچھ دیر کے لئے کمل کو تکتے رہ گیا۔ پھر سرد آواز میں بولا :

''سر وہ کتا کل رات دیر تک روتا رہا اور پھر اچانک زور زور سے بھونکنے لگا۔ صبح ہوتے ہوتے سو گیا اور ہمیشہ کے لئے سو گیا''

کمل نے اپنے آپ سے کہا :

''کتا بھی چلا گیا''

کتے کی موت کے دوسرے دن شہر بھر میں موسلا دھار بارش ہو رہی تھی۔ لاجونتی فلیٹ دیر سے پہنچی۔ جب اُس نے فلیٹ کے تالے میں چابی لگائی اور دروازہ کھولا تو ٹی وی آن تھا۔ کمل ٹی وی کے سامنے والی کرسی پر بیٹھا تھا۔ اُس کا چہرہ پرسکون تھا۔ لاجونتی چیخ پڑی۔

''بابو جی ۔ ۔ ۔ !''

کمل خاموش ہو گیا تھا۔ وہ اپنے واحد دوست کے بچھڑنے کا غم برداشت نہ سکا۔

☆ ☆

Kashmir Treasures Collection, Srinagar

CC-0. In Public Domain. Digitized by eGangotri.

ڈاکٹر شاہد جمیل
9430559161

تہی دست

بے نظیر کو دفن کر کے بیشتر اصحاب قبرستان سے ہی جا چکے تھے۔ کچھ لوگ گھر تک آئے اور اجازت لے کر لوٹ گئے۔ چند رشتے دار کرسیوں پر بیٹھے نوٹ بندی کے اثرات پر گفتگو کر رہے تھے۔ شجاع الدین والد کے ساتھ کتراتا نظریں چراتا گھر میں داخل ہوا اور سیدھے اپنے کمرے میں جا کر بستر پر لیٹ گیا۔

آنگن میں بیٹھیں چند عورتیں محو گفتگو تھیں۔ جتنے منہ اُتنی باتیں، قیاس آرائیاں، سبھی معاملے کی تہہ تک پہنچنا چاہتی تھیں۔ جنید کی اماں خجل تھیں کہ اُن کے ہاتھ نیم پختہ ثبوت بھی نہیں لگا تھا۔

سالم بہو کو اپنی گزشتہ تذلیل کا بدلہ چکانے کا موقع ہاتھ لگ گیا۔ وہ استہزائیہ لہجے میں بولی :

''جنید کی اماں! ۔ ۔ آج تو آپ بھی پھس''

وہ خشمگیں نگاہوں سے اُسے گھورتے ہوئے بولیں :

''چپ رہو! ۔ ۔ ابھی تم اس قابل نہیں ہوئی کہ بڑوں کے درمیان بیٹھو، بولو۔ تلے اوپر بچے جن کر کوئی خود کو بھلے ہی تجربہ کار کہہ لے، لیکن ہوتی نہیں۔ میں نے دھوپ میں بال سفید نہیں کئے ہیں، بچی۔ میں اُڑتی چڑیا کے پر گنتی ہوں۔ کیوں اُتاولی ہو رہی ہو؟ ابھی میں نے ہاتھ نہیں کھینچا''

بات کا رُخ بدلتے دیکھ کر سنجیدہ بیگم بولیں :

''فرقان کے ابا کہہ رہے تھے، میکے والوں نے بڑھ چڑھ کر پیسے کو پانی کی طرح بہایا ہے''

''زچہ بچہ کے موت کیسے ہوئی، یہ بھی بتایا ہوگا ۔ ۔ ؟'' ۔ ۔ ماہ پارا نے پوچھا۔

سنجیدہ بیگم ابرو کو کمان سا بنا کر بولیں :

''ماں زیادہ خون نکلنے سے مری ہے۔ آپریشن میں کوئی نس کٹ گئی تھی۔ چڑھایا خون تین چار گھنٹے میں بہہ نکلتا تھا۔ بچہ دو گھنٹے میں ہی چٹ پٹ ہو گیا تھا۔ ایک تو وہ آٹھ ماسو تھا اُس پر دل میں سراخ ۔ ۔ نہ بچے کو ماں کا دودھ نصیب ہوا اور نہ ماں بیٹے کو دیکھ پائی''

جنید کی اماں بولیں :

''مجھے تو معاشقے کی بو مل رہی ہے۔ بھلا چنگا، گبرو، عاشق علی کا عین شادی کے دن مرنا اور نیم پاکر قبرستان کو چھوڑ کر مراد پور قبرستان میں اس کا دفنایا جانا مجھے ہضم نہیں ہو رہا ہے''

تلے اوپر بچے جننے کا طعنہ سنتے سنتے سالم بہو عاجز آ چکی تھی۔ وہ بیٹی کو چھاتی سے لگائے یہ سوچنے لگی، کسی کو کیا پتہ کہ وہ تلے اوپر بچے جننے کے لئے مجبور کی جاتی ہے۔ اُسے ہر بار جان گنوانے کا دھڑکا لگا رہتا ہے۔ اس بار تو وہ مرتے مرتے بچی ہے۔ خیراتی (سرکاری) اسپتال کی ڈاکٹرنی نے اُنہیں سمجھایا اور مجھے یوٹرس کینسر کا خوف دلایا تھا تو وہ ہر بار نکلتے دانت پیس کر بولے تھے :

''چڑیل! ۔ ۔ میں تیری چال سمجھ گیا۔ ڈاکٹرنی سے کہلواتی ہے۔ بڑے لوگ کیا جانیں پیڑ پرائی، جن کے عیش موج کے سو سادھن۔ ہم مزدوروں کا یہی ایک منورنجن ہے۔ تھکا جسم اور تھک کر راحت پاتا ہے''

جب کبھی وہ آنا کانی کرتی، تب وہ گالیاں بکتا اور لات گھونسے چلانے لگتا ہے۔ ہڈی تڑوانے سے بہتر ہے پلپلا سی بن جانا کہ وہ ریل انجن

Kashmir Treasures Collection, Srinagar

CC-0. In Public Domain. Digitized by eGangotri.

سا سیٹی بجا تا دندنا تا گزر جائے۔

سنجیدہ بیگم نے فخریہ لہجے میں کہا :

مجھے تو یہ بھی معلوم ہے کہ اسے عاشق علی کے بائیں پہلو میں دفنایا گیا ہے''

سالم بہو کے خیالوں کی کڑی ٹوٹ گئی، تب وہ غور سے باتیں سننے لگی۔

ماہ پارہ فیصلہ کن لہجے میں بولی :

تب تو جنید کی اماں کا شک یقین میں بدل گیا''

سنجیدہ بیگم قدرے لہک کر بولیں :

وہ بچے کو بھی دیکھ چکے ہیں۔ ہٹا کٹا گورا چٹا تھا''

''شکل وصورت کس سے ملتی جلتی تھی، یہ بھی بتانا ہوگا ۔ ۔ ؟'' ۔ ۔

جنید کی اماں نے فوراً پوچھا۔

''یہ پوچھنا تو بھول گئی'' ۔ ۔ سنجیدہ بیگم کف افسوس ملنے لگیں۔

''ایک فرقان بھائی ہیں جو رتی رتی بات بیوی کو بتاتے اور ایک یہ ہیں کہ گھما پھرا کر بھی ٹوہ لینا چاہوں تو بڈے کی طرح کانٹے دوڑتے۔ بیوی کو پیر کی جوتی سمجھتے۔ اُس وقت بھی حکم چلاتے جس وقت مرد گھگھیاتا اور منتیں کرتے تھکتا۔ کاش میں بھی موٹی رقم اور ٹرک بھر جہیز لے کر آئی ہوتی'' ۔ ۔ ماہ پارا کا رشک بے قابو ہو کر منہ سے کود پڑا۔

سنجیدہ بیگم کی تیوری چڑھ گئی۔ وہ ناک بھوں چڑھا کر بولیں :

''کیا میں جہیز کے بل پر بیاہی گئی ہوں؟ نہیں یہ سچ نہیں ہے اور یہ بھی افواہ ہے کہ میں اُن سے عمر میں بڑی ہوں۔ سچ یہ ہے کہ میں نے تین خوبصورت بیٹے جن کر اُن کا دل جیت لیا اور شادی کے بعد ہی گھر کی حالت سدھری ہے۔ وہ کلرک سے افسر بنے اور زمین خرید کر مکان بنوایا۔ بس وہ قائل ہو گئے کہ یہ سب میری قسمت سے ہوا''

''اُن کی اماں کا کیا خیال ہے؟'' ۔ ۔ ماہ پارا نے مٹھی بھر نمک چھڑکا۔

سنجیدہ بیگم بُرا سا منہ بنا کر بولیں :

بڑھیا ایک نمبر کی جلن کٹی ہے۔ پانچ بیٹیوں پر ایک بیٹا جنا ہے۔ اسی لئے وہ کہتی ہے، بیٹے طوطا چشم ہوتے، شادی ہوتے نظر پھیر لیتے۔ بیٹیاں بُرے وقت میں کام آتی ہیں۔ وہ اکثر سر میں تیل مالش کے بہانے بیٹے کے پہلو میں بیٹھی اِدھر اُدھر کی گپیں ہانکتی اور میرے خلاف کان بھرتی رہتی ہے۔ بے چاری کو پتا نہیں بیٹا ہر بات مجھے بتا دیتا ہے''

اسی سال حج کر کے لوٹیں سبکدوش ڈپٹی کلکٹر نور جہاں کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا۔ وہ کمرے سے نکل کر بولیں :

''میت والے گھر کو بھی چوپال بنا دیا ہے تم لوگوں نے۔ کیوں دوسروں کے گھر آنگن میں تاکتی جھانکتی اور ٹوہ لیتی پھرتی ہو؟ معلوم نہیں کہ غیبت کرنا مرے بھائی کے گوشت کھانے جیسا ہے''

پھٹکار سنتے ہی سب کو اپنے اپنے گھر کے کاموں کی یاد آ گئی اور محفل از خود برخاست ہو گئی۔ پھر ہوا، آنگن میں پڑے جوٹھے کاغذی کپ اور گلاسوں سے کھیلنے لگی۔

چالیسویں کے بعد شجاع الدین کے لئے کئی رشتے آئے لیکن والدہ نے یہ کہہ کر ٹال دیا کہ میرے لعل پر پہاڑ سا غم ٹوٹا ہے۔ گرم توے کو بھی ٹھنڈا ہونے میں وقت لگتا ہے۔ ماں ہوں نا، میں جلے پر نمک نہیں چھڑک سکتی۔ دوسری بار آئے گا، تب میں اُس کا دل ٹٹولوں گی۔

دمام واپسی کے سفر میں تہی دست شجاع الدین کے ذہن میں یادیں، ساون کی گھٹاؤں کی طرح چھانے لگیں۔ اُس نے آنکھیں موند لیں، پھر بھی گزرے ایام مجسم و متحرک ہو گئے۔ اُسے لگا کہ وہ سوچ نہیں رہا ہے بلکہ لیزر شو میں گزشتہ واقعات کو دیکھ رہا ہے۔

ڈاکٹر مریم کے چیمبر سے نکل کر اُس نے لاش حاصل کر کے اُسے گھر

Kashmir Treasures Collection, Srinagar

CC-0. In Public Domain. Digitized by eGangotri.

بھیج دیا۔ پھر وہ سیدھے قبرستان گیا تھا۔ گورکن کو ہدایت دے کر وہ تجہیز و تکفین کا سامان لئے گھر پہنچا تو ابا، امی کمرے میں بیٹھے دبی زبان میں باتیں کر رہے تھے۔ وہ ٹھٹھک کر دروازے پر کھڑا ہو گیا تھا۔ ابا سمجھا رہے تھے :

''دفن کے بعد سنجو ہمیں سب کچھ بتا دے گا''

''پہلے کیوں نہیں؟'' ۔ ۔ امی نے بھڑک کر پوچھا تھا۔

''کیا تم یہ چاہو گی کہ میت پڑی رہے، لوگ کانا پھوسی کریں اور طرح طرح کی افواہ اُڑائیں؟''

''میں نے ایسا کب کہا؟ بس مجھے اعتراض ہے مراد پور قبرستان میں عاشق علی کے پہلو میں دفن پر۔ لوگوں کو خواہ مخواہ باتیں بنانے کا موقع مل جائے گا، گھما پھرا کر پوچھیں گے اور کیچڑ اُچھالیں گے۔ سماج کھانا، کپڑا، مکان اور تحفظ نہیں دیتا۔ پھر بھی اُسے حق حاصل ہے سوال پوچھنے کا، راز جاننے اور حقہ پانی بند کرنے کا۔ لوگوں کا منہ بند کرنے کے لئے جواز جاننا ضروری ہے''

امی کی باتوں کو دلیل کی قینچی سے کترنا آسان نہیں تھا۔ ابا نے فوراً آزمودہ حربہ اپنی قسم کا استعمال کر دیا تھا۔ امی کی ضد جھاگ کی طرح بیٹھ گئی تھی اور لاش کی بے حرمتی نہیں ہوئی۔

اذیت دہ یادوں سے نجات پانے کے لئے شجاع الدین نے پردہ سرکا کے کھڑکی سے باہر دیکھا۔ ہر سو تاریکی کا سامراج تھا اور خاموش فضا میں نقب لگاتی انجن کی آواز۔

نیند آنکھوں سے غائب تھی اور سفر لمبا۔ وہ خوشگوار ماضی میں پناہ تلاش کرنے لگا۔ اچانک اُس کے ذہن میں بچپن مجسم ہو گیا۔ وہ اکثر نسیم بھائی کے ساتھ آبی پرندوں کے شکار پر جاتا تھا۔ کشتی کی سیر میں اُسے بڑا لطف ملتا۔ اُس کے ذہن میں ایک شکار کا فوٹیج رواں ہو گیا۔

اُس دن نشانہ سادھنے سے قبل اچانک پرندے اُڑ گئے تھے۔ نسیم بھائی خشمگیں نگاہوں سے اُسے گھورتے ہوئے بولے تھے :

''یہ کیا ۔ ۔ ؟ پانی سے ہاتھ نکالو۔ تمہاری وجہ سے شکار اُڑ گیا''

وہ اکثر اپنی ناکامی کا سہرا فوراً کسی کے سر باندھ دیتے۔ پانی سے ہاتھ نکال کر اُس نے اوپر دیکھا تھا۔ اُسے لگا تھا کہ پرندے شکر گزار نظروں سے اُسے دیکھ رہے ہیں۔ پھر اُس نے پیچھے مڑ کر دیکھا تھا۔ کشتی اضافی لہریں پیدا نہیں کر رہی تھی۔ وہ افسردہ ہو گیا تھا۔ کشتی پر نیم دراز ہو کر پانی میں لہریں پیدا کر کے اُنہیں دیکھنا اُسے اچھا لگتا ہے۔ کبھی کبھار کوئی مچھلی ہتھیلی سے ٹکرا جاتی یا پھر انگلی کو چارہ سمجھ کر ٹھوکر مارنے لگتی۔

وہ سنبھل کر بیٹھ گیا تھا۔ ملاح لگی کو کشتی پر رکھ کر بے آواز چپو مار رہا تھا۔ کشتی جل لمبھی کے درمیان پہنچی۔ تب وہ انہیں پکڑ پکڑ کے کھینچنے لگا تھا۔ وہ کشتی کو اُسی طرح آگے سرکا رہا تھا جس طرح چوڑی بارن سخت کلائی میں چھوٹے سائز کی چوڑیاں سرکاتی ہے۔

شکم سیر پرندوں کا ایک جھنڈ لنڈ منڈ درخت پر بیٹھا تھا۔ اُن میں کچھ پروں پر روغن مل کر خود کو سنوار رہے تھے۔ چند بازو میں منہ ڈالے سونے اور دو چار پھنگی پر محتاط بیٹھے تھے۔ نسیم بھائی چیتے کی طرح شکار سے قریب تر ہو رہے تھے اور وہ اللہ سے اُن کی خیر کی دعائیں مانگتے مانگتے پرندوں کو بے آواز ہدایت دینے لگا تھا :

''ہش، ہش ۔ ۔ اُڑ جا ۔ ۔ اُڑ جا ۔ ۔ ہش، ہش''

لبیلی دبانے سے قبل پہرے دار چڑیا نے مخصوص آواز نکالی۔ سبھی پرندے اُڑ گئے۔ نسیم بھائی نے غول پر دنادن دو فائر کئے۔ فائرنگ کی آواز سنتے ہی آس پاس کے پرندے بھی اُڑ گئے۔ محتاط پرندوں نے جگہ بدل لی اور خوفزدہ اُڑتے رہے۔ بہت دیر تک ہم لوگ مارے مارے پھرے۔ بھوک پیاس کی شدت اختیار کرنے لگی تھی۔ کھانے کا وقت

Kashmir Treasures Collection, Srinagar

CC-0. In Public Domain. Digitized by eGangotri.

بھی نکلا جا رہا تھا۔ پھر بھی کسی نے کھانے پینے کا ذکر تک نہیں کیا تھا۔ نسیم بھائی کے اجداد جاگیردار تھے۔ وراثت میں اُنہیں جاگیرداری نہیں، جاگیردارانہ سوچ، شوق اور غصہ کچھ زیادہ ہی مل گیا تھا۔

ایک کم عمر کارندے کو پرندوں کا ایک جھنڈ نظر آیا۔ اُس نے پھُسپھسا کر اشارے سے نسیم بھائی کو دکھایا تھا۔ وہ مسرور تھا کہ مالک خوش ہو کر اُسے بھی ایک شکار دیں گے۔ چڑیاں شکاری کشتی دیکھ کر اُڑی تھیں۔ پھر بھی اُن کا حکم صادر ہوا تھا :

''کودو ناؤ سے اور تیر کر گھر جاؤ''

وہ سہا ہوا رحم طلب نظروں سے اُنہیں دیکھنے لگا تھا، تب اُنہوں نے ملاح کو ۔ ۔ لہجے میں کہا تھا :

''اسے ندی میں پھینک دو''

اُس نے گھبرا کر مینڈک کی طرح چھلانگ لگائی تھی۔ کشتی پلٹتے پلٹتے بچی۔ تب نسیم بھائی نے اُس پر بندوق تان لی تھی۔ نشانے کی زد میں خود کو دیکھ کر وہ جان بچانے کے لئے بار بار ڈبکی لگانے اور جلدی جلدی ہاتھ پاؤں مارنے لگا تھا۔ نسیم بھائی کو ہنستے ہوئے دیکھ کر ہم لوگ بھی ہنسنے لگے تھے۔ تناؤ کی گانٹھ ڈھیلی پڑتے اُس نے نسیم بھائی کے سامنے جلدی سے دسترخوان لگا دیا تھا۔

واپسی کا سفر خاموشی بھرا تھا۔ کارندے سہمے ہوئے تھے کہ وہ اپنی ناکامی کی بھڑاس کسی پر بھی نکال سکتے تھے۔ گھر پہنچتے نسیم بھائی نے مرغا پکڑنے کا فرمان جاری کیا تھا۔ شکاری دستے کو اُس مہم میں لگایا گیا تھا۔ دن کے وقت مرغا پکڑنا آسان نہیں ہوتا۔ دو بار اُسے پنجہ مار کر مرغا فرار ہوا۔ تب انہوں نے خشمگیں نگاہوں سے اُسے گھورتے ہوئے وہاں ایک تیز طرار لڑکے کو تعینات کر دیا تھا۔ مرغیاں بھی اِدھر اُدھر بھاگتی ہوئی ''کٹ کٹ کٹاس'' کی صدائیں بلند کرنے لگی تھیں۔ پالتو کتے اور چند تماش بین بھی دھڑ پکڑا بھیان میں از خود شامل ہو گئے تھے۔ اُس رات پانچ مرغے اپنی جان گنوا کر دسترخوان کی زینت بنے تھے۔

کھانا کھاتے ہوئے اُس کے دل میں یہ خیال آیا تھا کہ کسی کو نرغے میں لے کر خوش ہونا، اُس پر تشدد کرنا یا پھر تشدد کے شکار کا ویڈیو بنا کر اُسے وائرل کرنا حیوانی جبلت کی تسکین ہے۔ اسی سبب آج صوبائی، ملکی و عالمی سطح پر جاری ظلم و تشدد، موب لنچنگ اور نسل کشی کے وائرل فوٹیج کو لوگ دیکھتے اور شیئر کرتے ہیں۔

ایر ہوسٹس کے اعلان سے شجاع الدین ماضی کی وادی سے لوٹ آیا۔ اُس نے ایک ہم سفر جوڑے کو دیکھا۔ دوشیزہ کا حسن و شباب دلکش تھا، لیکن مرد عمر میں بڑا اور کم شکل تھا۔ وہ اُس کے کندھے پر سر رکھے سو رہی تھی۔ زیوروں میں جڑے نگوں سے نور پھوٹ رہا تھا۔ اُدھ کھلے گریبان سے اُس کے حسن کا غرور جھانک رہا تھا۔ اُس نے سوچا کہ عورت سمندری اتھاہ ہوتی اور سینے میں بہت کچھ چھپائے رکھتی ہے۔

اُسے لگا کہ بے نظیر کا حسن واقعی توبہ شکن اور اس کا وجود گلاب کی پنکھڑی پر ٹھہری پُر نور شبنم سا تھا۔ بولتی، سحر آگیں آنکھیں، نازک و متناسب جسم، قربان ہونے کی تمنا جگاتے ہلالی ابرو، پیاس بجھا کر بھی تشنہ لبی بخشنے والے گداز ہونٹ اور خفیف مسکان سے ڈمپل بنا کر گفتگو کرنے کی دلکش ادا کہ جی چاہے وقت تھم جائے اور گفتگو کا وقفہ ترنگ کی طرح دائرہ بڑھاتا رہے۔ شدت جذبات سے مغلوب ہو کر شجاع الدین نے آنکھیں موند لیں، تب اُسے لگا کہ تلخ یادوں کی تپتی ریت پر اُسے اِیر ڈراپ کرایا گیا ہے۔ پھر بھی وہ ماضی کی بادِ صرصر کو جھیلتا ہوا چلنے لگا۔

ابا کو وراثت میں شرافت اور خستہ حال پشتینی مکان ملا تھا۔ اُس وقت پرائمری اسکول ٹیچر کی زندگی ٹم ٹم سوار کی طرح ہچکولے کھاتے، ضرب بچاتے اور توازن برقرار رکھتے گزرتی تھی۔ انہیں ریٹائرمنٹ بنی فٹ

Kashmir Treasures Collection, Srinagar

CC-0. In Public Domain. Digitized by eGangotri.

کل جمع پانچ لاکھ چودہ ہزار روپے ملے تھے۔ ایک لاکھ قرض کی ادائیگی میں ختم ہوگئے۔ موقعے کا فائدہ اُٹھا کر امی نے دباؤ بنا کر مینو (منیرہ) کے لئے ایک لاکھ باون ہزار کے زیورات خرید لئے اور صغرا پھوپھی نے بیٹی کی شادی کا دعوت نامہ دے کر ایک لاکھ بطور قرض حسن مانگ لی تھی۔ ابا کی اُداسی مہنگائی کی طرح روز بروز بڑھنے اور خاموشی، موسم سرما کے سائے سا طویل ہونے لگی تھی۔ وہ راہ چلتے ہوئے نہ جانے کون سا حساب انگلیوں پر جوڑتے ہوئے بدبداتے۔ امی کو بیٹیوں کی شادی کی فکر شدت سے ستانے لگی تھی اور وہ ابا کا ہاتھ بٹانے کے لئے بی اے کی ڈگری سنبھالے نوکری کی تلاش میں دن بھر دفاتر کے چکر کاٹنے لگا تھا۔

صلاح الدین عید کی چھٹی میں دمام سے گھر آیا ہوا تھا۔ وہ اُس کا ہم جماعت تھا۔ گھریلو حالات کے سبب وہ کالج میں داخلہ نہیں لے سکا تھا۔ وہ اُمید لے کر اُس سے ملنے گیا تھا۔ اُس کی روداد سن کر اُس نے کہا تھا :

''تم ارجنٹ پاسپورٹ بنوالو۔ میری کمپنی میں ہیلپر کی جگہ خالی ہے۔ میں اکثر ایک دو ویزے ساتھ لاتا ہوں۔ اس بار معراج بابو (بہنوئی) کو ساتھ لے جا رہا ہوں، تم بھی چلو۔ اللہ بڑا رزاق ہے۔ پڑھے لکھے ہو، جلد ہی سپروائزر بن جاؤ گے''

وہ پاسپورٹ بنوانے مشہور ایجنٹ بھیم سے ملا تھا۔ وہ آدمی بڑا پروفیشنل اور اونچی پہنچ والا تھا۔ اُس نے بیبا کی سے جعلی ڈگری اور ڈپلوما کا بھی آفر دیا تھا۔ اُس کا آفر اس نے قبول نہیں کیا تھا کہ اُتم سنسکار آدمی کو غربت میں بھی باندھ کر رکھتے ہیں۔ اگرچہ وہ بھی کئی لوگوں کو جانتا ہے جو سیفٹی افسر، مکینک اور پلمبر بنے موٹی رقم کما رہے ہیں۔

اللہ نے ہجرت میں برکت چھپا رکھی ہے۔ سچ مچ اچھے دن آگئے۔ دو تین سال میں سپروائزر بنا اور سات سال میں گھر کی حالت بدل گئی۔ مکان کی شکل وصورت بدل گئی۔ چھت پر ایک ہال اور دو کمرے بنے۔ آرائش وزیبائش کے سامان خریدے گئے اور مینو کی شادی دھوم دھام سے ہوئی۔

مینو کی شادی کے بعد اُس کے لئے رشتوں کی جھڑی سی لگ گئی تھی، لیکن امی چاہتی تھیں کہ زینو (ظہیرہ) کے بعد ہی اُس کی شادی ہو اور ابا کا خیال ہے کہ رشتے آرہے ہیں اور وہ بھی دو ماہ کی چھٹی پر آیا ہوا ہے، اس لئے بہتر ہے کہ ایک بیٹی گئی تو دوسری لے آئیں۔

اُمید کا سورج طلوع وغروب ہوتا رہا۔ دباؤ میں امی نے کئی لڑکیوں کو دیکھا۔ لیکن انہیں ایک بھی پسند نہیں آئی۔ چھٹی ختم ہوگئی اور وہ نامراد اس عزم کے ساتھ لوٹا تھا کہ زینو کی شادی سے قبل وہ گھر نہیں جائے گا۔

ایک دن اُس کی ملاقات صلاح الدین سے بینک میں ہوگئی۔ وہ بھی منی ٹرانسفر کرنے آیا تھا۔ واپسی میں اُس نے کہا تھا :

''یار! بہت ہوگیا اوور ٹائم۔ خوب کما چکے۔ اب شادی کرلو ورنہ میری طرح پچھتاؤ گے۔ گھر کی حالت سدھارتے، بہنوں کی شادیاں اور بھائی، بہنوئی کو سیٹ کرتے آدھی عمر کٹ گئی۔ اب میں تنہا لیٹ میرج کا خمیازہ بھگت رہا ہوں''

''یار! میں بھی سعادت مند بیٹا ہوں۔ زینو کی شادی کے بعد یا ایک ساتھ ہوگی'' ۔ ۔ اس کا کرب لہجے میں گھلا ملا تھا۔

قہقہے لگاتے ہوئے اُس کی پیٹھ پر وہ ڈھول جما کر بولا تھا :

''یار! ہم لوگ کماؤ پوت ہیں۔ گھر والوں کے لئے نوٹوں سے بھرا اے ٹی ایم۔ اُس کی شادی بھی اُس وقت طے کی گئی تھی جب لوگوں نے گھر والوں کا جینا حرام کر دیا تھا۔ سعادت مندی بڑی قیمت وصولتی ہے یار ۔ ۔ !'' ۔ ۔ اُس کا کندھا تھپتھپا کر وہ آگے بڑھ گیا تھا۔

Kashmir Treasures Collection, Srinagar

CC-0. In Public Domain. Digitized by eGangotri.

اُس رات تھکان کے باوجود اُسے گہری نیند نہیں آئی تھی۔ کڑوا سچ نہ جانے کب تک پیرمنٹ کی طرح ذہن میں سنسناتا رہا۔ اتفاق سے چند ماہ بعد ہی ایک ارجنٹ رشتے کا آفر آیا تھا۔ لڑکی کے والد نے ابا کی موجودگی میں بیٹی دکھایا تھا۔ مینو اور امی خاموش رہیں۔ ابا کو یہ رشتہ معقول لگا۔ انہوں نے فی الفور اپنی رضامندی کا اعلان کر دیا تھا۔ امی کسمسا کر رہ گئی تھیں۔ زینو نے فون پر اُسے پوری روداد سنائی تھی۔ ابا نے وٹس ایپ پر شادی کی طے شدہ تاریخ اور دو ماہ کی چھٹی لے کر گھر آنے کی ہدایت کے ساتھ لڑکی کا فوٹو اور دو منٹ کا ویڈیو فوٹیج مینو سے Send کروایا تھا۔

اُس کی شادی بھی دھوم دھام سے ہوئی تھی۔ شب زفاف میں بے نظیر کو دیکھ کر وہ قائل ہو گیا تھا کہ وہ سچ مچ بے نظیر ہے اور صبر کا پھل میٹھا ہوتا ہے۔ حسن کے سحر، جسم کی طلب اور شدت جذبات سے مغلوب ہو کر وہ اُس کے قرب و جسم سے محظوظ و لطف اندوز ہونے لگا تھا، لیکن وہ قیدی چڑیا کی طرح وحشت زدہ تھی اور وہ یہ سمجھ کر نہال تھا کہ یہ دوشیزگی کی حیا اور پہلی ملن کا حجاب ہے۔ یہ اَن چھوئی اُس کلی سی ہے جو ہوا کے لمس سے بھی کانپنے لگتی ہے۔ لاجونتی کی طرح سمٹنے اور جسم چرانے کی ادا نے اُسے بے قابو کر دیا تھا۔ وہ امرلتا کی طرح چھانے لگا۔ تب اُس نے خفیف مزاحمت کے بعد آنکھوں پر بازو رکھ جسم کو ڈھیلا چھوڑ دیا تھا۔ کئی دنوں تک اُسے اپنی عجلت پر ہنسی آتی رہی اور پہلے ہی شاٹ پر رَن آؤٹ ہونے کا شدید ملال بھی ہوتا رہا۔

دو ماہ کا عرصہ دو پل سا گزر گیا تھا۔ واپس آ کر اُس نے اس خیال سے اوور ٹائم کا وقفہ بڑھا دیا کہ امی کی اُداسی اور خدشہ جلد از جلد ختم ہو جائے۔ اس بار صرف ابا اُسے اِیرپورٹ تک چھوڑنے آئے تھے۔ وہ اُس کے کندھوں پر ہاتھ رکھے چل رہے تھے۔ شفیق لمس پا کر اُس کا جی چاہنے لگا تھا کہ وہ اُن کے سینے سے لگ کر اُس بچے کی طرح پھوٹ پھوٹ کر روئے جس کا محبوب کھلونا گم ہو گیا ہو۔ آخری حد پر پہنچ کر اس نے کہا تھا :

''ابا! میں سب کچھ بتا دینا چاہتا ہوں''

وہ اُسے سینے سے لگا کر پیٹھ سہلاتے ہوئے بولے تھے :

''نہیں سجو! اب کسی کو کچھ بھی نہیں جاننا۔ تم بھی اپنا دل چھوٹا مت کرو۔ بیٹا! وقت ہر زخم بھر دیتا ہے۔ بیوی کے بغیر جوانی کاٹی جا سکتی ہے، بڑھاپا نہیں۔ جب اور جہاں بے نظیر کا بدل مل جائے، تم اُسے جیون ساتھی بنا لینا۔ نہ جانے میری پسند کو کس کی نظر لگ گئی''

پھر وہ بازو پکڑے اُسے جی بھر کے دیکھنے لگے تھے۔ جب آنکھیں نمناک ہونے لگیں تب وہ اُس کی پیشانی کا بوسہ لے کر ''اللہ حافظ'' کہہ کر تیزی سے مُڑ گئے تھے۔ وہ بھی نم آنکھوں سے اُنہیں دیکھتا رہا، لیکن اُنہوں نے پلٹ کر اُسے نہیں دیکھا تھا۔

اچانک ہم سفر حسینہ بیدار ہو گئی۔ پھر اُس نے توبہ شکن انگڑائی لے کر اُس شخص کے رخسار پر بوسہ ثبت کر کے کہا :

''مائی ڈیر! کتنا سوتا ہے''

شجاع الدین ماضی سے لوٹ کر اُسے دیکھنے لگا۔ تب اُس نے نمائشی ادا سے اُس کا سر سینے پر رکھ کر آنکھیں موند لیں۔ اُسے لگا کہ اس کا پیار اور سمرپن بھی چھلاوا ہو سکتا ہے۔

پردۂ ذہن پر از خود سلائڈ بدل گیا۔ شجاع الدین کی آنکھوں میں بے نظیر کی بے بسی اور پژمردہ چہرہ رقص کرنے لگا۔ آئی سی یو میں آنکھیں موندے پڑی بے نظیر پلکوں کو اُس وقت وا کرتی جب کوئی شناسا آواز اُس کی سماعت سے ٹکراتی یا پھر وہ کسی کا شفیق لمس محسوس کرتی۔ اُسے جب کبھی لگتا کہ وہ اُس سے کچھ کہنا چاہتی ہے، تب وہ جھک کر اُس کے

Kashmir Treasures Collection, Srinagar

CC-0. In Public Domain. Digitized by eGangotri.

ہونٹوں سے کان سٹا کر کہتا :

''بولو نا بے نظیر! ۔ ۔ میں سن رہا ہوں''

وہ پوری قوت لگاتی، تب اُس کے لب پھڑ پھڑاتے۔ وہ منہ سے نکلتی ہواؤں میں تحلیل الفاظ کو لپکتے اور ہونٹوں کی جنبش کو ذہن میں محفوظ کرنے لگتا۔ عدم ترسیل سے دکھی ہو کر وہ آنکھیں موند لیتی۔ پھر آنسو کا ریلا بہہ نکلتا۔ وہ آنسو پونچھ کر آنسو پیتا ہوا باہر نکل آتا اور گرفت میں آئے مبہم و بے ربط الفاظ کو چن چن کر وہ جملے بناتا، اُنہیں معنی پہناتا۔ پھر ہونٹوں کی جنبش سے اُنہیں میچ کرانے لگتا۔

اُس رات اُس کی ہتھیلی کو گرفت میں لے کر اُس نے پوچھا تھا :

''بے نظیر! ۔ تم یہی کہنا چاہتی ہو نا کہ تم میری ساتویں پسلی نہیں ہو''

اُس نے جلدی جلدی دو بار ہتھیلی دبا کر آنکھیں موند لی تھیں۔ اُس کا ذہن مفلوج ہو گیا تھا۔ وہ لڑکھڑاتا ہوا باہر نکلا اور دھم سے بینچ پر جا بیٹھا تھا۔ تیسرے پہر ایک نرس نے اُسے جگا کر کہا تھا :

''آپ میرے ساتھ چلیں''

وہ اُسے ڈاکٹر مریم کے چیمبر میں چھوڑ کر نکل گئی تھی۔ ڈاکٹر ایک رپورٹ کا بغور معائنہ کر رہی تھی۔ تھوڑی دیر بعد وہ رپورٹ کو پرے رکھ کر بولی

''میں آپ کو آف دَ کارڈ یہ جانکاری دے رہی ہوں کہ آپ کی وائف نے سوسائڈل اسٹیپ لیا ہے۔ اُس نے ٹانکا توڑ کر خون بہا دیا۔ شی اِز نومور''

شجاع الدین چیخ پڑا :

''نہیں ۔ ۔ !''

ہوائی جہاز کے عملے ہائی الرٹ پوزیشن میں آ گئے۔ سوتے اونگھتے ہم سفر گھبرا کر اُسے وحشت زدہ نظروں سے دیکھنے لگے۔ ایر ہوسٹیس نے جلدی سے پانی کا بوتل کھول کر اُسے پکڑا دیا۔ شرمسار شجاع الدین کا دل کچوٹنے لگا۔ وہ کف افسوس ملنے لگا کہ اُسے ابا کو یہ بتا دینا چاہئے تھا کہ بے نظیر اور عاشق علی کا عشق مثالی ہے اور وہ بھی رقیب نہیں۔

☆ ☆

ہوٹل شہنشاہ پیلس

بلیوارڈ، ڈلگیٹ سرینگر

جہاں چوبیس گھنٹے ہم آپ کی مہمان نوازی کے لئے

حاضر ہیں

اپنی کشمیر آمد پر ہمیں ضرور یاد رکھیں

اور خدمت کا موقعہ دیں

دیگر تقاریب کے لئے بھی ہمارا اسٹاف

ہمیشہ مستعد رہتا ہے۔

ہم آپ کو خوش آمدید کہتے ہیں

استدعا!

برائے مہربانی اپنی تخلیقات کی فوٹو اسٹیٹ کاپیاں نہ بھیجا کریں، اُن کو پڑھنے میں بڑی دُشواری آتی ہے۔ اپنی تخلیقات صاف اور خوشخط بھیجا کریں تا کہ ہمیں کمپوزنگ کے وقت کوئی دقت نہ آ جائے۔

Kashmir Treasures Collection, Srinagar

CC-0. In Public Domain. Digitized by eGangotri.

ڈاکٹر علی عباس امیدؔ
09200846045

گھروں میں بنتے مکان

آٹھ ماہ قبل اُس کا تبادلہ ہوا تھا اور ہمارے دفتر میں اُس کی پوسٹنگ ہوئی تھی۔ وہ بہت ہی زندہ دل اور بے حد خوش مزاج انسان تھا۔ کام کرنے میں بھی اتنا ماہر تھا کہ لوگ اُس کا موازنہ کمپیوٹر سے کرنے لگے تھے۔ اعلیٰ افسران تو اُس کی مثال دینے میں ہچکتے نہیں تھے۔ وہ کبھی بھی اپنا کام نامکمل نہیں رکھتا تھا۔ اکثر ہنسنے ہنسانے کے ساتھ وہ اپنے ساتھیوں کے کام میں بھی اُن کی مدد کرتا تھا۔ چونکہ ہم دونوں کی ٹیبل قریب تھی اس لئے مجھ سے کچھ زیادہ ہی قربت تھی۔ اُس نے رہائش کے لئے جو مکان لیا تھا وہ میرے گھر کے راستے میں ہی پڑتا تھا لہٰذا اکثر ہماری واپسی ساتھ ہی ہوا کرتی تھی۔ کبھی کبھی ہم آس پاس گھومنے کے لئے نکل جاتے تھے۔ اس کی گفتگو کا زیادہ حصہ اپنے گھر والوں کے متعلق ہوتا تھا۔ اُس کی باتوں سے صاف ظاہر ہوتا تھا کہ اُسے اپنے اہل وعیال سے بے انتہا لگاؤ ہے اور اُن سے الگ رہنا اُس کے برداشت سے باہر ہے۔

ایک شام دفتر سے لوٹتے ہوئے ہم دونوں ایک کیفے میں بیٹھ گئے۔ اُس نے بتایا کہ مسلسل گھر سے الگ رہنے کی وجہ سے اسے نہ صرف تنہائی کا شدید احساس ہونے لگا ہے بلکہ ایک طرح کی ذہنی اذیت بھی اس پہ غالب ہوتی جارہی ہے۔ میں نے مشورہ دیا کہ وہ چند دنوں کی چھٹی لے کر گھر والوں سے مل آئے۔ اُس نے کہا کہ وہ بھی یہی سوچ رہا ہے۔

مہینے کے آخر میں وہ چھٹی لے کر ہفتے بھر کے لئے اپنے گھر چلا گیا۔ واپس آیا تو مطمئن دکھا اور حسب معمول کام میں لگ گیا۔ اس کی خوش مزاجی اور کارکردگی پہلے ہی کی طرح تھی۔ مجھے خوشی ہوئی کہ گھر کے تعلق سے اُس کی بے چینی ختم ہوگئی۔ ہمارے دن پہلے جیسے ہی گزرنے لگے۔ چند ماہ بعد اُس نے بتایا کہ آئندہ ہفتہ وہ اپنے گھر جارہا ہے تاکہ گھر والوں کو یہاں لانے کا پروگرام بنا سکے۔ وہ چلا گیا۔ ساتھ کام کرنے والوں کو اُس کی کمی کا احساس ہونے لگا تھا۔ اس کی وجہ تھی اُس کی خوش مزاجی اور محنت۔ چھٹیاں ختم ہونے پر وہ لوٹ آیا لیکن اس بار وہ کچھ مضمحل تھا۔ میں نے سوچا کہ سفر کی تھکان مزاج پر بھاری پڑی ہوگی۔ نوکری تو بہرحال نوکری ہے، وہ کام میں لگ گیا۔ اس کی کارکردگی تو بدستور تھی مگر مزاج میں کچھ فرق ضرور آگیا تھا۔ زندہ دلی پر سنجیدگی حاوی ہونے لگی تھی۔ چونکہ میرا ساتھ زیادہ رہتا تھا اس وجہ سے میں یہ بدلاؤ زیادہ محسوس کررہا تھا، لیکن چاہتے ہوئے بھی میں پوچھنے کی ہمت نہ کرپایا۔

یہاں پوسٹنگ کے دو سال پورے کرنے کے بعد وہ تیسری بار اپنے گھر گیا تھا۔ اس بار نہ جانے کیوں چھٹیاں ختم ہونے کے پہلے ہی وہ لوٹ آیا۔ مجھے بے حد حیرانی ہوئی کہ گھر کے لئے بے چین رہنے والا کیوں تنہائی اور ذہنی اذیت کو دانستہ قبول کررہا ہے۔ میں نے پوچھنا مناسب نہ سمجھا اور سلسلہ حسب سابق چلتا رہا۔ کام میں کوئی فرق نہ آیا، ہاں یہ ضرور ہوا کہ اب میرے علاوہ آفس کے تمام ساتھی بھی اس کی خاموشی اور اُداسی کو محسوس کرنے لگے تھے۔

Kashmir Treasures Collection, Srinagar

CC-0. In Public Domain. Digitized by eGangotri.

اُس دن ہمارے پاس کام کچھ زیادہ تھا۔ ہم دونوں کام میں مصروف تھے۔ دفتر کا وقت تمام ہونے کے کافی دیر بعد ہم باہر نکلے۔ تھکان کو زیر کرنے کے خیال سے میں نے قریبی چائے خانہ میں چلنے کی تجویز رکھی۔ وہ خاموشی سے میرے ساتھ چل پڑا۔ چائے پیتے ہوئے میں نے ہمت کر کے اُس سے پوچھا :

''اس بار تم چھٹیاں ختم ہونے کے پہلے ہی گھر سے واپس آگئے۔ اب بالکل خاموش رہنے لگے ہو۔ دفتر کے ساتھیوں میں بھی تمہاری اُداسی شدت سے موضوعِ گفتگو بن گئی ہے۔ آخر اس کی وجہ کیا ہے؟''

وہ خاموش رہا، پھر گیلی آنکھوں سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا :

''اب آپ سے کیا چھپانا۔ گھر پر بیوی کے علاوہ ایک بیٹی اور ایک بیٹا ہے۔ پہلی بار جب میں گیا تھا تو بیوی نے کہا کہ بیٹی کا امتحان ہے اور بیٹے کو کسی ملازمت کے لئے انٹرویو دینا ہے۔ دوسری دفعہ میرے پہنچنے پر بیوی نے بتایا کہ بیٹی ضد کر رہی ہے کہ یہیں پڑھے گی اور بیٹا یہاں رہ کر ملازمت ڈھونڈنے پر مصر ہے۔ بچوں کی ضد کو بیوی سے تقویت مل رہی تھی۔ میں نے اُسے سمجھایا کہ یکجا رہنے پر اخراجات میں کمی تو ہوگی ہی اور فکر مند ہونے سے بھی بچیں گے۔ پھر میں چلا آیا۔ اس بار جب میں پہنچا تو گھر کا تصور پارہ پارہ ہوگیا تھا۔ میں جن کے بغیر بے چین رہتا ہوں اُن کا عالم یہ تھا کہ بیٹی اور بیٹے کو تو شاید یہ احساس ہی نہیں ہوا کہ میں اُن کے بیچ ہوں اور بیوی کا زیادہ تر وقت ٹی وی اور موبائل کے ساتھ گزرتا تھا۔ ایک بار جب میں نے خود ہی دبی زبان میں اُس سے بات کی تو وہ بولی :

''ہم لوگ یہیں رہیں گے۔ یہ سب کے لئے بہتر ہے''

اس کے جواب نے مجھے حیران کر دیا۔ کیا اپنے ہی گھر والوں کے لئے میں اتنا اجنبی ہوگیا ہوں کہ میرے ساتھ رہنا بھی اُنہیں گوارا نہیں! کیا میرے جینے کا مقصد صرف نوکری اور اُن کی پرورش ہے۔ آپ ہی بتائیں۔

میں کیا بتاتا۔ میرا حال تو اور بھی بدتر تھا۔ گھر والوں کے ساتھ رہتے ہوئے بھی بیگانہ تھا۔ چوبیس گھنٹوں میں صرف دو لفظ ناشتہ اور کھانا سنتا تھا۔ پورا جملہ اُسی وقت سننے کا موقع ملتا جب اُنہیں مجھ سے کوئی کام ہوتا۔ میں اپنے ہی گھر میں مسافروں جیسی زندگی بسر کر رہا تھا۔ دیر تک ہم دونوں سر جھکائے بیٹھے رہے، پھر بجھے دلوں سے چلنے کے لئے اُٹھ گئے۔

ہم ہوٹل میں داخل ہوئے تھے تو اُجالا تھا اور نکلے تو چاروں طرف اندھیرے کا قبضہ ہو چکا تھا۔ اس کے ذہن میں میرا گھر اور میری سوچ میں اُس کا مکان تھا۔ دونوں ہی گہری تاریکی میں بڑھتے جا رہے تھے اُس منزل کی طرف جو دونوں کے نصیب کو ایک کرتی تھی۔ اس کا مکان گھر نہیں بن پایا اور میرا گھر مکان میں تبدیل ہوگیا۔

برصغیر کے معروف افسانہ نگار

نور شاہ

کا تازہ افسانوی مجموعہ

لفظ لفظ داستان

منظر عام پر آچکا ہے

رابطہ کریں : میزان پبلی شرز، بٹہ مالو، سرینگر

فون : 7006773403

Kashmir Treasures Collection, Srinagar

CC-0. In Public Domain. Digitized by eGangotri.

پرویز مانوس
9622937142

خراشیں

جب سے اُس نے سن رکھا تھا کہ بہت پہلے کسی آدم نے چاند پر قدم رکھا ہے، تب سے اُس کے دل میں یہ خواہش انگڑائی لینے لگی تھی کہ وہ بھی چاند پر جائے۔ اسی لئے جب بھی گھر کے بڑے بزرگ قدرت کی بنائی ہوئی کائنات کے بارے میں بات کرتے، وہ بھی کان لگا کر اُن کی باتیں غور سے سنتی رہتی۔ اُسے آج بھی اچھی طرح یاد تھا جب بچپن میں پڑوس کی موسی اُس سے پوچھتی، بیٹی چندا ماما کہاں ہے؟ تو وہ اپنی ننھی سی انگلی آسمان کی طرف اُٹھا کر کہتی، ''چندا ماما وہ ہے'' اُس کی یہ اٹکھیلیاں دیکھ کر موسی کہتی، میں صدقے جاؤں ان ننھے منے ہاتھوں پر، کتنے پیارے پیارے دودھ کی طرح سفید ہاتھ ہیں میری بچی کے! اور پھر موسی اُس کے ہاتھوں کو دیوانہ وار چوم لیتی۔ موسی ہی کیا، گاؤں کے سبھی لوگ کہتے، ''دینوں کی بیٹی کے ہاتھ کتنے خوبصورت ہیں، بالکل چاند کی طرح ۔ ۔ !''

شاید یہی تعریفیں سن سن کر گھر والوں نے اس کا نام ''پری'' رکھ دیا تھا۔ ہر شام کو جب آفتاب کوہساروں کے پیچھے دیوداروں کے جنگل میں اندھیرے کی اوڑھنی اوڑھ لیتا تو مشرق سے چاند اپنا دودھیا مکھڑا دکھاتا تو پری دیر تک منڈیر پر بیٹھ کر اُس کی طرف تکتی رہتی۔ دل ہی دل میں سوچتی، اگر اُسے معلوم ہو جائے کہ چاند پر پہنچنے کا راستہ کہاں سے ہے تو وہ آج ہی چاند پر پہنچ جائے۔ پھر بہار کی آمد پر چاند نکلتے چمگادڑوں کی ٹولیاں ایک گاؤں سے دوسرے گاؤں کی طرف اُڑان بھرتیں تو پری یہ خوبصورت منظر اپنے گھر کے آگے والی جھیل میں دیکھ کر بے حد خوش ہوتی اور سوچتی، کاش وہ بھی پنچھی ہوتی تو اُڑان بھر کر چاند پر پہنچ جاتی، مگر قدرت نے تو اُسے اشرف المخلوقات کا درجہ عطا فرمایا تھا جس کے لئے کوئی بھی کام ناممکن نہیں۔ آخر کار وہ اپنے دل کو تسلی دے کر سمجھا لیتی۔ مگر اُسے یقین تھا کہ ایک نہ ایک دن وہ ضرور چاند پر پہنچ جائے گی۔ ایک شام آسمان پر گھنے بادل چھائے ہوئے تھے اور چاند کہیں نظر نہیں آرہا تھا۔ پری دوڑتے دوڑتے دادی ماں کے پاس جا پہنچی اور اُس کی گود میں بیٹھ گئی اور پوچھنے لگی، دادی ماں، دادی ماں! آج چاند کیوں نہیں نکلا؟ دادی اماں نے ٹالتے ہوئے کہہ دیا، بیٹی آج بادل چھائے ہوئے ہیں، اس لئے چاند دکھائی نہیں دیتا، لیکن پری اُلٹے سیدھے سوالات کرنے لگی کہ بادل کیا ہوتے ہیں؟ یہ کہاں سے آتے ہیں؟ یہ کتنی دیر تک رہیں گے؟ دادی ماں نے بھی کوئی دھوپ میں بال سفید نہیں کئے تھے۔ اُس نے پری کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا، بیٹی! چندا ماما کی شادی ہوگئی ہے اور وہ سسرال گیا ہوا ہے۔ وہ کل تک لوٹ آئے گا، تب جا کر کہیں پری نے چپ سادھی، لیکن سوچتی رہی کہ دادی سے یہ بھی پوچھ لے کہ چاند پر جانے کا راستہ کہاں سے ہے؟ جب دادی ماں نے جان چھڑانے کے لئے کہہ دیا کہ سامنے کے پہاڑ سے چاند بہت قریب ہے، وہاں سے ہی چاند پر چڑھا جا سکتا ہے۔ دادی کو معلوم تھا کہ پہاڑ کی بلندی دیکھ کر وہ چپ ہو جائے گی، دادی نے یہ کہہ کر اپنا پیچھا تو چھڑا لیا لیکن یہ بات پری کے دل و دماغ میں گھر کر گئی کہ پہاڑی پر سے چاند بالکل قریب ہے۔ پھر دیکھتے ہی دیکھتے پری کے جسم پر جوانی کے بیج پھوٹنے لگے۔ بیج رفتہ رفتہ پودے بن گئے، پھر ان پودوں پر کلیاں چہکنے لگیں اور ان کلیوں کی مہک سارے گاؤں میں پھیل گئی۔ پھر پری کو گاؤں کا ہر جوان لڑکا چاند لگنے لگا۔ اُن

Kashmir Treasures Collection, Srinagar

CC-0. In Public Domain. Digitized by eGangotri.

ہی میں سے ایک چاند ''گلفام'' بھی پری کو پانے کی خواہش رکھتا تھا۔ اب پری کے دل میں چاند کو پانے کی خواہش شدید زور پکڑنے لگی۔ کافی دنوں کے بعد جب چاند دوبارہ محبوب کی ٹوٹی ہوئی چوڑی کی شکل میں آسمان پر نمودار ہوا تو پری نے یہ فیصلہ کرلیا کہ اب کی بار وہ چاند کو پاکر ہی دم لے گی۔

وہ گھر سے پہاڑ پر چڑھنے کے لئے نکلی تو راستے میں گلفام بھی اُس کے ساتھ ہولیا۔ پری نے سوچا، چلو ساتھ رہے گا۔ انہوں نے دوپہر سے ہی پہاڑ پر چڑھائی شروع کردی اور اندھیرا ہونے سے پہلے ہی وہ دونوں پہاڑ کی چوٹی پر پہنچ گئے۔ پری چاروں طرف اونچے اونچے دیودار دیکھ کر خوف کھانے لگی۔ مہتاب کی دودھیا چاندنی رفتہ رفتہ پہاڑوں کی چاروں سمت میں پھیلنے لگی تو پری نے اپنے پیارے پیارے دودھ جیسے سفید ہاتھ دیوداروں کے درمیان سے آسمان کی طرف بڑھائے۔ اُس نے اپنی ایڑیاں اوپر اُٹھا کر بہت کوشش کی کہ وہ چاند کو چھو سکے مگر چاند تک اُس کے ہاتھ نہ پہنچ سکے۔ مجبور ہو کر اُس نے اپنے ہاتھ واپس کھینچ لئے، پر اسی دوران دیوداروں کی شاخوں سے اُس کے ہاتھوں پر خراشیں پڑ گئیں۔

☆ ☆

مکتبہ قصر الادب کا

علمی، ادبی اور تہذیبی ماہنامہ

''شاعر''

۱۹۳۰ء سے باقاعدگی کے ساتھ

شائع ہو رہا ہے

مدیر : افتخار امام صدیقی

پوسٹ بکس نمبر : ۳۷۷۰، ممبئی ۔ ۴۰۰۰۰۴

پروفیسر شہناز نبی کی تازہ تصنیف

''سفرنامہ کشمیر ۔ جنت بے نظیر''

آپ کے کشمیر سفر کے پس منظر میں

رابطہ کریں :

رہروان ادب

88-H-2، ایلیٹ روڈ، کولکتا ۔700016

مغربی بنگال۔

Kashmir,Treasures Collection, Srinagar

CC-0. In Public Domain. Digitized by eGangotri.

محمد قمر سلیم
9322645061

تیرے انتظار میں

کمال نے ایم اے سیاسیات کے سال اوّل میں داخلہ لیا تھا۔ اس کے کالج میں ایرانی طلباء کی کافی بڑی تعداد تھی اور یہ سارے طلباء مغربی تہذیب کے دلدادہ تھے۔ لڑکے لڑکیاں روزانہ ہی نئے نئے فیشن کے کپڑے پہن کر آتے تھے۔ لڑکے زیادہ تر جینس اور ٹی شرٹ میں رہتے تھے۔ لڑکیاں کبھی جینس اور سلیولیس ٹی شرٹ، کبھی فل اسکرٹ شرٹ تو کبھی منی اسکرٹ بلاؤز میں ملبوس ہو کر آتی تھیں۔ کالج کے ہر لڑکے کی نظر ان کے پورے بدن کو نہارتی تھی۔

کمال کی جماعت میں بھی دو ایرانی لڑکے پڑھتے تھے۔ ایک کا نام تو محسن تھا، دوسرے کا نام بہرام۔ ان کا پانچ لوگوں کا گروپ تھا۔ دو وہ اور تین ایرانی حسینائیں۔ حسینائیں کیا تھیں، ایسا لگتا تھا سورگ سے اپسرائیں زمین پر اُتر آئی ہیں۔ کمال جب بھی اُنہیں دیکھتا تو دیکھتا ہی رہ جاتا۔ اُس نے آج تک اتنی خوبصورت لڑکیاں نہیں دیکھی تھیں۔ کاش اس وقت موبائل ایجاد ہو گیا ہوتا تو وہ اُن کی تصویریں اپنے موبائل میں قید کر لیتا۔ وہ مصور بھی تو نہیں تھا، ورنہ دل کے گوشے میں سجی ہوئی ان کی شکلوں کو کینوس پر اُتار لیتا۔

کمال کی زبان پر ان تینوں حسیناؤں میں سے صرف افشین کا نام ہی چڑھا ہوا تھا۔ وہ تینوں میں سب سے زیادہ حسین و جمیل اور سب سے کم عمر تھی۔ ایسا گمان ہوتا تھا کہ وہ اس سرزمین کی رہنے والی نہیں ہے۔ جھیل سے گہری نشیلی مدہوش کر دینے والی آنکھوں میں ڈوبنے کو جی چاہا تھا۔ اُس کا حسن اُس وقت مزید دوبالا ہو جاتا جب وہ اپنے نازک پنکھڑیوں جیسے ہونٹوں پر بدن پر ملبوس لباس کے رنگ کی لپسٹک لگاتی تھی۔ جب وہ اپنی مخروطی انگلیاں اپنے سنہرے لمبے بالوں میں گھما کر چھوڑتی تو ایسا محسوس ہوتا کہ آسمان پر گھٹائیں چھا گئی ہوں۔ قد ایسا کہ ہر کوئی رشک کرے اور جب وہ لب کشائی کرتی تھی تو دل میں ترنگیں پھوٹتی تھیں۔ وہ چلتی تھی تو محسوس ہوتا تھا کہ موجیں کوئی ساز چھیڑتی ہوئیں چلی جا رہی ہوں۔

وہ پانچوں صبح ٹھیک نو بجے کالج پہنچ جاتے تھے۔ کمال کی روز اُن سے غالب کے مجسمے کے پاس ملاقات ہوتی تھی اور مجسمے پر لکھا ہوا یہ مصرعہ اُسے گدگداتا تھا ؎

جام ہر ذرہ ہے سرشارِ تمنا مجھ سے

افشین پر تپاک انداز میں ہاتھ ملاتی تھی اور کمال کو اُس کے نرم و گداز ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں میں لے کر ایسا لگتا تھا جیسے وہ روئی کے گالوں کے ساتھ کھیل رہا ہو۔ وہ اُس کا ہاتھ چھوڑنا ہی نہیں چاہتا تھا۔ اُس نے محسوس کیا کہ وہ بھی یہی چاہتی تھی کہ وہ اس کا ہاتھ کبھی نہ چھوڑے۔ وہ دن بھر اس کے ہاتھوں کا لمس اپنے تخیل میں محسوس کرتا رہتا تھا۔ آہستہ آہستہ وہ لوگ ایک دوسرے سے مانوس ہونے لگے۔

ایک دن کی بات ہے، وہ لوگ لائبریری سے کینٹین کی طرف جا رہے تھے کہ جیسے ہی غالب کا مجسمہ آیا، کمال کینٹین کے بجائے ڈپارٹمنٹ چلا گیا۔ مشکل سے پانچ منٹ بھی نہیں لگے اور وہ دوڑتا ہوا کینٹین کی طرف جانے لگا۔ اُس نے دیکھا کہ افشین تو غالب کے مجسمے کا پاس کھڑی ہے۔ اُس نے افشین سے فارسی میں کہا :

''سریع بیا - - ''

Kashmir Treasures Collection, Srinagar

CC-0. In Public Domain. Digitized by eGangotri.

افشین نے اُس کا ہاتھ پکڑ لیا، اتنی مضبوطی سے کہ کبھی چھوٹے گا ہی نہیں اور اُردو میں بولی :

''نہیں، آہستہ''

کمال کبھی اپنے آپ کو دیکھتا تو کبھی اُسے۔ افشین نے کمال کا ہاتھ بری طرح سے دبوچ رکھا تھا۔ کمال نے اُس کی طرف دیکھا۔ اُس کی آنکھیں نم تھیں اور گلابی چہرے پر سرخی چڑھ گئی تھی۔ اُس نے نظریں نیچے کیں اور بہت ہی گھبراتی ہوئی سریلی آواز میں ''آئی لو یو'' کہا۔ سنتے ہی کمال سکتے میں آ گیا تھا۔ اُس کی زبان گنگ ہوگئی تھی۔ وہ کچھ بھی کہنے سے قاصر تھا۔ بس اُسے دیکھے جا رہا تھا اور سوچ رہا تھا کہ ایک مرد ہو کر جو وہ نہیں کہہ سکا، آج افشین نے کہہ کر مرد اور عورت کے فرق کو ختم کر دیا۔ وہ سوچنے لگا یہ اس کی مغربیت کا اثر تھا یا اس کی بے لوث محبت کی آواز تھی۔ افشین نے اپنا چہرہ اوپر کیا۔ آنکھوں سے آنسو رواں تھے۔ وہ نہیں سمجھ پایا کہ یہ خوشی کے آنسو تھے یا اُس کے جذبات جو دریا بن کر بہہ رہے تھے۔ اُس کا دل چاہا کہ وہ اُسے اپنی بانہوں میں لے لے، لیکن تہذیب کے ہاتھوں مجبور تھا۔

ان کی محبت پروان چڑھتی رہی۔ اب وہ دونوں کافی حد تک ایک دوسرے کی زبان سمجھنے لگے تھے۔ ان کے دل تو ایک دوسرے کے لئے شدت سے دھڑکتے ہی تھے اور زبانوں کا سنگم بھی ہو چکا تھا، بس انتظار تھا تو دو جانوں کا ایک قالب میں ڈھلنے کا۔

کمال عید منانے کے لئے اپنے شہر بریلی چلا گیا۔ خاص عید کے دن ہی فرقہ وارانہ فساد ہو گیا تھا۔ شہر میں کرفیو لگا دیا گیا تھا۔ اسی دوران کمال کو اپنے کالج سے تار ملا کہ فلاں فلاں تاریخ سے امتحانات ہیں۔ تمام کوششیں کیں لیکن وہ امتحان نہیں دے سکا اور اُسے دوبارہ سال اوّل میں داخلہ لینا پڑا۔ اب وہ محسن، بہرام اور دوسرے ساتھیوں سے بچھڑ گیا تھا۔ کلاسیں شروع ہو چکی تھیں۔ فائنل ائیر کی کلاس میں محسن، بہرام نظر ہی نہیں آتے تھے اور نہ ہی افشین اور دونوں حسینائیں۔ وہ بہت پریشان تھا۔ اُن سے کسی طرح رابطہ بھی نہیں ہو پا رہا تھا اور کوئی اُن کے بارے میں بتا بھی نہیں رہا تھا۔

ادھر نئی کلاس میں کمال ایک مہینہ دیر سے پہنچا تھا۔ سارے چہرے نئے۔ فائنل ائیر کے ساتھی منہ چڑھاتے نہیں تھکتے تھے۔

''دوسروں کی تہذیب میں ضم ہونے گئے تھے نتیجہ دیکھ لیا ۔ ۔ !''

اُسے کالج میں افشین سے ملنے کی آس روکے ہوئے تھی، ورنہ اُس کی آنکھوں میں ساتھیوں کے طنز سے چڑھاتے ہوئے چہرے دیکھنے کی تاب نہیں تھی اور نہ ہی اُس کے کان اُن کے طنز برداشت کر پا رہے تھے۔ آج وہ پہلی بار نئی کلاس میں گیا تھا۔ جیسے ہی وہ کلاس سے باہر نکلا، تین دیویاں اُس کے سامنے کھڑی تھیں۔ ان تینوں نے پہلے ہی دن اُس سے اس طرح بات کی جیسے برسوں کی شناسائی ہو۔ افشین کی یادوں کے سہارے اُس نے ان کے ساتھ وقت گزارنا شروع کر دیا۔ رہ رہ کر اُسے اپنے ایرانی دوست یاد آتے رہے۔ وہ دیویاں ہر چند اُس کی دلجوئی کرتی تھیں، لیکن اُس کا دل تمام رنگینیوں سے خالی تھا۔ اگر کوئی حسرت تھی تو افشین کے دیدار کی۔

ایک سال گزر گیا تھا۔ اس ایک سال میں اُس نے کورس کی کتابیں پڑھنے کے بجائے فارسی سیکھی اور لائبریری میں جا کر فردوسی، نظامی، رومی، حافظ، شیرازی، عمر خیام کے کلام اس طرح پڑھتا جیسے ایک بہت بڑا عالم ہو۔ وہ ان کے کلام میں افشین کو تلاش کرتا تھا۔ ادھر تین دیویوں میں سے دونمرتا اور سپنا کی شادی ہوگئی تھی۔ رنجنا کی شادی نہیں ہوئی تھی۔ کورس مکمل ہونے کے بعد کمال اور رنجنا نے ملازمت کر لی تھی لیکن ملاقاتوں کا سلسلہ جاری تھا۔

Kashmir Treasures Collection, Srinagar

CC-0. In Public Domain. Digitized by eGangotri.

یہ نوے کا زمانہ تھا۔ اب اپنے شہر میں کمال کا دل نہیں لگتا تھا۔ اُس نے دوسرے شہر میں ملازمت کر لی تھی اور وہ بہت کم وقت کے لئے اپنے شہر آتا تھا، لیکن جب بھی آتا تھا، رنجنا سے ضرور ملتا تھا۔

وہ تیار ہو کر گھر سے نکل ہی رہا تھا کہ فون کی گھنٹی بجی۔ اُس نے فون اُٹھایا

''ہیلو ۔ ۔ کون ۔ ۔ ؟''

دوسری طرف سے آواز آئی :

''محسن''

اُس نے تعجب سے دہرایا :

''محسن ۔ ۔ !''

''ہاں ہاں، میں محسن۔ کیا تم کمال بول رہے ہو ۔ ۔ ؟''

''ہاں، میں کمال بول رہا ہوں''

کمال کو اپنے کانوں پر یقین نہیں ہو رہا تھا۔

''محسن، تم کہاں ہو ۔ ۔ ؟'' ۔ کمال نے بدحواسی کے عالم میں پوچھا۔

''میں کالج آیا ہوں۔ تم سے ملنا چاہتا ہوں''

''ہاں، ہاں، میں آ رہا ہوں''

ریسیور کریڈل پر رکھتے ہی گھنٹی پھر بجنے لگی۔ دوسری طرف رنجنا تھی۔

اُس نے فون اُٹھاتے ہی اپنی خوشی کا اظہار کرنا شروع کر دیا :

''رنجنا! ۔ ۔ ایک خوش خبری، افشین مل گئی ۔ ۔ میری چاہت، رنجنا، میری چاہت ۔ ۔ !''

''ارے، ارے کمال ۔ ۔ تم کتنا خوش ہو''

اُس نے کچھ توقف کے بعد ٹھنڈی سانس لیتے ہوئے کہا :

''ارے واہ''

رنجنا کی آنکھوں میں آنسو چھلک آئے تھے۔ وہ ٹھنڈی ٹھنڈی آہیں بھرنے لگی۔ اُس نے سوچا، وہ کمال کو منع کر دے گی کہ وہ نہیں آئے گی لیکن نہ جانے کون سی طاقت اُسے کمال سے ملنے کے لئے اُکسانے لگی اور وہ اُس سے ملنے گھر سے نکل گئی۔

ادھر کمال نے ریسیور پٹکا اور برق رفتاری سے گھر سے نکل گیا۔ محسن غالب کے مجسمے کے پاس اس کا انتظار کر رہا تھا۔ دیکھتے ہی وہ دونوں ایک دوسرے سے چپٹ گئے۔ پانچ منٹ تک وہ دونوں ایک دوسرے سے چمٹے رہے، دونوں کی آنکھیں سرخ تھیں۔ وہ وہیں غالب کے مجسمے کے پاس بیٹھ گئے۔ برسوں بعد وہ پھر اُسی دور میں پہنچ گئے تھے۔ کمال نے محسن سے پوچھا کہ وہ اتنے دن کہاں تھا۔ اپنی کہانی بتانے سے پہلے محسن نے کمال سے ہی پوچھ لیا کہ وہ کہاں تھا۔ کمال نے اپنی روداد اُسے سنا دی۔

محسن کو بولنے میں بہت ہچکچاہٹ ہو رہی تھی۔ بڑی مشکل سے وہ اُسے یہ بتا سکا کہ اُنہیں بتایا گیا تھا کہ فساد میں کمال کی موت ہو گئی تھی۔ یہ سنتے ہی کمال نے کہا :

''تو تم نے میرے گھر فون کیوں نہیں کیا ۔ ۔ ؟''

''بہت کوشش کی۔ تمہارے فون کی گھنٹی بجتی تھی۔ میں تو تمہارے گھر بھی گیا تھا لیکن وہاں تالا تھا''

اُس نے کچھ رُک کر کہا :

''تمہاری موت کی خبر سن کر ہم لوگ ٹوٹ گئے تھے''

کمال نے ڈرتے ڈرتے محسن سے افشین کے بارے میں پوچھا، اُس نے بتایا :

''ہمیں معلوم تھا کہ افشین تمہیں بہت چاہتی ہے اور ہم لوگ بھی چاہتے تھے کہ تمہارے ساتھ اُس کی شادی ہو جائے۔ تمہاری موت کی خبر سن کر اُس کی حالت غیر ہو گئی تھی۔ اُسے کسی بھی حال میں تمہاری موت کا

Kashmir Treasures Collection, Srinagar

CC-0. In Public Domain. Digitized by eGangotri.

یقین نہیں ہو رہا تھا۔ تمہاری موت کا غم اور دوسری طرف ہماری حکومت نے ہمارا جینا مشکل کر دیا تھا اس لئے ہم نے برطانیہ میں پناہ لینا بہتر سمجھا۔ ہم لوگوں نے افشین کو بڑی مشکل سے سنبھالا تھا لیکن اُس نے ابھی تک شادی نہیں کی ہے''

''کیا ۔ ۔ ؟''

کمال خوشی اور تعجب سے اُسے دیکھتا رہا۔ اُس نے روندھے ہوئے لہجے میں کہا :

''محسن میں نے بھی ابھی تک شادی نہیں کی ہے''

ابھی وہ باتیں کر ہی رہے تھے کہ رنجنا آ گئی۔ کمال نے رنجنا کا تعارف محسن سے کرایا۔ محسن نے ایک بھرپور نظر اُس پر ڈالی۔ رنجنا زیادہ دیر نہیں رُکی۔ اُس کے جانے بعد محسن بھی جانے لگا۔ اس سے پہلے کہ کمال اُس سے کچھ کہتا، محسن نے طنزیہ لہجے میں کہا :

''آپ اپنی دوست سے شادی کر لیجئے''

کمال کچھ سمجھ نہ سکا۔ وہ محسن کے جملے سے پریشان ہو گیا تھا۔ وہ افشین کو ایک نظر دیکھنے کے لئے بے چین ہو رہا تھا :

''محسن بتاؤ، افشین کہاں ہے ۔ ۔ ؟''

''بڑی مشکل سے ہم افشین کو یہ یقین دلانے میں کامیاب ہوئے ہیں کہ آپ مر گئے ہو اور اب یہی سچ ہے'' ۔ ۔ محسن نے بے رُخی کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

محسن اُٹھا اور اُسے الوداع کہتا ہوا چلا گیا۔ کمال غالب کے مجسمے کے پاس دم بخود بیٹھا رہ گیا۔ مجسمہ چیخ چیخ کر کہہ رہا تھا ؎

کس کا دل ہوں کہ دو عالم سے لگایا ہے مجھے

☆ ☆

ڈاکٹر اشرف آثاری کی ادبی و علمی اُردو تصانیف

''عصری ادب کے رنگ و آہنگ (۱)''

تنقیدی مضامین پر مبنی فکر انگیز تخلیقات کا مجموعہ

☆

''افسانہ لکھ رہا ہوں''

منفرد و مخصوص لب و لہجہ اور اسلوب و بیان میں نئے اور اچھوتے موضوعات پر لکھے گئے افسانوں کا مجموعہ

☆

''علامہ اقبال اور مرزائیت''

اقبالیات کے ضمن میں اس موضوع پر لکھی جانے والی پہلی مفصل و مدلل کتاب

☆

''بلھا کیہ جاناں میں کون''

دوسرا افسانوی مجموعہ، تر و تازہ فکر و احساس اور زندہ و جاندار کرداروں کی زندگیوں میں پیش آنے والے حالات و واقعات کی روداد کا مجموعہ

رابطہ : ہوٹل شہنشاہ پیلس، بلیوارڈ، سرینگر

Kashmir Treasures Collection, Srinagar

CC-0. In Public Domain. Digitized by eGangotri.

ایثار کشمیری
7006541479

اوقات

سجن سیٹھ کے پاس کیا نہیں تھا۔ عالیشان کوٹھی، مہنگی گاڑیاں، سارے شہر میں پھیلی ہوئی تجارت اور اونچے ایوانوں تک رسائی۔ زمانے کی ساری خوشیاں اس کی غلام تھیں۔ کاروبار چلانے کے لئے سینکڑوں نوکر تعینات تھے۔ یوں مان لیجیے کہ سجن سیٹھ اپنی چھوٹی سی سلطنت کا شہنشاہ تھا۔ اس کا ایک بھائی بھی تھا جو اپنا کاروبار الگ چلاتا تھا اور سجن سیٹھ کے معاملات میں دخل نہیں دیتا تھا۔ وقت مزے سے گزر رہا تھا لیکن سجن سیٹھ کی ایک کمزوری تھی۔ اس کی اکلوتی بیٹی کومل جو حسن کی دولت سے مالا مال تھی۔ وہ کالج میں دوسرے سال کی طالبہ تھی۔ سجن سیٹھ کے لئے اس کی جوان بیٹی کمزوری اس لئے بنی ہوئی تھی کہ اسے کسی طرح سے پتہ چل چکا تھا کہ کومل اپنے ہی کالج کے ایک لڑکے 'سالم' کی محبت میں گرفتار ہو چکی تھی۔ بڑے لوگ رشتے ناطے اپنے طریقے سے جوڑتے یا توڑتے ہیں۔ ایسے راہ چلتے لوگوں سے رشتہ کرنا ان کے لئے ذلت کی بات تھی۔ سجن سیٹھ کے شب و روز اسی پریشانی میں گزرتے رہے اور کومل نے گریجویشن مکمل کی۔ کالج کے آخری دن کومل اور سالم کافی دیر تک باتیں کرتے رہے۔ کومل نے سالم سے کہا:

''کل سے ہم کالج کو الوداع کہیں گے لیکن ایک دوسرے کو نہیں۔ کسی نہ کسی بہانے سے ہم ایک دوسرے کو ملا کریں گے''

سالم خاموش تھا ایسے جیسے سمندر کسی طوفان سے پہلے خاموش ہوتا ہے۔ اس کے چہرے سے صاف ظاہر تھا کہ وہ رونا چاہتا تھا لیکن اس نے اپنے آنسوؤں کو بڑی مہارت کے ساتھ قڈیڈی کر رکھا تھا۔ تھوڑی دیر بعد کومل پھر بولی:

''مجھے معلوم ہے کہ میرے ڈیڈی تمہیں کبھی قبول نہیں کریں گے، لیکن میں اُن کی ساری دولت تمہارے لئے ٹھکرا دوں گی اور صرف تمہاری ہو کر رہوں گی''

سالم نے کہا:

''دیکھو کومل! مجھے خود معلوم نہیں کہ تمہارے دل میں میرے لئے اتنا پیار کیوں ہے۔ میں ایک معمولی انسان ہوں۔ میرا باپ تمہارے ڈیڈی کے برابر نہیں بیٹھ سکتا۔ کہاں ایک معمولی چوکیدار اور کہاں سجن سیٹھ۔ میں ایک نچلی ذات کا بندہ ہوں اور میں کسی بھی لحاظ سے تمہارے خاندان کی کہکشاں میں فٹ نہیں ہو سکتا۔ میری مانو، کالج میں گزارے ان برسوں کو ایک خواب سمجھ کر بھول جاؤ اور کسی برابر والے خاندان میں رشتہ جوڑ لو''

''نہیں، سالم میں ایسا نہیں کر سکتی۔ میں نے تمہاری پاکیزہ روح سے محبت کی ہے۔ مجھے محبت ہے تمہارے اندر کے انسان سے جو عالیشان بنگلوں میں رہنے والے گورے چٹے انسانوں کے مقابلے میں بہت خوبصورت ہے۔ مجھے محبت ہے تمہاری سادگی سے جو اصولوں سے لپٹی ہوئی ایک سوغات ہے'' ۔ ۔ کومل نے سالم سے کہا اور سر جھکا کر خاموش ہو گئی۔

اب سالم اپنے آنسوؤں کو قابو نہیں کر سکا۔ کومل بھی رو پڑی۔ غبارِ دل ذرا

Kashmir Treasures Collection, Srinagar

CC-0. In Public Domain. Digitized by eGangotri.

سا ہلکا ہو گیا تو کومل نے کہا :

''سب جا چکے ہیں۔ اوپر آسمان ہے اور نیچے ہم دو۔ اب چلتے ہیں۔ میں خدا سے تمہیں مانگتی رہوں گی۔ اپنا خیال رکھنا''

دونوں ایک دوسرے کو خدا حافظ کہہ کر اپنے اپنے گھروں کو رخصت ہو گئے۔

کومل گھر پر اُس اداس بلبل کی طرح تھی جس کے چمن کے سارے دروازے بند کر دیے گئے تھے اور وہ گلوں کو ترس رہی تھی۔ ایسے ہی کچھ چھ سات مہینے گزر گئے اور کومل نے فلسفہ میں ایم اے کی ڈگری حاصل کرنے کے لیے یونیورسٹی میں داخلہ لیا۔ دوسری طرف سالم اپنے باپ کی تنگ دستی کی وجہ سے تعلیم کا سلسلہ جاری نہ رکھ سکا۔ وہ وقتاً فوقتاً کومل سے ملنے آتا اور یہ بات کسی طرح سے سجن سیٹھ کو معلوم ہو گئی۔ اس نے اپنی بیٹی کو اس بات پر ڈانٹ پلائی لیکن کومل نے اپنی ماں سے سب کچھ صاف صاف بتا دیا :

''ممی! میں سالم کو حد سے زیادہ چاہتی ہوں۔ وہ ایک اچھا انسان ہے، ڈیڈی کو سمجھائیے'' ۔ ۔ یہ کہتے ہوئے وہ رو پڑی۔

''چپ ہو جا میری بچی۔ میں تمہارے ڈیڈی کے ساتھ بات کروں گی''

بڑی مشکل سے سجن سیٹھ کو اپنی بیوی نے سارا قصہ سنا کر سالم سے ملنے پر رضامند کیا۔

''ٹھیک ہے! اگلی اتوار کو ہم سالم سے ملیں گے۔ دیکھتے ہیں کہ ہماری لاڈلی کی پسند کیسی ہے''

جب کومل کی ماں نے اُسے خوشخبری سنائی تو کومل اتنی خوش ہو گئی کہ چاہتی تھی اوپر آسمانوں پر جا کر اپنی خوشیاں ستاروں کے ساتھ بانٹے۔

اتوار آ گئی۔ اس دن کے سورج کے طلوع ہونے کا منظر ہی کچھ اور تھا۔ کومل سورج کی سنہری کرنوں سے التجا کر رہی تھی کہ ذرا اپنی رفتار بڑھا دو اور دوپہر لانے میں جلدی کرو۔ دوپہر آ گئی اور ساتھ میں آ گیا کومل کی خوشیوں کا محور۔ سالم سجن سیٹھ کی کوٹھی میں داخل ہوا۔ نوکر اُسے مہمان خانے میں لے گئے جہاں سجن سیٹھ اپنی بیوی کے ساتھ بیٹھا تھا۔ عالیشان کوٹھی دیکھ کر وہ ذرا بھی نہیں للچایا کیونکہ اُس کی نظروں میں کومل کے بغیر کوئی چیز سمائی ہوئی تھی۔ مہمان خانے میں بیٹھے بیٹھے بات چلی تو سیٹھ نے سالم سے کئی سولات کیے۔ سالم نے بے باکی سے اپنا حال سنایا۔ اپنی غربت کے بارے میں بتایا اور اپنی اوقات بھی بتا دی۔ سالم کے بارے میں سب کچھ جاننے کے بعد سیٹھ کا چہرہ لال پڑ گیا اور غراتے ہوئے سالم سے کہا :

''جب تمہاری یہ اوقات ہے تو تم نے یہاں آنے کی جرأت کیسے کی۔ ہم اونچی ذات کے لوگ ہیں۔ تم ہمارے ساتھ کیسے مل سکتے ہو۔ چھوٹے لوگ خواب بھی اپنی حیثیت سے دیکھا کرتے ہیں لیکن تم اپنی اوقات سے بڑھ کر خواب دیکھ رہے ہو۔ اپنی صورت دیکھو اور پھر میری بیٹی کی خوبصورتی بھی دیکھو۔ اب آئے ہو تو سامنے رکھی ہوئی چائے کی پیالی پی لو اور چلتے بنو۔ ایک معمولی چوکیدار سجن سیٹھ کا سمدھی بنے گا، ہو ہی نہیں سکتا''

سجن سیٹھ غصہ پیتے ہوئے وہاں سے اٹھ کے چلا گیا۔ کومل کی ماں ایک نظر کومل کو دیکھتی تو ایک نظر سالم کو۔ سالم کی غیرت داؤ پر تھی لیکن اس نے خود کو سنبھالے رکھا۔ وہ سر جھکائے خدا سے فریاد کر رہا تھا کہ سجن سیٹھ کو چوکیدار بنا دے اور اس کے باپ کو سجن سیٹھ۔ وہ اندر ہی اندر ٹوٹ

Kashmir Treasures Collection, Srinagar

CC-0. In Public Domain. Digitized by eGangotri.

چکا تھا اور کومل پر تو آسمان ٹوٹ چکا تھا۔ وہ سالم کی ذہنی کیفیت سے بخوبی واقف تھی۔ وہ سالم کے قریب آ گئی اور اُسے چائے پینے کو کہا۔ سالم نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا :

''کومل! ۔ ۔ اس چائے کی پیالی میں ایک بدتمیز طوفان برپا ہے جو میرے وجود کو پٹخ پٹخ کر مار رہا ہے۔ میں جا رہا ہوں''

''میرے ڈیڈی اپنی اونچی اوقات کے نشے میں مست ہیں۔ اُن کی طرف سے میں معافی مانگتی ہوں۔ تم میرے لئے سب کچھ ہو۔ ڈیڈی کی باتوں سے تم ضرور ٹوٹ چکے ہوگے لیکن میں تمہیں بکھرنے نہیں دوں گی۔ دیکھو ہمت مت ہارو۔ ہم خدا کو ایک دوسرے سے مانگیں گے۔ ہم صحیح وقت کا انتظار کریں گے''

سالم بوجھل قدموں کے ساتھ سجن سیٹھ کی کوٹھی سے باہر آ گیا۔ پھاٹک کی طرف بڑھ رہا تھا۔ پیچھے مڑ کر دیکھا کہ کومل برآمدے میں کھڑی اسے دیکھ رہی تھی۔ اس کا حوصلہ تھوڑا سا بڑھ گیا۔ اپنی پلکیں جھکا کر اس نے کومل کی محبت بھری نظروں کو سلام کیا اور منظر سے غائب ہو گیا۔

سالم نے گھر پر سب کو حالات سے بے خبر رکھا لیکن سجن سیٹھ کے گھر صبح شام بس ایک ہی بحث تھی کہ اونچی ذات کے لوگوں کا رشتہ نچلی ذات کے لوگوں کے ساتھ نہیں ہو سکتا۔ کومل کے لیے ایسے حالات کسی جان لیوا عذاب سے کم نہ تھے۔ لیکن وہ سب کچھ بڑی سنجیدگی کے ساتھ سہتی رہی۔

وقت گزرتا گیا۔ کومل نے یونیورسٹی سے فلسفہ میں ایم اے کی ڈگری مکمل کی۔ اس دوران سالم کی نوکری لگ گئی۔ سجن سیٹھ کومل کی شادی کے بارے میں سنجیدگی کے ساتھ سوچنے لگے۔ اس سلسلے میں وہ اپنے ایک دوست کے ہاں جا رہے تھے کہ راستے میں جان لیوا حادثہ پیش آیا۔ اس حادثے میں اُن کا ڈرائیور ہلاک ہوا۔ وہ خود تو بچ گئے لیکن اُن کا ڈرائیور مر گیا۔ سجن سیٹھ کو کئی چوٹیں آئیں اور کافی خون بھی بہہ گیا۔ اُنہیں اسپتال پہنچایا گیا۔ ڈاکٹر نے کہا :

''انہیں خون کی ضرورت ہے لیکن ان کے خون کا گروپ اسپتال میں مہیا نہیں ہے، آپ لوگ جلد از جلد خون کا انتظام کریں''

اب مشکل یہ پیش آ رہی تھی کہ سیٹھ کے خون کا گروپ نایاب تھا۔ بلڈ بینک میں موجود خون ناکافی تھا۔ سجن سیٹھ کے گھر والے پیسہ خرچ کر کے خون کہیں سے تو خرید سکتے تھے لیکن اُن کے پاس وقت کم تھا۔ سیٹھ کے بھائی کا خون اُن سے ملتا تھا لیکن اس نے خون دینے سے انکار کیا۔ آخر پر ڈاکٹروں نے مشورہ دیا کہ آپ لوگ ریڈیو اور ٹی وی پر اشتہار دیں۔

تھوڑی دیر بعد ریڈیو اور ٹی وی پر وقفے وقفے کے بعد اعلان ہونے لگا:

''صدر ہسپتال کے وارڈ نمبر تین میں بیڈ نمبر پانچ کے مریض کو (O-Negative) خون کی اشد ضرورت ہے۔ اس گروپ کے خون رکھنے والے شخص سے گزارش ہے کہ براہ کرم اپنے خون کا عطیہ دے کر ایک قیمتی جان بچائے''

سجن سیٹھ ہسپتال میں بے بسی کے عالم میں تڑپ رہا تھا۔ ہر گزرتے لمحے کے ساتھ وہ موت کے قریب جا رہا تھا۔ زندگی میں پہلی بار سجن سیٹھ کو احساس ہوا کہ دولت سے صحت خریدی نہیں جا سکتی۔

دن بھر کی رعنائیاں سمٹ رہی تھیں۔ سورج اپنے دن بھر کے سفر کے آخری پڑاؤ پر تھا۔ اس کی کرنوں میں ضعف پیدا ہو چکا تھا بالکل اسی

Kashmir Treasures Collection, Srinagar

CC-0. In Public Domain. Digitized by eGangotri.

طرح جس طرح سجن سیٹھ کی سانسوں میں ضعف پیدا ہو چکا تھا۔اس کا حال بھی ڈوبتے سورج سے کم نہ تھا۔ادھر مغربی افق پر سورج تاریکی کی طرف بڑھتا جا رہا تھا اور ادھر سیٹھ کی سانسیں سست پڑ رہی تھیں۔سارے رشتہ دار، دوست اور نوکر چاکر سجن سیٹھ کے اردگرد جمع تھے۔کومل اس کے سرہانے کھڑی تھی اور کسی مسیحا کے آنے کی آس لگائے بیٹھی تھی۔ڈاکٹر بھی پریشانی کے عالم میں امکانی بچاؤ کے وسیلے کھوج رہے تھے۔

''اگر ایک گھنٹے کے اندر اندر.....'' ڈاکٹر نے ابھی بات ختم بھی نہیں کی تھی کہ سالم ہانپتا ہوا بیڈ نمبر پانچ کے قریب پہنچتے ہی بولا:

''آپ کو شاید خون کی ضرورت ہے، اونگیٹو ۔ ۔ !''

وہ اپنی آستین اوپر چڑھاتے ہوئے آگے بڑھا۔ڈاکٹروں نے سالم کو فوراً پہچان لیا۔وہ اب تک اپنے خون کا عطیہ دے کر درجن بھر مریضوں کی جان بچا چکا تھا۔

سالم نے جب کومل کو مریض کے سرہانے کھڑا دیکھا تو بڑا جذباتی ہو گیا۔اسے کیا معلوم تھا کہ جس مریض کی جان بچانے کی خاطر وہ دوڑے چلا آیا ہے وہ وہی اونچی ذات کا سیٹھ ہے جس نے اسے کبھی اپنی اوقات میں رہنے کو کہا تھا۔وہ خاموش رہا اور نظروں کی زبان سے کومل سے کہا:

''سوچا بھی نہیں تھا کہ تمہیں دوبارہ دیکھ پاؤں گا۔خون ایک ہی رنگ کا ہوتا ہے۔وہ سجن سیٹھ کا ہو یا میرا''

سالم کو اپنے روبرو دیکھ کر کومل ماضی کی یادوں میں کھو گئی۔اس کے تصور کے پردے پر وہ سارے لمحات از سرِ نو نمودار ہو گئے جو اس نے سالم کے ساتھ کالج کے دنوں میں گزارے تھے۔وہ خوشی کے مارے چاند پر پہنچ گئی کہ سالم اسے دوبارہ مل گیا تھا۔سجن سیٹھ نے نیم وا آنکھوں سے دیکھا تو سالم کو پہچان گیا۔ندامت کا خنجر اس کے جگر میں پیوست ہو گیا اور وہ اندر ہی اندر درد سے کراہنے لگا۔تھوڑی دیر میں ڈاکٹروں نے سجن سیٹھ کو سالم کا خون چڑھانے کی تیاری کی تو کومل نے اپنے ڈیڈی پر نظریں گاڑتے ہوئے کہا:

''نچلی ذات کا خون اونچی ذات کے خون سے نہیں مل سکتا''

سجن سیٹھ نے اپنے کانپتے ہاتھ جوڑتے ہوئے کومل سے لڑکھڑاتی زبان میں بولا:

''بس بیٹی! مجھے معاف کر دو۔وقت نے مجھے اپنی اوقات سکھا دی ہے۔میں نے سالم کو پہچاننے میں جو غلطی کی تھی، اُس کی سزا مجھے مل چکی ہے''

سالم بیڈ پر لیٹ گیا اور اگلے چند لمحوں میں نچلی ذات کا گرم گرم خون سجن سیٹھ کی رگوں میں دوڑ کر اسے نئی زندگی بخش رہا تھا۔اِدھر سجن سیٹھ کی سانسوں میں روانی لوٹ رہی تھی اور اُدھر کومل سالم کو اپنے سامنے دیکھ کر سنہرے خوابوں کی مالا پرو رہی تھی۔ڈاکٹروں نے اپنا کام مکمل کیا تو سالم اٹھ کھڑا ہو گیا۔اس سے پہلے کہ کومل کچھ بولتی سالم کا موبائل فون بج اُٹھا جو بیڈ پر پڑا تھا۔کومل نے اٹھانا چاہا لیکن سکرین پر "Wife calling" کے الفاظ دیکھ کر اُس کی سانسیں رُک گئیں اور اُس کا ہاتھ سالم کے فون تک نہ پہنچ سکا۔

☆ ☆

Kashmir Treasures Collection, Srinagar

CC-0. In Public Domain. Digitized by eGangotri.

زبیر قریشی
7006576629

اُمید

اُس کے پاؤں تلے سے زمین کھسک گئی جب اُسے پتہ چلا کہ وہ اتنی دُور اُس شخص سے شادی کرنے کی غرض سے آئی ہے جو اس کا شوہر ہے ۔اُس نے ہلکے سے اپنی سہیلی کے ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں میں لیا اور کہا

''میں نہیں جانتی تھی کہ تم اُس سے اتنی محبت کرتی ہو.....'' مگر وہ اُسے کچھ نہ کہہ سکی .....

اس کی سہیلی خوشی سے پھولے نہیں سما رہی تھی۔نظروں کو منفرد انداز سے گھماتے ہوئے بولی

'' تمہیں معلوم ہے.....وہ شادی شدہ ہے مگر ہماری محبت کی انتہا دیکھو !.....وہ اپنی بیوی کو جلد ہی طلاق دے گا اور پھر مُجھ سے کیا ہوا وعدہ پُورا کرے گا''

یہ سنتے ہی چہرے پر مصنوعی مسکراہٹ لئے اُس نے اپنی سہیلی کے ہاتھ اپنی جانب کھینچے اور گویا ہوئی

''کیا تمہیں پورا یقین ہے کہ وہ تمہارے ساتھ.....''

ہاں ہاں مجھے پورا یقین ہے''.....اس کی سہیلی نے بات کاٹتے ہوئے اُتاولا جواب دیا

اپنے ہاتھ اُس کی گرفت سے چھڑاتے ہوئے بولی میں پُر اُمید ہوں تم فکر نہ کرو میری جان'' اور یہ کہتے ہوئے چلی گئی۔

وہ ساکن بیٹھی سوچتی رہی.....'' میری سہیلی کو تو پوری اُمید ہے مگر میں اُسے یہ کیسے بتاؤں کہ وہ بدنصیب میں ہی ہوں اور.....م م میں اُمید سے ہوں''

صرف آنسوؤں کی دو گرم گرم بوندیں چشم سے چھلک کر رخساروں سے ڈھلکتے ڈھلتے رہ گئی۔

☆ ☆

''کشمیر ۔ جنت بے نظیر''

پروفیسر شہناز نبی کی تازہ تصنیف جو اُن کے سفر کشمیر کے رنگ اور دلچسپ واقعات کا مخصوص ومنفرد انداز واسلوب میں تحریر کردہ خوبصورت سفرنامہ ہے، کتابی صورت میں دستیاب ہے۔

رابطہ :

رہروان ادب

(H-2) 88 ایلیٹ روڈ

کولکتا ۔700016 مغربی بنگال

اُردو ہم سب کی میٹھی زبان

آیئے ۔ ۔

مل کر اس کی آبیاری کریں۔

Kashmir Treasures Collection, Srinagar

CC-0. In Public Domain. Digitized by eGangotri.

کے اے عباس
مترجم : استوتی اگروال
9575089694

بھولی

بچپن سے ہی سب اُسے بھولی کہتے تھے۔ وہ زمین دار رام لال کی چوتھی بیٹی تھی۔ جب وہ دس ماہ کی تھی تو وہ چارپائی سے گر گئی تھی اور شاید اسی وجہ سے اُس کے دماغ کا کوئی حصہ خراب ہو گیا تھا، اس لئے وہ پسماندہ لڑکی رہی اور اُسے بھولی کے نام سے جانا جانے لگا۔

پیدائش کے وقت بھولی بہت عمدہ اور خوبصورت تھی، لیکن جب وہ دو سال کی تھی تو اُسے چیچک ہو گیا۔ چیچک کی گرفت سے صرف اُس کی آنکھیں ہی بچ سکی تھیں جب کہ پورے جسم کو چیچک کے نشانوں نے مسخ کر کے رکھ دیا۔ بھولی پانچ سال کی عمر تک بول نہیں سکتی تھی، لیکن جیسے ہی اُس نے بولنا شروع کیا اُس کی زبان لڑکھڑا جاتی۔ دوسرے بچے اکثر اُس کا مذاق اُڑاتے اور اُس کی تضحیک کرتے، جس کی وجہ سے وہ بہت گم صم رہنے لگی۔ رام لال کے سات بچے تھے، تین لڑکے اور چار لڑکیاں۔ ان میں سے بھولی سب سے چھوٹی تھی۔ یہ ایک خوشحال زمین دار کا گھر تھا اور یہاں کھانے پینے اور پہننے کی کوئی کمی نہ تھی۔ بھولی کے سوا تمام بچے صحت مند اور طاقت ور تھے۔ بیٹوں کو اسکولوں اور کالجوں میں تعلیم حاصل کرنے کے لئے شہر بھیجا گیا تھا۔ بیٹیوں میں سب سے بڑی رادھا کی شادی پہلے ہی ہو چکی تھی۔ دوسری بیٹی منگلا کی شادی بھی طے ہو گئی تھی اور جب یہ کام ہو گیا تو رام لال اپنی تیسری بیٹی چمپا کے بارے میں سوچنے لگا۔ وہ خوبصورت اور صحت مند لڑکی تھی اور اُس کے لئے دولہا تلاش کرنا مشکل نہیں تھا، لیکن رام لال کو تو بھولی کی فکر تھی جو شکل وصورت میں تو اچھی تھی ہی نہیں بلکہ ذہانت میں بھی کمزور تھی۔

جب منگلا کی شادی ہوئی اُس وقت بھولی سات سال کی تھی۔ اُسی سال اُن کے گاؤں میں لڑکیوں کے لئے ایک پرائمری اسکول کھولا گیا۔ تحصیل دار صاحب افتتاحی تقریب انجام دینے آئے تھے۔ اُنہوں نے رام لال سے کہا :

''ایک محصول "Revenue" کے عہدے دار ہونے کی حیثیت سے آپ گاؤں میں حکومت کے نمائندے ہیں اور اس لئے آپ کو دیہاتیوں کے لئے ایک مثال قائم کرنی چاہئے۔ آپ کو اپنی بیٹیوں کو اسکول بھیجنا چاہئے''

اُس رات جب رام لال نے اپنی اہلیہ سے مشورہ کیا تو وہ چیخ اُٹھی :

''کیا آپ پاگل ہیں؟ اگر لڑکیاں اسکول جائیں گی تو اُن سے شادی کون کرے گا ۔ ۔ ؟''

لیکن رام لال میں تحصیل دار کی نافرمانی کرنے کی ہمت نہ تھی۔ آخر کار اُس کی اہلیہ نے کہا :

''میں آپ کو بتاتی ہوں کہ کیا کرنا ہے۔ چونکہ بھولی کے بدصورت چہرے اور احساس کی کمی ہونے کی وجہ سے اُس کی شادی کے امکانات بہت کم ہیں، اس لئے اُسی کو اسکول بھیجیں اور اساتذہ کو اُس کی فکر کرنے دیں''

اگلے دن رام لال نے بھولی کا ہاتھ پکڑ کر کہا :

''میرے ساتھ چلو۔ میں تمہیں اسکول لے جاؤں گا''

بھولی گھبرا گئی کیونکہ وہ نہیں جانتی تھی کہ اسکول کیا ہوتا ہے۔ اُسے یاد آیا کہ کچھ دن پہلے اُن کی بوڑھی گائے کو گھر سے نکالا گیا اور فروخت

Kashmir Treasures Collection, Srinagar

CC-0. In Public Domain. Digitized by eGangotri.

کیا گیا تھا :

''نہ، نہ ۔ ۔ نہیں نہیں ۔ ۔ ''

وہ دہشت سے چیخی اور اپنے ہاتھ کو والد کی گرفت سے کھینچ لیا۔

''تمہیں کیا ہوا ہے، بے وقوف'' ۔ ۔ رام لال چیخ پڑا۔

''میں تجھے صرف اسکول لے جا رہا ہوں''

پھر اُس نے اپنی اہلیہ سے کہا :

''آج اسے کچھ اچھے کپڑے پہنا دو۔ اگر اساتذہ اور دیگر طلباء اسے ان کپڑوں میں دیکھیں گے تو ہمارے بارے میں کیا سوچیں گے؟''

بھولی کے لئے نئے کپڑے کبھی نہیں بنائے گئے تھے۔ اُسے اپنی بہنوں کے پرانے لباس پہنا دئے جاتے تھے۔ اُس کو بہتر کپڑے پہننے یا اُس کے کپڑے دھونے کی پرواہ آج تک کسی نے نہ کی، لیکن آج وہ خوش قسمت تھی کہ ایک صاف ستھرا لباس جو بہت دھونے کے بعد سکڑ گیا تھا اور چمپا کے لئے اب چھوٹا پڑ گیا تھا، اُسے پہننے کو ملا۔ بھولی کو نہلایا گیا اور پھر اُس کے خشک بالوں میں تیل بھی لگایا گیا۔ یہ سب کرنے کے بعد ہی اُسے یقین آیا کہ اُسے کسی بہتر جگہ پر لے جایا جا رہا ہے۔

جب وہ اسکول پہنچے تو وہاں پر بچے پہلے ہی سے اپنے کلاسوں میں موجود تھے۔ رام لال نے اپنی بیٹی کو اسکول کی انچارج، جو کہ ایک خاتون تھیں، کے حوالے کر دیا۔ بے چاری بھولی نے خوف بھری نظروں سے اُسے دیکھا۔ وہاں پر بہت سے کمرے تھے اور ان میں لڑکیاں چٹائیوں پر بیٹھی تھیں۔ کچھ کتابوں سے پڑھتی تھیں اور کچھ سلیٹوں پر لکھتی تھیں۔ ہیڈ مسٹریس نے بھولی کو کلاس میں کسی ایک جگہ پر بیٹھنے کو کہا۔

بھولی کو معلوم نہیں تھا کہ اسکول کیا چیز ہوتی ہے۔ لیکن وہاں پر موجود باقی لڑکیوں کو دیکھ کر وہ بہت خوش ہو گئی۔ اُسے لگا کہ ان میں سے کوئی بھی اُس کی دوست بن سکتی ہے۔ کلاس میں خاتون اُستاد لڑکیوں سے کچھ کہہ رہی تھیں لیکن بھولی سمجھنے سے قاصر تھی۔ اُس نے دیوار پر لگی تصویروں کو دیکھا۔ رنگوں نے اُسے گھوڑے کی طرف متوجہ کیا جو تحصیل دار کے گھوڑے کی طرح ہلکے بھورے رنگ کا تھا۔ بکری اُن کے پڑوسی بکری کی طرح کالی تھی۔ طوطا ہرا تھا جیسا بھولی نے پہلے آم کے باغ میں دیکھا تھا اور گائے بالکل لکشمی کی طرح تھی۔ اچانک بھولی نے دیکھا کہ اُستانی صاحبہ اُس کے سامنے کھڑی ہے اور مسکرا رہی ہیں :

''چھوٹی لڑکی! ۔ ۔ تمہارا نام کیا ہے؟''

''بھ ۔ ۔ بھو ۔ ۔ بھو'' ۔ ۔ اُس کی زبان لڑکھڑا گئی اور وہ مزید کچھ نہ بول سکی۔

اس کے بعد وہ رونے لگی اور اُس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ اُس نے اپنا سر نیچے رکھا اور کونے میں جا کر بیٹھ گئی۔ اُسے سر اُٹھا کے اُن لڑکیوں کو دیکھنے کی ہمت نہیں ہوئی جنہیں وہ جانتی تھی اور جو اُس پر اب ہنس رہی تھیں۔

جب اسکول کی گھنٹی بجتی تو سبھی لڑکیاں کلاس سے باہر نکل آتیں لیکن بھولی کونے میں ہی بیٹھی رہتی :

''بھولی ۔ ۔ !''

اُستانی کی آواز بہت نرم اور پُرسکون تھی۔ بھولی نے اپنی زندگی میں کبھی اتنی پیاری آواز نہیں سنی تھی۔ اس آواز نے اُس کا دل چھو لیا۔

''اُٹھو ۔ ۔ '' اُستانی نے کہا۔

''یہ کوئی حکم نہیں ہے بلکہ ایک دوستانہ مشورہ ہی سمجھو''

بھولی اُٹھ گئی۔

''اب اپنا نام بتاؤ ۔ ۔ !''

بھولی کا جسم پسینے سے بھر گیا، تاہم اس نیک اُستانی کی خاطر اُس نے جواب دینے کی کوشش کی۔ بھولی کو اُمید تھی کہ اُستانی اُس پر

Kashmir Treasures Collection, Srinagar

CC-0. In Public Domain. Digitized by eGangotri.

نہیں ہنسے گی۔

''بھ ۔ ۔ بھ ۔ ۔ بھو'' ۔ ۔ اور اُس کی زبان لڑکھڑانے لگی۔

''ٹھیک ہے، ٹھیک ہے'' ۔ ۔ اُستانی نے اُس کی حوصلہ افزائی کی۔

''چلو، اب پورا نام بتاؤ ۔ ۔ !''

''بھو ۔ ۔ بھولی''

آخر کار وہ کہنے میں کامیاب ہوگئی اور اُس نے راحت محسوس کی جیسے یہ ایک بہت بڑی کامیابی ہو۔

''بہت خوب'' ۔ ۔ اُستانی نے پیار سے کہا۔

''خوف کو اپنے دل سے نکال دو اور پھر تم بھی سب کی طرح بول پاؤ گی''

بھولی نے یوں اُس کی طرف دیکھا جیسے وہ پوچھنا چاہتی ہو :

''واقعی ۔ ۔ ؟''

''ہاں، ہاں ۔ ۔ یہ بہت آسان ہے، تمہیں بس پابندی سے اسکول آنا ہے۔ کیا تم آؤ گی ۔ ۔ ؟''

بھولی نے سر ہلایا۔

''نہیں، اونچی آواز میں کہو''

''ہا ۔ ۔ ہاں'' ۔ ۔ بھولی حیرت زدہ تھی کہ وہ یہ کہنے میں کامیاب ہوگئی۔

''اب یہ کتاب لے لو''

کتاب میں رنگین تصویریں تھیں۔ یہ تصویریں کتے، بلی، بکری، گھوڑے، طوطے، شیر اور لکشمی جیسی گائے کی تھیں اور ہر تصویر کے ساتھ بڑے سیاہ حروف میں ایک لفظ لکھا ہوا تھا۔

''ایک مہینے میں تم یہ کتاب پڑھ سکو گی، پھر میں ایک بڑی کتاب دوں گی اور پھر اُس سے بھی بڑی۔ پھر کوئی بھی تم پر نہیں ہنسے گا۔ لوگ تمہاری بات غور سے سنیں گے اور تم بغیر کسی لڑکھڑاہٹ کے بول سکو گی، سمجھی۔

اب تم گھر جاؤ اور کل صبح سویرے آنا''

بھولی کو ایسا لگا جیسے اچانک گاؤں کے مندر میں ساری گھنٹیاں بج رہی ہوں اور اسکول کے سامنے درخت پر بڑے بڑے پھول کھلے ہوں۔ اُس کا دل ایک نئی اُمید اور نئی زندگی کے ساتھ دھڑک اُٹھا۔

سال گزرتے رہے۔ گاؤں ایک چھوٹے شہر میں تبدیل ہوگیا۔ پرائمری اسکول اب ایک ہائی اسکول بن گیا۔ اب وہاں ایک سنیما بھی تھا اور ایک روئی کی چکی۔ اب وہاں ٹرین بھی چلتی تھی اور باضابطہ ریلوے اسٹیشن بھی تھا۔

ایک رات رام لال نے اپنی بیوی سے کہا :

''پھر کیا میں بشمبر ناتھ کی تجویز قبول کرلوں ۔ ۔ ؟''

''ہاں، ضرور'' ۔ ۔ اُس کی بیوی نے کہا۔

''بھولی خوش قسمت ہوگی کہ اُسے ایسا دولہا ملے گا۔ ایک بڑی دوکان، اپنا مکان اور بینک میں کئی ہزار روپے، اور خوشی کی بات یہ کہ وہ جہیز کی مانگ نہیں کر رہا ہے''

''یہ ٹھیک ہے لیکن وہ اتنا کم عمر نہیں ہے، تم جانتی ہو ۔ ۔ ؟ میری عمر کے قریب ہی ہے اور لنگڑا بھی۔ مزید یہ کہ اُس کی پہلی بیوی سے جو بچے ہیں وہ بھی کافی بڑے ہو چکے ہیں''

''تو پھر کیا فرق پڑتا ہے؟ پینتالیس یا پچاس ایک آدمی کے لئے کوئی بڑی بات نہیں۔ ہم خوش نصیب ہیں کہ وہ کسی اور گاؤں کا ہے اور بھولی کے چیچک کے نشان اور کم عقلی کا علم نہیں رکھتا۔ اگر ہم اس رشتے کے لئے ہاں نہیں کریں گے تو شاید وہ عمر بھر کے لئے کنواری ہی رہے گی''

''ہاں ۔ ۔ لیکن میں یہ سوچ رہا ہوں کہ بھولی کیا کہے گی''

''وہ بے وقوف لڑکی کیا کہے گی؟ اُس کی زبان ویسے بھی گنگ ہے''

''شاید تم ٹھیک کہہ رہی ہو'' ۔ ۔ رام لال بولا۔

Kashmir Treasures Collection, Srinagar

CC-0. In Public Domain. Digitized by eGangotri.

صحن کے دوسرے کونے میں رکھی ایک چارپائی پر بھولی سوئی ہوئی تھی۔ وہ جاگ گئی اور اپنے والدین کی گفتگو سننے لگی۔

بشمبر ناتھ ایک مشہور بنیا تھا۔ وہ بارات میں دوستوں اور رشتہ داروں کا ہجوم لے کر آیا۔ بارات موسیقی اور نغموں کے ساتھ رام لال کے گھر کی جانب بڑھ رہی تھی۔ دولہا سج دھج کے گھوڑے پر سوار تھا۔ یہ شاندار ماحول دیکھ کر رام لال کی خوشی کی کوئی انتہا نہ رہی۔ اُس نے کبھی سوچا بھی نہ تھا کہ اُس کی چوتھی بیٹی کی شادی اتنی لاجواب ہوگی۔ ایسا منظر دیکھ کر بھولی کی بڑی بہنوں کے دلوں میں اُس کے لئے حسد پیدا ہوگئی۔

جب مبارک ساعت آگئی تو پنڈت نے کہا :

''دُلہن کو لے آیئے''

سرخ ریشمی لباس میں ملبوس بھولی کو مخصوص جگہ پر مقدس آگ کے قریب بٹھا دیا گیا۔

''دُلہن کو پھولوں کی مالا پہناؤ'' ۔ ۔ بشمبر ناتھ کو اُس کے دوست نے اشارہ کیا۔

دولہے نے پھولوں کی مالا اُٹھائی۔ ایک عورت نے دُلہن کے چہرے سے ریشمی پردہ ہٹایا۔ بشمبر ناتھ نے جلدی سے نگاہ ڈالی۔ بھولی کو دیکھ کر مالا اُس کے ہاتھوں میں ہی رہ گئی۔

''کیا تم نے اسے دیکھا ہے ۔ ۔ ؟'' ۔ ۔ بشمبر نے اپنے ساتھ والے دوست سے کہا۔

''اس کے چہرے پر تو چیچک کے نشان ہیں ۔ ۔ !''

''تو کیا ہوا، تم بھی تو اب جوان نہیں ہو''

''ہوسکتا ہے، لیکن میں ایک ہی شرط پر اس سے شادی کروں گا۔ رام لال کو مجھے پانچ ہزار روپے دینا ہوں گے''

رام لال نے گڑگڑا کر اپنی پگڑی بشمبر ناتھ کے قدموں میں رکھ دی۔

''میری توہین مت کرو۔ میں دو ہزار روپے دوں گا''

''نہیں، پانچ ہزار۔ نہیں تو ہم واپس چلے جائیں گے۔ اپنی بیٹی کو اپنے پاس رکھو''

''مجھ پر رحم کرو۔ اگر آپ لوگ واپس چلے جائیں گے تو میں گاؤں میں کسی کو بھی منہ دکھانے کے لائق نہیں رہوں گا''

''تو پھر لاؤ پانچ ہزار روپے''

رام لال آنسو بہاتے ہوئے اندر چلا گیا، الماری کھولی اور روپے گننے لگا۔ اُس نے پانچ ہزار روپیوں کا بنڈل بشمبر ناتھ کے قدموں میں رکھ دیا۔ بشمبر ناتھ کے لالچی چہرے پر فاتحانہ مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ اُس نے صرف ڈرامے کے طور یہ سب کیا لیکن اس میں اُس کی جیت ہوئی :

''مجھے مالا دو''

ایک بار پھر دُلہن کے چہرے سے پردہ ہٹایا گیا، لیکن اس بار بھولی کی نظریں جھکی ہوئی نہیں تھیں۔ وہ سر اُٹھا کر مستقبل میں اپنے ہونے والے شوہر کی طرف دیکھ رہی تھی۔ اُس کی آنکھوں میں نہ غصہ تھا اور نہ ہی نفرت، صرف حقارت تھی۔ بشمبر ناتھ نے مالا دُلہن کے گلے میں ڈالنے کے لئے اُٹھائی، لیکن ایسا کرنے سے پہلے ہی بھولی کا ہاتھ بجلی کی طرح نکلا۔ اُس نے پھولوں کی مالا کو ایک طرف دھکیل دیا۔ مالا کو مقدس آگ نے اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ وہ اُٹھ کھڑی ہوگئی اور اپنے چہرے سے پردہ ہٹا دیا۔

''پتاجی ۔ ۔ !'' ۔ ۔ بھولی نے بلاخوف کہا۔

ماں، بہنیں، بھائی، رشتے دار اور پڑوسی اُس کی تیز طرار آواز جو کہ بغیر لڑکھڑاہٹ تھی، کو سن کر حیران رہ گئے۔

''پتاجی، اپنے پیسے واپس لے لیجئے۔ میں اس آدمی سے شادی نہیں کروں گی''

Kashmir Treasures Collection, Srinagar

CC-0. In Public Domain. Digitized by eGangotri.

رام لال ہکا بکا رہ گیا، جیسے اُس کے اوپر بجلی گر پڑی ہو۔ مہمان سرگوشی کرنے لگے :

''کتنی بے شرم اور بدصورت لڑکی ہے ۔ ۔ !''

''بھولی! ۔ ۔ کیا تم پاگل ہو؟'' ۔ ۔ رام لال چیخ پڑا۔

''تم ہمیں بدنام کرنا چاہتی ہو؟ ہماری عزت کے بارے میں کچھ خیال ہے تمہیں؟''

''آپ ہی کی عزت کے خاطر میں اس بوڑھے لنگڑے آدمی سے شادی کرنے کو تیار ہوگئی، لیکن اس طرح کا مطلبی، لالچی، حقیر اور بزدل آدمی میرا شوہر نہیں بن سکتا، بالکل نہیں اور کبھی نہیں''

''کتنی بے شرم لڑکی ہے۔ ہم سب نے اسے بے ضرر گونگی گائے کی طرح سمجھا تھا'' ۔ ۔ ایک بوڑھی عورت نے کہا۔

''ہاں، اماں ۔ ۔ آپ صحیح کہہ رہی ہیں۔ آپ سب نے مجھے گونگی گائے کی طرح ہی سمجھا، یہی وجہ ہے کہ آپ مجھے اس بے رحم مخلوق کے حوالے کرنا چاہ رہے تھے، خدا کے واسطے جواب دیجئے ۔ ۔ !''

بنیا بشمبر ناتھ اپنے مہمانوں کے ساتھ واپس جانے لگا۔ سازندروں نے اختتامی تقریب والے گانے بجانا شروع کردئے۔

رام لال بدحواس کھڑا رہا۔ اُس کا سر غم اور شرم کی وجہ سے جھکا ہوا تھا۔ مقدس آگ کی لپٹیں آہستہ آہستہ دم توڑنے لگیں۔ سب چلے گئے۔

رام لال بھولی کی طرف متوجہ ہو کر بولا :

''اب کون تم سے شادی کے لئے تیار ہوگا۔ آخر اب ہم تمہارا کیا کریں گے ۔ ۔ ؟''

بھولی نے اعتماد سے پُر اور سکون بھری آواز میں کہا :

''پتاجی! ۔ ۔ ۔ آپ فکر نہ کریں۔ بڑھاپے میں آپ کی اور ماں کی خدمت کروں گی اور میں اُسی اسکول میں پڑھانے جاؤں گی جہاں سے میں نے سب کچھ سیکھا ہے۔ کیا میں ٹھیک کہہ رہی ہوں اُستانی جی ؟''

بھولی کی اُستانی جو یہ سارا منظر دیکھ رہی تھی، بھولی سے مخاطب ہو کر کہا:

''ہاں بھولی، تم سب ٹھیک کہہ رہی ہو''

اُستانی کی مسکراتی آنکھوں میں ایک گہری اطمینان کی روشنی تھی جو ایک فنکار غور کرنے پر محسوس کرتا ہے، اُس کے شاہکار کی تکمیل ۔ ۔ !!

(انگریزی سے ترجمہ)

☆ ☆

مرحوم بشیر شاہ

کا منفرد انداز فکر

اور مخصوص اسلوب و بیان میں مجموعۂ تخلیقات

''یادوں کا سفر''

حصہ اوّل

ترتیب و تہذیب : نور شاہ

رابطہ :

میزان پبلی شرز، بٹہ مالو، سرینگر، کشمیر

فون : 7006773403

Kashmir Treasures Collection, Srinagar

CC-0. In Public Domain. Digitized by eGangotri.

احمد رشید
989711153

افسانچے ۔ ۔

ایک خط

سمدھی جی ۔ ۔ رام کا نام ستیہ ہے۔ بولنے ہی میں مکتی ہے۔ ایک نہ ایک دن مجھے بھی اور آپ کو بھی جیون تیاگ کرنا ہے۔ اس لئے مجھے اور آپ کو بھی سچ بولنا اور سننا چاہئے۔ آپ کا مانگ پتر ملا۔ اس میں لڑکے کی شکچھا، کپڑا لتا، جیب خرچ سب ہی کا حساب لکھا ہے، لیکن لڑکے کے کریا کرم کے دام لکھنا شاید آپ بھول گئے۔ جلد لکھیں۔

بڑا پاپ

اس نے اپنی گلہری جیسی مونچھوں کو چٹکی میں لیتے ہوئے کہا :

''میں نے گوجروں کی مان مریادا کی خاطر اسے زہر دے دیا۔ یار سوچ وہ زندہ رہتی، لوگ انگلیاں اُٹھاتے۔ آج ہم سماج کے سامنے سینہ تان کر باتیں کر رہے ہیں نہ کر رہے ہوتے ۔ ۔ ؟''

''ہاں'' ۔ ۔ میں سوچ رہا تھا۔ اس نے دو زندگیوں کا قتل کیا اور اس کی بیٹی نے تو صرف عزت کا قتل کیا۔ ان میں بڑا پاپ کون سا ہے؟

موت

چٹان کے نکڑ پر وہ کھڑا تھا ۔ ۔ اپنی آنکھیں بند کئے۔

''تم مرنا چاہتے ہو ۔ ۔ ؟''

''ہاں مجھے زندگی سے فرار چاہئے''

''اس طرح! جسم کا ایک عضو بھی باقی نہ رہے گا''

''لاؤ پیسے ۔ ۔ میں بھوکا ہوں۔ زندگی کھاؤں گا اور زہر سے پیٹ بھروں گا''

پتھر کا دیوتا

اُو بھگوان، تو بڑا دیالو ہے، اور میں ۔ ۔ میں تو انسان ہوں۔ جب کوئی غربت کی آگ میں جلتا ہے، جب کوئی مظلوم بے گناہ مرتا ہے، جب کسی کی عصمت کا سودا ہوتا ہے، یہ سب دیکھ کر میں اپنی آنکھیں بند کر لیتا ہوں۔ تو بتا کیا کرتا ہے؟ تو تو دیوتا ہے ۔ ۔ ۔ اور پتھر کہیں روتا ہے۔

بھکارن

سڑک پر چلتے پھرتے مسافروں کا ایک ہجوم تھا۔ فٹ پاتھ پر بہت سے مایوس چہرے بھی تھے۔ ان میں ایک وہ بھی تھی۔ اُس کا نیم برہنہ جسم گداز تھا جو اُس کے گندے پھٹے کپڑوں میں سے چمک رہا تھا۔

''تم کیوں رو رہی ہو ۔ ۔ ؟''

''ہر شخص ہر بھکاری کو بھیک دیتا ہے، لیکن مجھے گھورتا ہے، قدم رُک جاتے ہیں۔ ہونٹوں پر بھکاریوں جیسی مسکراہٹ پھیل جاتی ہے۔ کیا یہ میری بے چارگی کا مذاق ہے؟''

''ہر شخص ہر بھکاری کو بھیک دیتا ہے، لیکن تم ایک بھکارن ہو۔ نگاہیں حسن پر جمتی ہیں، قدموں میں دوشیزگی کی زنجیریں لپٹتی ہیں، ہونٹوں پر مسکراہٹ اس لئے پھیل جاتی ہے کہ یہ تمہاری جوانی کا سودا ہے''

''تم بھی تو مرد ہو لیکن اتنے ہمدرد کیوں؟''

''تمہارے آنسوؤں نے مجھے روکا ہے''

''تم جھوٹ بول رہے ہو، یہ سب بھکاری رو رہے ہیں، سسک

Kashmir Treasures Collection, Srinagar

CC-0. In Public Domain. Digitized by eGangotri.

رہے ہیں۔تم نے سب ہی کو بھیک دی لیکن کسی سے یہ نہیں پوچھا،''تم کیوں رو رہے ہو''

درشن

ابھی وہ رام جی کے درشن بھی نہیں کر پایا تھا کہ پکڑو پکڑو کی آواز سن کر بھاگا۔ بھاگتے بھاگتے گاندھی جی کی مورتی کے چرنوں میں پناہ لی اور پکڑا گیا۔اس کی پٹائی ہونے لگی :

''سالے، چمار ہو کر تیری ہمت کیسے ہوئی مندر پر چڑھنے کی''

اور آخر کار رام کا نام لے کر اُس کی آنکھیں پھوڑ دی گئیں۔

وہ سوچنے لگا جس پتھر کو تراش کر میں نے ''رام'' بنایا اُسی کلا کی پوجا نے میری آنکھیں بھینٹ لے لیں۔

قریب ہی گاندھی جی کی آنکھوں میں رام راجیہ کا سپنا ڈوب رہا تھا۔

رخصت

لڑکی اپنے عاشق کے ساتھ بھاگ گئی۔ پتہ لگا کہ جب لڑکی والے عاشق کے گھر داخل ہوئے تو عاشق کے والد نے بڑی گرم جوشی سے اپنے مہمانوں کا استقبال کیا۔

''تجھ کو شرم نہیں آئی'' ۔ ۔ ایک مہمان نے کہا۔

''شادی کرنا کیا شرم کی بات ہے'' ۔ ۔ لڑکی نے جواب دیا۔

''اپنے والدین سے مشورہ کیا ہوتا ۔ ۔ !''

''ایجاب وقبول کا حق مرد وزن کو حاصل ہے نہ کہ والدین کو''

''تمہاری والدہ نے رو رو کر گھر بھر دیا ہے''

''وہ تو ہر ماں اپنی بیٹی کی رخصت پر روتی ہے''

فیاضی

سیٹھ جی کی فیاضی کا چرچہ پورے شہر میں تھا کہ انہوں نے کرفیو زدہ علاقوں میں گھر گھر بازار کے داموں میں آٹا تقسیم کیا۔

سیٹھ جی نے فساد کے نام جام پیتے ہوئے کہا :

''چیرس''

''سب کے دھندے چوپٹ ہیں، پھر بھی میں نے بساندے آٹے پر خوب نفع اور مفت میں فیاضی پائی''

بداخلاق

وہ سوچ رہا تھا :

''میں کس قدر بداخلاق ہو گیا ہوں کہ اس کی آمد پر چائے بھی نہیں پلائی''

میں سوچ رہا تھا ۔ ۔ ''اگر میری جیب خالی نہ ہوتی تو میں یقیناً اخلاق خرید لیتا''

فرق

شہر کی دوکانیں جلیں، گھر جلے، رحیم نے چاقو کھایا، رام نے گولی کھائی، زمین خون میں نہائی، مٹی میں مٹی ملی، خون میں خون مل گیا۔خون کا فرق مٹ گیا ۔ ۔ ۔ میں سوچتا ہوں رام اور رحیم کا خون کیوں ہوا؟

☆ ☆

Kashmir Treasures Collection, Srinagar

CC-0. In Public Domain. Digitized by eGangotri.

زنفر کھوکھر
9858009983

انشائیہ - -

بیوی اور گاڑی

سمجھ میں نہیں آتا ہے کہ ''بیوی اور گاڑی'' دونوں میں سے کس کو کس پر ترجیح دوں۔ چاہت کے کس خانے میں کس کو رکھوں۔ یوں تو ایک بیوی ہی کافی ہوتی ہے، جیبیں ہلکی پھلکی کرنے کے لئے اور دیگر بہت کچھ بھی۔ دیکھا جائے تو بیوی کہاں کہاں نہیں گھوماتی پھراتی ہے۔ ڈرائنگ روم سے کچن تک، صحن سے چھت تک۔ یہ کرو، وہ کرو۔ گھر کے ایک کونے سے دوسرے تک دوڑاتی پھراتی ہے۔ خیر گھر کو چھوڑیئے۔ ذرا باہر کی خبر لیتے ہیں۔ آئے دن مانگے، آئے دن ہسپتال، شاپنگ مالز، پکنک سپاٹس وغیرہ وغیرہ۔ اور ان سب میں اگر کوئی کوتاہی اور کمی رہ جائے تو بسا اوقات سالوں پر محیط کورٹ کچہری کے چکر تک لگوا دیتی ہے۔ اور جب ساتھ گاڑی بھی ہو تو پھر کیا کہنے۔ آج یہاں، کل وہاں۔ جہاں نہیں جانا ہے وہاں بھی جانا ہے۔

ہمارے لئے ایک عدد بیوی ہی کافی تھی۔ مگر بیوی کی فرمائش کہ گاڑی چاہیے۔ اب جسے گھر میں امن وسکون چاہیے، وہ بیوی کی کوئی فرمائش ٹال ہی نہیں سکتا ہے۔ اور بیوی کیا کیا فرمائش نہیں کرتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ صرف ایک چیز کو چھوڑ کے بیوی ہر چیز کی فرمائش کر سکتی ہے۔ ''مجھے یہ چاہیے۔ مجھے وہ چاہیے۔ فلاں کے پاس یہ ہے۔ فلاں کے گھر میں یہ ہے۔ وہ ہے۔ فلاں کی بیوی نے یہ پہنا ہے۔ ایسی جیولری ہے اس کے پاس وغیرہ وغیرہ۔ مگر کیا آپ نے کبھی یہ سنا ہے کہ کسی بیوی نے کہا ہو کہ مجھے ایک عدد سوتن چاہیے'' یقیناً ہرگز نہیں۔ کیونکہ دبی کچلی یہ ایک اکیلی خواہش صرف شوہر کی ہوتی ہے۔ بیوی کی ہرگز نہیں۔

گاڑی کی بات چلی تو ہم گاڑی کے بارے میں سوچنے لگے۔ سوچ سوچ کر آخر ہمیں گاڑی لینی ہی پڑی۔ گاڑی سے واسطہ پڑا تو کئی پردے اٹھے۔ ہم پر کئی راز منکشف ہوئے اور ہم اس نتیجے پر پہنچے کہ بیوی اور گاڑی میں بڑی حد تک یکسانیت پائی جاتی ہے۔

نئی نئی گاڑی ہو یا نئی نویلی دلہن، دونوں ہی خوشی کا باعث ہوتی ہیں۔ اور قدرِ مشترکہ کی حامل بھی۔ یعنی اپنی ذات اور صفات کے حوالے سے ایک دوسرے سے بہت قریب کی حد تک ملتی جلتی ہیں۔ پہلی مماثلت تو یہی ہے کہ دونوں اپنے آپ میں ایک خاص کشش اور چمک ودمک رکھتی ہیں۔ اپنے ہوں یا پرائے، گھر والے ہوں یا باہر والے، سب ہی نئی گاڑی اور نئی دلہن کو دیکھنے کے متمنی اور خواہش مند ہوتے ہیں۔ دونوں کے وسیلے سے مٹھائی اور مبارک بادیوں کے سلسلے چل پڑتے ہیں۔ دونوں کے ذریعے اور وسیلے سے آمد ورفت شروع ہو جاتی ہے۔ نئی نئی جگہوں پہ جانے اور بہت کچھ دیکھنے کا موقعہ ملتا ہے۔ طرح طرح کے لوگوں سے میل ملاپ بڑھتا ہے۔ دونوں یعنی بیوی اور گاڑی ثابت قدم چلتی رہیں تو آدمی پہلے سے کچھ حد تک محترم اور معتبر بھی ہو جاتا ہے۔

گاڑی خرید کر آدمی بے حد خوش ہوتا ہے کہ اب وہ گاڑی والا ہو گیا ہے۔ بعد میں کیا ہوتا ہے' گاڑی کتنا خرچہ مانگتی ہے' کتنے چالان کٹواتی ہے۔ اس کی اسے مطلق پرواہ نہیں ہوتی ہے۔

بالکل اسی طرح شادی کرنے والا بندہ بھی بوقتِ شادی بے حد خوش

Kashmir Treasures Collection, Srinagar

CC-0. In Public Domain. Digitized by eGangotri.

ہوتا ہے کہ وہ کامیاب رہا۔اب وہ صرف صاحب نہیں بلکہ صاحبِ بیگم ہے۔بعد میں کیا ہوتا ہے۔بیوی نبھنے نبھانے میں کیسی نکلتی ہے۔دیکھ ریکھ اور مینٹیننس کے حوالے سے کتنی مہنگی پڑتی ہے۔۔۔۔۔۔!ان سب باتوں کی اُسے بوقتِ شادی مطلق پرواہ نہیں ہوتی ہے۔

دونوں یعنی بیوی ہو یا گاڑی' اِنہیں کسی دوسرے یا ایرے غیرے کے حوالے یا حفاظت میں نہیں دیا جاسکتا ہے۔دونوں میں سے کسی کو بھی با عملِ مجبوری' کہیں اکیلے یا کھلے میں چھوڑنا پڑے تو

ایک نامعلوم سا خوف وخطرہ لاحق رہتا ہے۔دل میں طرح طرح کے اور ناقابلِ بیان وسوسے آنے جانے لگتے ہیں۔

چور اچکوں اور بدمعاشوں کی دونوں پر نظریں رہتی ہیں علاوہ ازیں دونوں کو دیکھ بھال کی اشد

ضرورت ہوتی ہے۔اور بعض مخصوص حالات میں مرمّت کی بھی۔

دونوں کے میک اپ اور مینٹیننس کے لئے آدمی کو اپنی آمدنی کا ایک مخصوص کوٹا ہر حال میں مختص رکھنا پڑتا ہے۔سننے میں آیا ہے کہ کوئی جناب کسی کی بیگم صاحبہ کو بڑے اشتیاق سے دیکھ رہے تھے۔تبھی صاحبِ بیگم چپکے سے جا کر اُن کے کان میں پھسپھسائے ''کسی دن میک اپ کے بغیر جو دیکھنا پڑا تو چیخ مار کر بھاگ نکلو گے۔''

ایسا ہی کچھ گاڑی سے بھی متعلق ہے۔میلی کچیلی یا گرد آلود گاڑی بڑے شہروں میں نظر آئے تو جرمانہ عائد کیا جاتا ہے۔لہٰذا خوبصورت دِکھنے اور دکھانے کے لئے دونوں کو بنائے اور سجائے رکھنا ضروری ہوتا ہے۔اِسی لئے تو جگہ جگہ بیوٹی پارلر اور سروس سٹیشن بنائے گے ہیں۔بس ضرورت ہوتی ہے ان کو بروئے کار لانے کی اور سو فیصد فیض اُٹھانے کی۔

ایک اور مماثلت جو دونوں میں پائی جاتی ہے اور جو سب سے اہم ہے وہ یہ ہے کہ دونوں کے معاملے میں احتیاط اور تدبیر بے حد ضروری ہے۔ذرا سی بے احتیاطی ہوئی نہیں کہ انسان دردناک انجام تک پہنچ سکتا ہے۔ذرا سی آنکھ جھپکی نہیں کہ کوئی نہ کوئی حادثہ یقینی ہو گیا۔

ان حدشات سے بچنے کے لئے دونوں کا یعنی بیوی اور گاڑی کا مزاج آشنا ہونا بہت ضروری ہوتا ہے۔اور ظاہر سی بات ہے کہ مدتیں نہ سہی مگر ایک وقت تو درکار ہوتا ہی ہے مزاج آشنائی کے لئے۔

مگر ہم لوگوں سے چوک یہیں پر ہو جاتی ہے۔بیوی ہو یا گاڑی' دونوں کے معاملے میں ہم بہت جلد باز اور اُتاولے واقع ہوتے ہیں۔بغیر مزاج آشنائی کے ہواؤں میں اُڑنے، اُڑانے لگتے ہیں۔اور مات کھا جاتے ہیں۔

دراصل انسان کی اسی جلد بازی کا نتیجہ ہوتا ہے کہ آج دھوم دھام سے شادی ہوئی اور کل طلاق واقع ہو گئی۔یا پھر نئی نویلی دلہن کی خودسوزی یا خودکشی کا الزام سر لے کر جناب مع والدین، سلاخوں کے پیچھے رُوپوش ہو گے۔اخبارات ایسی خبروں سے بھرے ہوتے ہیں۔

بھلا کون بے وقوف اپنے ہاتھوں سے اپنی نئی نویلی دلہن کو آگ لگاتا ہے۔مگر ہم لوگ اپنے اُتاولے پن کی وجہ سے اور محض مزاج ناآشنائی کی وجہ سے، ایسے سنگین الزامات اپنے سر لینے کے حالات پیدا کر دیتے ہیں۔

اسی طرح گاڑی کے مزاج سے بھی ناآشنائی کا یہی نتیجہ ہوتا ہے کہ ادھر گاڑی لی، اور اُدھر چند دنوں یا ہفتوں کے اندر ہی اندر ٹوٹی پھوٹی اور چکنا چُور ہوئی گاڑی مرمّت کے لئے ورک شاپ میں پہنچ گئی۔اب بھلا جس دلہن کے ہاتھوں کی مہندی کے نقش ونگار پھیکے نہ پڑے ہوں، اور جس گاڑی کے ٹائر رائی برابر گھسے نہ ہوں۔سیٹ کور تک میلے نہ ہوے ہوں اور وہ حادثے کا شکار ہو جائیں۔کتنی افسوس ناک بات

Kashmir Treasures Collection, Srinagar

CC-0. In Public Domain. Digitized by eGangotri.

ہے۔۔۔۔۔۔۔! مختصر یہ کہ دونوں ہی شعلہ مزاج واقع ہوئی ہیں۔ ذرا سی لاپرواہی اور بے احتیاتی برتی نہیں کہ یہ جاوہ جا، ہوئیں دونوں۔ ذرا سی لاپرواہی سے دونوں ہی بھڑک اٹھتی ہیں۔

دونوں کی ایک قدرِ مشترک یہ ہے کہ دونوں کو اپنے کنٹرول میں رکھنا پڑتا ہے۔ اور دونوں اگر کنٹرول میں رہیں۔ بندے کے حکم کے تابع رہیں تو زندگی نہایت خوشحال اور آرام دہ۔

ورنہ۔۔۔۔۔۔۔۔! دراصل دونوں کی عزت و آبرو اور سلامتی بس اسی میں ہے کہ وہ بندے کے کنٹرول اور بس میں رہیں۔ اگر بیوی کنٹرول سے باہر ہو جائے تو بندہ کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہتا ہے۔ اور گاڑی جب کنٹرول سے باہر ہو جاتی ہے تو وہ خود دیکھنے کے قابل نہیں رہتی ہے۔ کیونکہ جب گاڑی کنٹرول سے باہر ہوتی ہے تو وہ کہیں نہ کہیں اور کسی نہ کسی چیز سے ٹکرائے گی اور منہ کی کھائے گی۔ اس کا حلیہ اور چہرہ چکنا چور ہو جائے گا۔ اور یہ بالکل اچھا نہیں ہوتا ہے کہ نئی نئی گاڑی منہ کی چوٹ کھا کر ٹوٹ پھوٹ جائے۔ دراصل دونوں کی ایک خاص مماثلت یہ ہے کہ دونوں نہایت منہ زور ہوتی ہیں۔ نہایت ضبط اور کنٹرول کے باوجود اکثر بے قابو اور بے لگام ہو جاتی ہیں۔

نئی نویلی دلہن جب صد احترام اور ناز برداریوں کے باوجود اپنا کڑا رویہ اپنائے رکھتی ہے۔ اور اپنا بڑا پن اور دبدبہ قائم کرنے کے لئے بے قابو ہو کر بے لگام ہو جاتی ہے تو نتیجے میں اُس کے منہ پر پہلا چانٹا پڑتا ہے۔ اور اس کے سارے خواب چکنا چور ہو جاتے ہیں۔ اب یہ بات بھی بڑی افسوس ناک ہوتی ہے کہ نئی نویلی دلہن کے منہ پر چانٹا پڑے۔ دونوں سے وابستہ ایک حقیقت یہ بھی ہے کہ گاڑی ہو یا بیوی، منہ کی کھا کر نچلی ہو کر بیٹھنے والی نہیں ہیں۔ ظاہر سی بات ہے کہ ''چلتی کا نام گاڑی۔'' گاڑی کو چالو رکھنے کے لئے اس کی مرمّت ضروری ہوتی ہے۔ اس لئے اسے ورک شاپ میں لے جانا پڑتا ہے۔ بیوی چانٹا کھا کر نچلی ہو کر بیٹھ جائے تو وہ بیوی نہ ہوئی۔ گائے بھینس ہوئی۔ پہلے وقتوں میں بیوی بھاگ کر مائکے جاتی تھی۔ آج کل بیوی کے لئے وومین سیل کے دروازے کھلے ہوتے ہیں۔ جہاں شوہر کو پائے انجام تک پہنچانے کے کئی سلسلے ہوتے ہیں۔ اور جہاں پہنچ کر شوہر کو کئی پاپڑ بیلنے پڑتے ہیں۔

ایک قدرِ مشترک یہ بھی ہے کہ بگڑ جائیں تو دونوں نہایت بُری۔ جینا اور چلنا پھرنا دو بھر کر کے رکھ دیں۔ بیوی بگڑ جائے تو گھر نہیں چلتا ہے۔ آدمی گھر میں رہتے ہوئے بھی گھر کا رہتا ہے نہ گھاٹ کا۔ ساتھ چھوڑ دے تو بقیہ زندگی گزارنا دوبھر ہو جاتا ہے۔ زندگی ہچکولے کھانے لگتی ہے۔ اور آدمی رنڈوا کہلانے لگتا ہے۔ گاڑی بگڑ جائے تو سفر نہیں کٹتا ہے۔ آدمی گاڑی سمیت ہچکولے کھانے لگتا ہے۔

زندگی داؤ پر لگ جاتی ہے۔ دونوں کے تئیں کوئی لغزش ہو جائے تو بندے کو ہر حال میں سزا بھگتنی ہی پڑتی ہے۔ دونوں سے کسی بھی صلے یا اچھائی کی توقع فضول ہوتی ہے۔

بہر حال ایسا بھی نہیں ہے کہ دونوں صرف قدرِ مشترک کی ہی حامل ہیں۔ چند صورتوں میں دونوں یعنی بیوی اور گاڑی ایک دوسرے کے بالکل برعکس بھی ہیں۔ مثلاً رات کے ایک دو بجے یا کسی بھی پہر آپ کا کوئی پروگرام بن گیا اور باعملِ مجبوری، کسی کام سے آپ کو کہیں نزدیک یا دور پار جانا ہے تو

کیا مجال آپ کی گاڑی کو کوئی عذر یا انکار ہو۔ آپ اپنی گاڑی کا رُخ جس طرف بھی موڑیں گے، وہ اُسی طرف دوڑنے لگے گی۔ آپ کو بیوی کی طرح گاڑی کو منانا نہیں پڑے گا۔ سو سو جتن اور خوشامدیں نہیں

Kashmir Treasures Collection, Srinagar

CC-0. In Public Domain. Digitized by eGangotri.

کرنی ہونگی۔ کسی بھی طرح کے بہلاوے اور ماٹیویشن کی ضرورت نہیں پڑے گی۔

علاوہ ازیں آپ جب چاہیں گاڑی سے دست بردار ہو سکتے ہیں۔ مگر بیوی سے باآسانی پیچھا نہیں چھڑا سکتے ہیں۔ آپ اپنی گھسی پٹی گاڑی کے بدلے میں نئی خرید سکتے ہیں۔ مگر اپنی بیوی سے پلو نہیں چھڑا سکتے ہیں۔ گاڑی اونے پونے بھی بکے تو کچھ نہ کچھ دے کر ہی جاتی ہے مگر بیوی کا معاملہ اس کے برعکس ہوتا ہے۔ پہلے تو اس سے جان ہی نہیں چھوٹتی اور اگر چھوٹ بھی جائے تو مہر سمیت، نان و نفقہ اور ساتھ میں بچے بھی دینے پڑ جاتے ہیں۔ یوں ایک اچھا بھلا انسان یتیم و مسکین ہو کر رہ جاتا ہے۔ مختصر یہ کہ گاڑی کچھ نہ کچھ دے کر جاتی ہے۔ مگر بیوی سب کچھ لے کر جاتی ہے۔ اگر کچھ دیتی ہے تو ڈھیر ساری رسوائیاں، تنہائیاں اور ڈھیر سارے الزام تاکہ بندہ کسی اور کے قابل نہ رہے۔ لہٰذا دونوں کے معاملے میں از حد محتاط رہنے کی اشد ضرورت ہوتی ہے۔

☆ ☆

اُردو

شفافیت اور مٹھاس سے بھرپور زبان

آیئے اس کو اپنی پہچان بنائیں۔

ماہنامہ

"تحریر نو" ممبئی

اب نئے انداز، نئے اسلوب اور

نئے گیٹ اپ کے ساتھ

شائع ہو رہا ہے

مدیر : ڈاکٹر ظہیر انصاری

معروف اُردو قلم کار

ڈاکٹر منصور خوشتر کی ادارت میں

شائع ہونے والا

اُردو زبان و ادب کا

معتبر رسالہ

دربھنگہ ٹائمز

معیاری ادب کا ترجمان

رابطہ کریں :

دربھنگہ ٹائمز پبلی کیشنز، سبھاش چوک، دربھنگہ

Kashmir Treasures Collection, Srinagar

CC-0. In Public Domain. Digitized by eGangotri.

ظہیر خان
0321-3842177

انشائیہ ۔ ۔

شوہر دل بہار

اکبر دبے نہیں کسی سلطاں کی فوج سے
لیکن شہید ہوگئے بیگم کی فوج سے

حضرات! جس طرح دنیا میں بندروں کی بے شمار اقسام پائی جاتی ہیں اُسی طرح شوہروں کی اقسام بھی کچھ کم نہیں ہیں۔ آپ حیران ہوں گے کہ میں شوہر کے ساتھ بندر کا قافیہ کیوں کر لے آیا۔ تو میرے معزز قارئین کرام! شوہر اور بندر ۔ ۔ یہ دونوں الفاظ صرف ہم قافیہ ہی نہیں بلکہ ان دونوں کے دیگر معاملات میں بھی مماثلت پائی جاتی ہے۔ مشہور فلسفی ڈارون نے اپنے مشاہدات اور تحقیق کی بنا پر ہی تو کہا تھا کہ انسان پہلے بندر تھا۔ بس اُس سے تھوڑی سی بھول ہوگئی یا اُس نے تکلف سے کام لیا۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ اُسے اپنی بیوی کا پاس رہا ہو، ورنہ صاف لفظوں میں کہہ دیتا کہ ۔ ۔ ''شوہر پہلے بندر تھا''

شوہر پہلے بندر تھا ۔ ۔ یہ نکتہ وہی نکتہ داں سمجھ سکتا ہے جس کی بطور شوہر رسم تاج پوشی ادا ہو چکی ہو۔ آیئے ہم شوہروں کی اقسام پر بحث کرتے ہیں۔ تو قارئین کرام سب سے پہلے اُن شوہرات کا ذکر خیر کرتے ہیں جو اپنی بیگمات کے اشاروں پر ناچتے ہیں۔ لیجئے صاحب، ایک مماثلت تو اسی وقت سامنے آگئی۔ بندر بھی اپنے آقا کے اشاروں پر ناچتا ہے۔ لفظ شوہرات پڑھ کر یقیناً آپ چونک گئے ہوں گے۔ دھیرج رکھیں، میں اس کی وضاحت کئے دیتا ہوں۔ اگر بیگم کی جمع بیگمات ہوسکتی ہے تو شوہر کی جمع شوہرات کیوں نہیں ہوسکتی۔ اس طرح سے ہماری لغت میں ایک نئے لفظ کا اضافہ بھی ہوسکتا ہے۔ مندرجہ بالا تحریر میں لفظ اشارہ استعمال ہوا ہے۔ یہ محاورے والا اشارہ ہے۔ اس کا قطعی یہ مطلب نہیں ہے کہ ادھر بیگم گل بہار نے اشارہ کیا اور اُدھر شوہر دل بہار نے کتھک ڈانس شروع کر دیا۔ اشاروں سے مراد بیگم کا فرماں بردار ہونا اور بیگم کی فرماں روائی کا قائل ہونا ہے۔ جس طرح کا بھی فرمان صادر ہو، وہ واجب الاذعان ہے۔ رہ گئے خاندان اور دوست احباب، تو اُنہیں کہنے دیجئے، جو یہ کہتے ہیں :

''تم نے بیگم کو بہت سر پہ بٹھا رکھا ہے''

بھئی ہماری بیگم، ہماری مرضی۔ اب ہم بیگم کو سر پہ بٹھائیں یا چارپائی پر، وہ کون ہوتے ہیں ہمارے معاملاتِ دل شاد میں مداخلتِ دل خراش کرنے والے۔ کسی کے خانگی معاملات میں مداخلت کرنا ایک غیر اخلاقی اور غیر مہذبانہ فعل ہے، ہر کسی کو اس سے گریز کرنا چاہئے۔

اگر کسی والدین کی ایک ہی بیٹی ہے اور اُن کی خواہش ہے کہ شادی کے بعد بھی بیٹی ان کی آنکھوں کو ٹھنڈک پہنچاتی رہے تو انہیں ایک عدد گھر داماد درکار ہوتا ہے۔ بس مذکورہ بالا شوہروں کا مسکن اُس امیر زادی کا گھر ہوتا ہے۔ مجھے اس وقت مرزا عاصی اختر شدت سے یاد آرہے ہیں۔ موصوف اپنا تلخ مگر شیریں تجربہ اس طرح بیان کرتے ہیں :

ہم نے سسرال میں قیام کیا
زندگی بھر کچن میں کام کیا

کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ شوہر جس گھر میں قیام پذیر ہوتا ہے وہ گھر اور اس کے اندر کا ساز و سامان بیوی اپنے ساتھ جہیز میں لاتی ہے، لہٰذا اب

Kashmir Treasures Collection, Srinagar

CC-0. In Public Domain. Digitized by eGangotri.

شوہر محترم پر لازم ہے کہ بیوی کی تابع داری اُسی طرح کرے جس طرح ہمارے حکمران ذی شان IMF کی تابع داری کر کے اپنے باوفا ہونے کا بین ثبوت دیتے ہیں۔ چاہے قوم بھاڑ میں جائے، آقاؤں کو خوش رکھنا ان کا اولین فرض ہوتا ہے۔

کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ بیوی حسن و جمال میں اپنا ثانی نہیں رکھتی اور شوہر دلدادہ اپنی دل رُبا کے سامنے ہر وقت سر تسلیم خم کرنے کو تیار رہتا ہے۔ کیا دن کیا رات، کیا سردی کیا گرمی، بیوی کی ایک آواز پر لبیک کہنا اس کا شیوہ ہوتا ہے، اور اگر خدانخواستہ بیگم صاحبہ کسی بات پر ناراض ہوگئیں تو شوہر کے لئے قیامت سے کم نہیں ہے۔ وہ ہر جتن کرے گا اُسے منانے کے لئے، چاہے اُسے کتنی ہی بڑی قربانی کیوں نہ دینی پڑے۔ صبح سویرے آفس جانے سے قبل اپنا ناشتہ خود تیار کرنا اور بیگم صاحبہ جو اُس وقت خواب خرگوش کے مزے لوٹ رہی ہوتی ہیں، ان کا ناشتہ تیار کر کے کھانے کی میز پر باقاعدگی سے سجانا، اس کے بعد آفس جانا ۔ ۔ یہ ان شوہر فرماں بردار کا وتیرۂ خاص ہوتا ہے۔

سب کہاں ۔ ۔ کچھ شاعر حضرات بھی اسی زمرے میں آتے ہیں۔ کام کاج ان سے ہوتا نہیں، سارا دن گھر میں پڑے سگریٹ کا دُھواں اُڑاتے اور شعر کہتے رہتے ہیں۔ کبھی کبھار کسی مشاعرے کا دعوت نامہ مل گیا تو وہاں سے جو رقم حاصل ہوتی ہے اُس سے ان کا سگریٹ اور پان بآسانی آجاتا ہے۔ چولہا ٹھنڈا رہتا ہے، بیوی گرم رہتی ہے۔ ہر وقت گھر میں شور برپا رہتا ہے۔ بیوی ان پر حاوی رہتی ہے۔ اُس کی ہر بات مانتے ہیں سوائے اس کے کہ کوئی کام کاج نہیں کریں گے صرف شاعری کریں گے اور اُسی سے پیٹ بھریں گے۔ خالد عرفان نے کیا خوب نقشہ کھینچا ہے ؎

میری بیوی آج پھر مجھ پر ہوئی ہے طعنہ زن
بھاڑ میں جائے یہ تیری شاعری یہ تیرا فن

ابھی میرا مضمون یہیں تک پہنچا تھا کہ اندر زنان خانے سے ایک آواز آئی :

''اجی سنتے ہیں! ۔ ۔ کہاں غائب ہیں؟ کب سے ڈھونڈ رہی ہوں؟''

گویا میں شوہر نہ ہوا، بلی کا بچہ ہوگیا جسے اس قدر اہتمام سے ڈھونڈا جارہا ہے۔ تو حضرات اس وقت حالات کچھ سازگار نظر نہیں آرہے ہیں لہٰذا میں اپنا مضمون اسی جگہ اختتام کرتا ہوں۔ اگر زندگی رہی اور حالات سازگار رہے تو انشاء اللہ اگلی ملاقات میں شوہروں کی دوسری اقسام پر بحث کی جائے گی، تب تک کے لئے اجازت دیجئے۔ میرے لئے دُعائے خیر کرنا نہ بھولئے گا۔ اللہ حافظ۔

☆ ☆

نگینہ انٹرنیشنل

کو اپنی غیر مطبوعہ اور معیاری تخلیقات بھیج کر
اسے زیادہ سے زیادہ مقبول بنانے میں
اپنا حصہ ادا کریں
اور
اُردو کے تئیں اپنا فرض نبھائیں

Kashmir Treasures Collection, Srinagar

CC-0. In Public Domain. Digitized by eGangotri.

نور شاہ
9906771363

ایک افسانہ ایک ڈرامہ

جانے والے

کردار/آوازیں

۱۔ عورت
۲۔ نوکر
۳۔ مریض
۴۔ ڈاکٹر
۵۔ کہانی کار

کہانی کار: رات کافی گزر چکی تھی۔ ہر سمت تاریکی تھی۔ کبھی کبھار بجلی چمکتی تو پرانی سڑک کے دونوں طرف سپیدے کے لمبے لمبے درخت بھوت جیسے نظر آتے اور دور پہاڑی کے دامن میں نئے پرانے مکان عجیب سے لگتے تھے۔ ایسی ہی تاریکی میں وہ آہستہ آہستہ جا رہی تھی۔ اُس کی دھیمی دھیمی چال سے لگتا تھا جیسے وہ گہرے غم کی وادیوں میں گم ہو چکی ہو ۔ ۔ وہ ایک مکان کے سامنے رُک گئی اور پھر قریب جا کر گیٹ پر آویزاں نیم پلیٹ کو دیکھا۔ کچھ دیر دیکھتی ہی رہی اور پھر اُس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ اُبھر آئی۔ دوسرے ہی لمحہ کال بیل کا بٹن دبا دیا۔

کال بیل کی آواز اُبھرتی ہے اور فیڈ آؤٹ ہو جاتی ہے ۔ ۔ !

کہانی کار ایک لمحے کے لئے مسلسل خاموشی کا سکوت ٹوٹا اور پھر وہی خاموشی ۔ ۔ مسلسل خاموشی۔ اندر سے کوئی آواز سنائی نہ دی۔ اُس کے ہونٹوں کی مسکراہٹ غائب ہوگئی۔ اُس کی کنول جیسی آنکھیں پتھرا گئیں لیکن اُس نے فوراً ہی اپنے آپ کو سنبھال لیا اور دوبارہ بٹن دبا دیا۔

دُوبارہ کال بیل کی آواز اُبھرتی ہے اور فیڈ آؤٹ ہو جاتی ہے اور پھر دروازہ کھولنے کی صدا سنائی دیتی ہے

نوکر کس سے ملنا چاہتی ہیں آپ ۔ ۔ ؟

عورت ڈاکٹر صاحب سے ملنا ہے۔

نوکر (حیران ہو کر) ڈاکٹر صاحب سے ۔ ۔ !

عورت ہاں ہاں، ڈاکٹر صاحب سے۔

نوکر لیکن ڈاکٹر صاحب ابھی ابھی کوئی آپریشن کر کے آئے ہیں اور اب آرام کر رہے ہیں، میرا مطلب ہے سو رہے ہیں۔

عورت لیکن وہ سخت بیمار ہیں۔ اُن پر بے ہوشی کا دورہ پڑا ہے۔ اگر اُنہیں کچھ ہو گیا تو میری دنیا تاریک ہو جائے گی۔

نوکر لیکن ۔ ۔ !

عورت بھگوان کے لئے ڈاکٹر صاحب کو میرے بارے میں بتا دو۔ میں بڑی سے بڑی فیس دینے کے لئے تیار ہوں

نوکر آپ رُک جایئے۔ میں ڈاکٹر صاحب سے بات کرنے کی کوشش کروں گا۔

بارش برسنے کے تاثرات اور پھر فیڈ آؤٹ ۔ ۔

ڈاکٹر (تیز لہجے میں) تم نے مجھے کیوں Disturb کیا؟

Kashmir Treasures Collection, Srinagar

CC-0. In Public Domain. Digitized by eGangotri.

نوکر ایک عورت آپ کا انتظار کر رہی ہے۔

ڈاکٹر کون ہے وہ ۔ ۔ ؟

نوکر میں نہیں جانتا۔

ڈاکٹر عورت، انتظار اور رات کے اس وقت ۔ ۔ !

ڈاکٹر اچھا تم چلو، میں بھی آتا ہوں۔

موسیقی کی ایک لہر اُبھرتی ہے اور فیڈ آؤٹ ہو جاتی ہے۔

عورت ڈاکٹر! اُن پر بے ہوشی کا دورہ پڑا ہے۔ آپ میرے ساتھ چلئے۔

ڈاکٹر وہ کون ۔ ۔ ؟

عورت میرے پتی۔ اگر اُنہیں کچھ ہو گیا تو میری دنیا لٹ جائے گی۔

ڈاکٹر لیکن ۔ ۔ !

عورت میں آپ کی فیس دینے کو تیار ہوں۔ منہ مانگی فیس۔

ڈاکٹر میرا ڈرائیور چلا گیا ہے۔ کار کون ڈرائیو کرے گا؟ بہر حال میں چلوں گا آپ کے ساتھ۔

(وقفہ)

کہانی کار ڈاکٹر نے رین کوٹ کندھوں پر ڈال دیا، اپنا بیگ اُٹھایا اور وہ دونوں باہر آ گئے۔ رات اب بھی تاریک تھی اور بارش شدت اختیار کر چکی تھی۔

کہانی کار کچھ دور چل کر وہ ایک مکان کے سامنے رُک گئے۔ عورت نے گیٹ کھولا۔ ڈاکٹر قریب ہی تھا۔ اُس نے ایک کمرے کی جانب اشارہ کیا جہاں اُس کا مریض بے ہوش پڑا تھا۔ ڈاکٹر نے بغیر کچھ کہے اُس کا معائنہ کرنا شروع کیا۔ خود وہ تھوڑے فاصلے پر حسرت بھری نگاہوں سے دیکھ رہی تھی۔

ڈاکٹر کیا یہ بہت زیادہ پیتے ہیں ۔ ۔ ؟

عورت جی ہاں۔

ڈاکٹر ان کی حالت ٹھیک نہیں ہے۔ میں انجکشن لگا دیتا ہوں۔ مجھے یہاں رُکنا پڑے گا ۔ ۔ ان کی حالت جاننے کے لئے۔ مجھے یقین ہے کہ اس انجکشن سے ان کی حالت سدھر جائے گی۔

کہانی کار اور وہ عورت کمرے سے باہر چلی گئی۔ ڈاکٹر کو نیند آنے لگی اور وہ سو گیا۔ اچانک مریض کی آواز سن کر وہ جاگ گیا، گھبرا کر مریض کی جانب دیکھا۔ اُس کی حالت سدھر رہی تھی۔

ڈاکٹر کوئی ہے ۔ ۔ !

عورت میں ہوں نا ۔ ۔

ڈاکٹر دیکھئے، ان کی حالت میں تبدیلی آ رہی ہے۔ یہ ہوش میں آ رہے ہیں۔ خطرہ ٹل چکا ہے۔

عورت میں آپ کا شکریہ کیسے کروں ڈاکٹر ۔ ۔ !

ڈاکٹر میں نے اپنا فرض پورا کیا۔

عورت اب کوئی خطرہ تو نہیں۔

ڈاکٹر نہیں۔

عورت میں آپ کے لئے کافی بنا کر لاتی ہوں۔

(وقفہ)

کہانی کار اور یہ کہہ کر وہ عورت کمرے سے باہر چلی گئی۔ ڈاکٹر کی بھی آنکھ لگ گئی۔ جب وہ جاگ گیا تو دن نکل آیا تھا۔ اُس کے کانوں سے مریض کی آواز ٹکرائی۔

Kashmir Treasures Collection, Srinagar

CC-0. In Public Domain. Digitized by eGangotri.

مریض — میں کہاں ہوں؟ مجھے کیا ہو گیا تھا؟

ڈاکٹر — آپ آرام کیجئے۔ آپ کو آرام کی ضرورت ہے۔

مریض — لیکن ۔ ۔ !

ڈاکٹر — آپ اپنے ہی گھر میں ہیں۔ آپ بے ہوش ہو گئے تھے اور کافی دیر کے بعد آپ کو ہوش آ گیا۔

مریض — بے ہوش ۔ ۔ !

ڈاکٹر — آپ خوش قسمت ہیں کہ آپ کو دوبارہ زندگی ملی۔

مریض — لیکن ۔ ۔ آپ یہاں ۔ ۔ آپ کیسے مجھے دیکھنے کے لئے آئے۔

ڈاکٹر — آپ اپنی بیوی کی وجہ سے بچ گئے۔ اُس کے بلانے کے بغیر میں یہاں کیسے آ سکتا تھا ۔ ۔ !

مریض — میری بیوی ۔ ۔ آپ میری بیوی کے بارے میں کہہ رہے ہیں نا ۔ ۔ !

ڈاکٹر — جی ہاں! ۔ ۔ آپ، آپ حیران کیوں ہو رہے ہیں؟

مریض — میری بیوی ۔ ۔ !

ڈاکٹر — آپ کی بیوی ۔ ۔ وہ دیکھئے۔

مریض — کہاں ۔ ۔ کس طرف دیکھوں؟

ڈاکٹر — دیوار پر لٹکی ہوئی وہ تصویر آپ دیکھ رہے ہیں نا ۔ ۔ !

مریض — جی ہاں۔

ڈاکٹر — وہی آپ کی بیوی ہے نا۔

مریض — ہاں ہاں، دیکھ رہا ہوں ۔ ۔ مگر یہ نہیں ہو سکتا۔ ایسا ممکن نہیں ہو سکتا ۔ ۔ !

ڈاکٹر — کیوں؟ ۔ ۔ کیوں نہیں ہو سکتا ۔ ۔ کوئی وجہ؟

مریض — ہاں ہاں، میں کہتا ہوں کہ ایسا ہرگز ہرگز نہیں ہو سکتا

ڈاکٹر۔ میری بات کا یقین کیجئے۔

ڈاکٹر — کیسے یقین کروں ۔ ۔ ؟

مریض — اُسے مرے ہوئے چار برس بیت چکے ہیں ۔ ۔ !

۔ ۔ موسیقی اور فیڈ آؤٹ ۔ ۔

وحشی سعید کی مندرجہ ذیل تخلیقات

منظر عام پر آ چکی ہیں

''سُہ گر کیُتھ آسہِ''

اُردو افسانوں کا کشمیری ترجمہ

ترجمہ کار : رشید کانسپوری

''کُنی کُنی اَنہِ''

اُردو ناولٹوں کا کشمیری ترجمہ

ترجمہ کار : رشید کانسپوری

''شیشے کا سمندر''

افسانوی مجموعہ

"How that Abode would be?"

منتخب اُردو کہانیوں کا انگریزی ترجمہ

ترجمہ کار : مشتاق برق

رابطہ :

نگینہ انٹرنیشنل، ہوٹل شہنشاہ، بلیوارڈ، سرینگر

Kashmir Treasures Collection, Srinagar

CC-0. In Public Domain. Digitized by eGangotri.

ڈاکٹر نیلوفر ناز نحوی
9906570372

نور شاہ کے افسانوی مجموعے
''لفظ لفظ داستان'' پر تبصرہ

''لفظ لفظ داستان'' جناب نور شاہ صاحب کا ایک تازہ ترین افسانوی مجموعہ ہے۔ اگر صرف ان کے افسانوی مجموعوں کی بات کی جائے تو یہ ان کا گیارہواں افسانوی مجموعہ ہے۔ اس کتاب کو میزان پبلی شرز نے شائع کیا ہے۔ اس کتاب میں ۲۳/ افسانے، ۱۲/ افسانچے اور دیگر مختصر افسانچے کے عنوان کے تحت مزید ۸/ افسانچے ہیں۔ اس کتاب میں کچھ افسانوں پر تجزیے بھی شامل ہیں۔ یہ کتاب مجلد ہے۔ اس کے سرورق پر جھیل ڈل کی تصویر بنی ہے۔ اس میں ۱۵۸ صفحات ہیں اور اس کی قیمت ۳۵۰ روپے ہے۔

اس کتاب کو نور شاہ صاحب نے اپنے والدین مرحوم غلام نبی شاہ اور مرحومہ شاہ بیگم کے نام معنون کیا ہے جن کی یادیں اور باتیں اُن کے مطابق لفظ لفظ بن کر اُن کی داستان زندگی میں محفوظ ہیں۔

نور شاہ کے افسانوں میں ہمیشہ سے اپنے اردگرد کے موضوعات ملتے ہیں۔ اپنے کشمیر اور اپنے سامنے والوں کا درد ان کے افسانوں میں جھلکتا ہے، جس کو وہ اپنے اندرون میں محسوس کرتے ہیں اور اپنے ایک خاص طریقے سے افسانے کے رنگ میں رنگتے ہیں اور اس طرح کشمیر کہانی جنم لیتی ہے۔ یہی ان کا خاصا ہے۔

مگر افسانے کے اس مجموعے میں نور شاہ کا انداز الگ ہے۔ ان کی اکثر کہانیوں میں دوستی، محبت، ملن، طلاق، ملاپ، یادوں اور وعدوں کی عکاسی ملتی ہے۔ کبھی زندگی اور کبھی موت کی باتیں، کبھی دو عورتوں کے اسرار کی باتیں اور کبھی دو مردوں کے بیچ میں حسن اور عشق کی باتیں پڑھنے کو ملتی ہیں۔

''خواب گاہ میں دیوار پر لٹکی تصویر'' Me too پر نہایت مؤثر افسانہ ہے جس میں Boss کے ہاتھ میں آخر کار اپنی ہی بہن کا آنچل آجاتا ہے جو بچپن میں ایک دوسرے سے جدا ہوئے ہوتے ہیں۔ دیوار پر باپ کی تصویر کو دیکھ کر اپنے بھائی کو پہچانتی ہے۔

ان کا افسانہ ''آرزو'' اصل میں تین طلاق پر لکھا گیا ہے جو ہندوستان کے بہت اہم مسائل میں سے ایک ہے۔ اس افسانے پر حمزہ فضل اصلاحی نے ایک مختصر تجزیہ بھی تحریر کیا ہے جو شامل اشاعت ہے۔

یادوں اور وعدوں کی باتیں کرتے ہوئے افسانہ نگار ایک سنگ تراش ہونے کی آرزو کرتا ہے اور کہتا ہے :

> ''اگر میں ایک سنگ تراش ہوتا تو اپنی زندگی کے ابدی اندھیروں میں اُس پتھر کی تلاش کرتا جس نے کچھ خوبصورت اور کچھ بدصورت یادوں کو ترتیب دے کر مجھ سے میرا ماضی چھین لیا۔ ماضی اور روح دونوں ایک دوسرے کے متلاشی ہیں۔ دونوں ایک دوسرے کی تکمیل کے متمنی ہیں''
> (افسانہ : تب دوپہر تھی)

نور شاہ کے افسانوں میں محبت کی وہ چاشنی ملتی ہے جو جوان دلوں کو دھڑکاتی ہے۔ انسان یہ سوچنے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ نور شاہ جیسا معمر شخص آج بھی کیسے محبت اور عشق کی یہ وارداتیں اتنی خوبصورتی کے

Kashmir Treasures Collection, Srinagar

CC-0. In Public Domain. Digitized by eGangotri.

ساتھ بیان کرسکتا ہے کہ جیسے ایک شاعر اپنا شعر تراشتا ہے۔

''ایک نیا چہرہ، ایک نئی پہچان وکرم مسکرا رہا تھا۔ ایک لمحے کے لئے ایک نیا چہرہ دیکھ کر اس کے اندر کی تتلی کے پر پھڑ پھڑانے لگے۔ شاید رنگ رنگ کے پھولوں کی خوشبو چرانا تتلی کی فطرت میں شامل ہے''

(افسانہ : تتلی ؛ ص : ٦٣)

نورشاہ کبھی کبھی اپنے کشمیر کا رونا روتے ہیں اور کبھی اس کے مسکنوں کا، مگر خاصیت یہ ہے کہ بات اشاروں اور کنایوں میں ہوتی ہے۔ کھل کر بات نہیں ہوتی مگر بات سے بات جب نکلتی ہے تو ذہن کے دریچے کھل جاتے ہیں۔

''باغ سبز خاموش ہے اور میں بھی سوچ رہا ہوں۔ من ہی من میں اپنے آپ سے سوال کر رہا ہوں، کیا میرے باغ سبز کی معصومیت لوٹ آئے گی؟ باغ سبز کے رخساروں سے یہ دھبے مٹ جائیں گے ۔ ۔ ؟''

(افسانہ : باغ سبز ؛ ص : ٦٩)

نورشاہ کی ایک خاصیت زبان وبیان اور الفاظ کا چناؤ ہے جس کے بیان کرنے کا ہنر ایسا ہے کہ جس کی جتنی تعریف کی جائے کم ہے۔ اس کتاب کی ایک اور بہترین اور خوبصورت کہانی ''رشتے نئے پرانے'' ہے۔ یہ آج کل کے گھر گھر کی کہانی ہے، جس میں ایک چھوٹی بچی کو سنبھالنے کے لئے اور اُس کی پرورش کے لئے ایک خادمہ کو لایا جاتا ہے جس کا نام آمنہ ہے۔ آمنہ ذہنی مریضہ ہوتی ہے اس وجہ سے اس بچی سے پہلے اس کے ہاتھوں ایک بچی کا قتل ہوا ہوتا ہے اور یہ وہی عمل پھر سے دہرانے لگتی ہے لیکن اس کے دونوں ہاتھ ساکت ہو جاتے ہیں۔ اس کہانی کو بہت مؤثر اور بہترین انداز میں پیش کیا گیا ہے۔

''ایک نیا تجربہ'' افسانہ پڑھ کے مجھے ایسا لگا کہ مرد ذات کبھی بھی اُس ایک چیز پر کبھی اکتفا نہیں کرتی جو اُسے حاصل ہوتی ہے بلکہ وہ اُس چیز کی چاہت اور آرزو رکھتا ہے جو اُس کے دوست کو حاصل ہوتی ہے، پھر چاہے وہ اُس کے دوست کی بیوی ہی کیوں نہ ہو۔

اسی طرح افسانہ ''بدن'' پڑھ کر بھی مجھے یہ احساس ہوا کہ مرد کی نظروں میں عورت صرف ایک جسم ہے اور خوبصورت بدن۔ اس کے جذبات، اس کے احساسات، اس کی ممتا، اس کی سوچ اور اس کی روح کے معنی مرد کے سامنے کچھ بھی نہیں۔

مجھے لگتا ہے کہ ہمارے اس افسانہ نگار پر تتلیوں کا کچھ زیادہ ہی اثر ہے انہوں نے تتلیوں کا ذکر بارہا کیا ہے، مگر ہر جگہ تتلی کے معنی الگ ہیں :

''رنگ برنگی تتلیاں ذہنوں کو معطر کرتی رہی''

ایک افسانہ تتلیوں کا سفر ہے اس میں تتلیاں لڑکیوں اور ان کی محبتوں سے مراد ہے۔ ایک اور افسانے کا نام بھی تتلی ہے۔ اس میں تتلی کو کسی اور معنی میں لیا گیا ہے جیسے :

''ایک لمحے کے لئے ایک نیا چہرہ دیکھ کر اس کی اندر کی تتلی کے پر پھڑ پھڑانے لگے''

علاوہ ازیں اس مجموعے میں چند مختصر افسانچے موجود ہیں جو اکثر وبیشتر کرونا پر لکھے گئے ہیں جو دور حاضر کی ایک ضرورت بھی ہے۔ ایک مصنف اور افسانہ نگار جیسا پہلے ہی کہا گیا اپنے اردگرد کے ماحول سے اپنی کہانیاں چن لیتا ہے۔ یہ کہانیاں بھی اپنے ماحول سے لی گئیں ہیں خاص کر جس قسم کا ماحول ہمیں پچھلے ایک سال سے دیکھنے کو ملا جس سے صرف ہمارا ملک ہی نہیں بلکہ پوری دنیا جوجھ رہی ہے۔ اس مجموعے کے افسانوں کے عنوانوں کا ذکر میں نے اس طریقے سے کیا ہے۔ امید ہے آپ کو پسند آئے گا۔

Kashmir Treasures Collection, Srinagar

CC-0. In Public Domain. Digitized by eGangotri.

میں نے ''خواب گاہ کی دیوار پر لٹکی تصویر'' کو دیکھا میں نے ''آرزو'' کی ''ہماری ادھوری کہانی'' ''اندھیرے اجالے'' کے بیچ میں ''دو رنگوں کی کہانی'' ہو اور ''داستانِ محبت کا آخری سین'' ہو۔ میں نے اندر کی بات'' کہی ''تب دوپہر تھی'' ''تتلی نے ''رات کے سینے کا درد'' ''باغ سبز'' میں دکھایا اور ''تتلیوں کا سفر'' لمبے فاصلوں کی چھوٹی کہانی'' بن گیا۔ وہ ''خاموشیوں کا اداس چہرہ'' اور ''رشتے نئے پرانے'' ایک نیا تجربہ'' تھا اور پھر یوں ہوا'' کہ وقت کا چہرہ'' میری کہانی کا سچ اور پہچان بن گیا۔ اور بدن'' کا زخم تر نظر آیا۔

یہ سب کہانیاں پڑھنے کے قابل ہیں اور داد و تحسین کی حقدار ہیں۔

☆ ☆

وحشی سعید کا نیا افسانوی مجموعہ

''ارسطو کی واپسی''

ترتیب و تہذیب

نور شاہ، ڈاکٹر اشرف آثاری

رابطہ :

نگینہ انٹرنیشنل

ہوٹل شہنشاہ پیلس

بلیوارڈ، ڈلگیٹ، سرینگر (کشمیر)

''نگینہ انٹرنیشنل''

کے اگلے شمارے

''ادب نمبر''

میں اُردو اور پنجابی کے معروف کہانی کار

خالد حسین پر ایک گوشہ شامل ہوگا۔

دل سے جو بات نکلتی ہے اثر رکھتی ہے
پر نہیں ، طاقتِ پرواز مگر رکھتی ہے
قدسی الاصل ہے رفعت پہ نظر رکھتی ہے
خاک سے اُٹھتی ہے گردوں پہ گزر رکھتی ہے

نور شاہ ۔ ۔ فکر اور فکشن

ترتیب و تہذیب

محمد اقبال لون

رابطہ :

میزان پبلی شرز

بٹہ مالو، سرینگر (کشمیر)

Kashmir Treasures Collection, Srinagar

CC-0. In Public Domain. Digitized by eGangotri.

(۲)

محمد اقبال لون
7006538941

خالد حسین ممتاز کیوں؟

افسانوی مجموعہ ''جنت گرہن'' کا تجزیاتی مطالعہ

آج کے معاصر افسانوی دور میں خالد حسین ممتاز کیوں ہیں؟ اس سوال کا جواب دینے کے لئے خالد حسین کے تازہ ترین افسانوی مجموعہ ''جنت گرہن'' کا مطالعہ کشادہ نظری سے کئے جانے کا متقاضی ہے ''جنت گرہن'' کا عنوان پڑھتے ہی ''چاند گرہن'' اور ''سورج گرہن'' کی اصطلاحیں ذہن میں آتی ہیں۔ ''جنت'' خوشحالی کی علامت ہے اور ''گرہن'' تباہی کا استعارہ ہے۔ جب امن وامان کی سرزمین میں فسق وفساد کا بیج بویا جاتا ہے تو اس کا نتیجہ ''جنت گرہن'' کی صورت میں ہی نمودار ہوتا ہے۔ اس میں دو رائے نہیں کہ افسانہ نگار نے جموں وکشمیر سے موضوع اور مواد کا خمیر گوندھتے ہوئے قارئین کے لئے ایک ایسا منظر تخلیق کرنے کی کوشش کی ہے جو گرہن زدہ ماحول کی عکاسی کرتا ہے۔

آیئے اب تمہید کو مختصر کرتے ہوئے سیدھے خالد حسین کے تخیلی و افسانوی ارض وسما کی سیر کرتے ہیں۔ ان کے تازہ افسانوی مجموعہ ''جنت گرہن'' کا پہلا افسانہ ''عشق ملنگی'' ہے جو جموں کی تہذیب وثقافت اور تلخ ماضی کی حقیقی منظر کشی کرتا ہے۔ افسانہ کا مرکزی کردار کالے خان، فیروزہ سے یک طرفہ محبت میں گرفتار ہوتا ہے۔ افسانہ نگار کا کمال یہ نہیں ہے کہ مذکورہ افسانہ کے خمیر میں محبت کا یک طرفہ بیانیہ پیش کیا ہے بلکہ افسانہ نگار نے محبت کی تھیم کا سہارا لے کر فسادت کی ان کہی داستان منفرد اسلوب میں بیان کی ہے۔ افسانے کا کلائمکس قاری کو سوچنے پر مجبور کرتا ہے۔ آیئے ہم بھی افسانے کے آخری جملے کی شدت کو محسوس کرنے کی کوشش کرتے ہیں:

''بابو! یہ پتھر تو میں توڑ لیتا ہوں پر فیروزہ کے دل کا پتھر مجھ سے نہ ٹوٹ سکا''

''جنت گرہن'' کا ایک اور عمدہ افسانہ ''یادِ رفتہ'' دل دہلانے والے موضوع پر مبنی ہے۔ افسانہ میں ماضی کی بازیافت اور ناسٹلجیائی تکنیک کا بھرپور استفادہ کیا گیا۔ کہانی میں ایسی مقناطیسی کشش ہے کہ قاری کو آخر تک اپنی پکڑ میں رکھتا ہے۔ بلقیس بانو اور خواجہ حمید کی زندگی کے آخری پڑاؤ پر بچوں کی نافرمانی انہیں کسمپرسی کی زندگی جینے پر مجبور کرتی ہے۔ افسانہ نگار نے حقیقی زندگی سے واقعات مستعار لیتے ہوئے افسانے کے تانے بانے بنے ہیں۔

ایک بات کا اعتراف کرنا ضروری ہے کہ خالد حسین کے افسانے ایک ہی نشست میں نہیں پڑھے جاسکتے ہیں بلکہ جستہ جستہ پڑھنے کے بعد قاری ایک ایسی دنیا سے آشنا ہوتا ہے کہ کئی بار یہ محسوس ہوتا ہے کہ بقول شاعر ؎

کہانی میری روداد جہاں معلوم ہوتی ہے
جو سنتا ہے اسی کی داستاں معلوم ہوتی ہے

اسی طرز کا افسانہ ''اٹوٹ انگ میں پھنسی شہ رنگ'' ہے جس میں مرکزی کردار رابعہ کی کہانی پڑھنے کے بعد قاری آنسو بہائے بغیر نہیں رہ سکتا ہے۔ خاوند کے ظلم وستم سہتے سہتے تنگ آکر رابعہ اندھیرے میں ویران راستوں پر چلتے چلتے نکرکوٹ نالے میں جا گرتی ہے جہاں ٹھاٹھیں

Kashmir Treasures Collection, Srinagar

CC-0. In Public Domain. Digitized by eGangotri.

مارتی ہوئی موجیں اسے اپنی لپیٹ میں لے کر پونچھ کے دریا میں پہنچا دیتی ہیں اور باڈر کے اس پار جال میں پھنس جاتی ہے اور وہاں دیکھتے ہی فوج اس پر جھپٹ پڑتی ہے۔ ادھر بھی رابعہ کی تلخ کہانی ختم نہیں ہوتی، بلکہ کئی کٹھن مراحل سے گزرنے کے بعد ایک ننھی سی جان کو لیکر اس پر یہ ظلم روا رکھا جاتا ہے کہ وہ اپنے جگر گوشے کو اپنے ساتھ نہیں لے سکتی ہے۔ افسانے میں رابعہ کے تئیں سماج کی حد درجہ غیر ذمہ داری کی عکاسی کی گئی ہے۔ یہ افسانہ پڑھنے کے بعد ایک انسان کے اندر کی حیوانیت کو اجاگر کرتے ہوئے افسانہ نگار نے کمال ہنرمندی کا مظاہرہ کیا ہے۔

''کنواں اور کھائی'' ایک ایسے موضوع پر تخلیق کیا گیا ہے کہ جس میں استحصالی عناصر کی نقاب کشائی کی گئی ہے کہ کس طرح ایک مقصد کی خاطر بعض مفاد پرست اپنے مالی فائدہ کے لئے نت نئے بہانے تلاش کرتے ہیں اور معصوم انسانوں کی جانیں تلف ہو جاتی ہیں۔ لوگوں کو ایک خاص مقصد کے لئے تیار کیا جاتا ہے اور پھر اپنے مفاد کے لئے استعمال کیا جاتا ہے۔ ایسے موضوعات پر قلم اٹھانے کے لئے مشاہدات اور تجربات کی بھٹی میں تپ کر نکلنا بہت ضروری ہے ورنہ ادب'' پروپگنڈہ'' بننے میں دیر نہیں لگتی ہے۔ میری بات کا اندازہ افسانہ کا ایک جملہ سننے کے بعد لگایا جا سکتا ہے:

''اسے ہر جگہ وحشی، درندے ہی ملے۔ وہ سوچتی تھی کہ شاید وہ خدا انسان بنانے کا فن بھول گیا ہے، پت جھڑ کے موسم نے اس کے گھر آنگن میں ڈیرے جما لئے تھے''

''زندہ آنکھوں کی داستان'' اس قبیل کا اور ایک افسانہ ہے جس میں کشمیر کے آر پار کے خوں آشام حالات اور معصوم اور نہتے لوگوں کے قتل و غارت کو موضوع بنایا گیا ہے۔ افسانہ نگار تباہی اور بربادی کے ماحول میں بھی تعمیری روش کے پاس دار نظر آتے ہیں۔ جس کا ثبوت افسانے کے ایک کردار کرشن لال کا یہ درد بھرا پیام ہے:

''کہ کب تک ہم دشمنیاں پالتے رہیں گے اور ایک دوسرے کے سر کاٹتے رہیں گے۔ کیا ہم سرحد کے آر پار خوش بیانی سے کام نہیں لے سکتے۔ سکھ سندیش اور خوش خلقی کا مظاہرہ نہیں کر سکتے''

''زہر عشق'' اس مجموعہ کا ایک دلچسپ افسانہ ہے جس میں شاداں بلی کے ذریعے جموں کی تہذیبی و تمدنی ماحول کی عکاسی کی گئی ہے اور جہاں ایک طرف شاداں بلی کے کوٹھے کے تمام گاہکوں کے کرتوتوں کی نقاب کشائی مناسب پیرائیہ میں کی گئی ہے وہیں دوسری طرف بین السطور میں سماج میں پنپ رہی برائیوں اور خامیوں پر بھی طنز کرنے کی کوشش کی گئی ہے:

''وہ نصیبو کی سبھی ضرورتیں پوری کرتا لیکن اس کی صرف ایک ہی شرط تھی اور وہ یہ کہ نصیبو اپنے جسم کا نمک کسی اور کو چکھنے نہیں دے گی، پراسرار خان کو کون سمجھاتا کہ پانی کی مچھلیاں سارے مچھیروں کے لیے ہوتی ہیں، کسی خاص شخص کے لیے نہیں''

افسانہ نگار کا امتیاز یہ ہے کہ افسانے کا بیانیہ عشق، تصوف، معرفت اور عرفان جیسے خیالات سے مزین کیا گیا ہے اور ساتھ ہی افسانہ نگار صوفی شعرا کے کلام سے سرشار موسیقی میں سرور و رقص کرتے نظر آتے ہیں اور افسانے میں عرفان کے موتی بکھیرتے ہیں۔

''شہر خموشاں کا فرشتہ'' افسانے میں اخلاقی قدروں کی پامالی، طاقت ور کی غنڈہ گردی، سیاسی ٹھیکیداروں کی من مانی کو موضوع بنایا گیا ہے اور یہ دکھانے کی کوشش کی گئی ہے کہ کس طرح طاقت کے نشے میں چور

Kashmir Treasures Collection, Srinagar

CC-0. In Public Domain. Digitized by eGangotri.

اور سیاسی سرپرستی میں کچھ بدضمیر کس قدر سماجی اور اخلاقی قدروں کا جنازہ نکالتے ہیں۔افسانے میں جموں شہر کے ایک قبرستان کو کس طرح طاقت کے بل پر انیٹوں کے بھٹے میں تبدیل کیا جاتا ہے اور مردوں کی ہڈیوں کے ساتھ کس قدر بے حرمتی کی جاتی ہے، یہ رونگٹے کھڑے کرنے والی کہانی ہے۔بابا نورا کی درخواست پر نوٹس لینے والے آفیسر کو سیاسی اثر ورسوخ کے سہارے کس طرح ڈرا دھمکا کر راتوں رات تبدیل کیا جاتا ہے۔افسانے میں یہ منظر کشی کی گئی کہ مادیت میں غرق سماج کیا کیا غیر انسانی اور غیر اخلاقی کام کرتا ہے۔یہ واقعی عبرت ناک کہانی پر مبنی ہے، اس پر حقیقت کا سا گماں ہوتا ہے۔

''زندگی کے مارے لوگ'' کشمیر کے درد وکرب اور ناسازگار حالات پر مبنی ایک دلدوز کہانی ہے جس میں افسانہ نگار نے حقیقی صورت حال کی منظر کشی کرنے کی کوشش کی ہے۔افسانے میں راست بیانیہ کی تکنیک اپنائی گئی ہے اور یہ دکھایا گیا ہے کہ ضلع کپوارہ کے ایک گاؤں کلتورہ میں عوامی اجتماع کے دوران ایک معصوم اور بے گناہ غلام علی کو مارا جاتا ہے۔غلام علی اپنی اہلیہ اور بیٹی کا واحد سہارا ہوتا ہے۔باپ کے قتل کے بعد اس کی بیٹی رخسانہ کے ساتھ عدل وانصاف کے بلند بانگ دعوے کیے جاتے ہیں جو کبھی بھی پورے نہیں ہوتے۔اس دوران افسانہ نگار نے یہ ناقابل یقین سین دکھانے کی کوشش کی ہے کہ ایک فوجی آفیسر آدرش رخسانہ کو منہ بولی بہن تصور کر کے اس کے سارے اخراجات اٹھانے کا وعدہ کرتا ہے۔اس طرح افسانہ درد وغم اور حیرت واستعجاب سے پُر مناظر کی عکاسی کرتا ہے۔افسانے کا climax غور طلب اور درد دل رکھنے والوں کے لیے واقعی باعث تشویش بھی ہے۔

'ڈیڈی! کچھ نہیں بدلا۔آج بھی نہتے غلام علی گولیاں کھا رہے ہیں۔آج بھی معصوم اور بے گناہ مر رہے ہیں۔ آپ کتنے یتیموں کا پالن پوسن کریں گے؟ کتنوں کے گھر آباد کریں گے؟ آپ تھک جائیں گے جیسے ہم تھک چکے ہیں''

خالد حسین کے کئی افسانوں میں ایک چیز قدر مشترک ہے کہ کشمیر کے دونوں اطراف کے عوام جن مسائل ومشکلات اور کرب ناک صورتحال سے دوچار ہیں۔ان حقایق کی عکاسی اور تصویر کشی ان کی کہانیوں میں فنکارانہ انداز میں ملتی ہے۔اس قبیل کے افسانوں میں عشق ملنگی، یاد رفتہ، اٹوٹ انگ میں پھنسی شہ رنگ' کنواں اور کھائی، زندہ آنکھوں کی داستان، زندگی کے مارے لوگ، رحیمن دھاگہ پریم کا وغیرہ شامل ہیں جن میں کشمیر کے اِس پار اور اُس پار کی الجھنیں اور مصائب ومعاملات کی جابجا ترجمانی نظر آتی ہیں۔خالد حسین نے اپنے افسانوں میں جو علامتیں، استعارے یا جو اشارات وکنایات گڑھے ہیں انکی جڑیں بھی کشمیر کے دونوں اطراف کے ماحول، معاشرہ اور زمین سے پیوست ہیں۔لہٰذا ان علامتوں اور استعاروں کو اس تناظر میں سمجھنا ان کے افسانوں کی تفہیم کی جانب پہلا قدم ہوگا۔

اس کے علاوہ افسانوی مجموعہ میں جو دیگر دلچسپ اور قابل توجہ افسانے شامل ہیں ان میں کالے بادلوں میں چھپا سورج، کھیلن کو مانگے چاند، جوتی قصوری، لالہ غنی، رانجھا ماہی، بگلے بھگت، نئی دنیا کے خواب، لاگا پگڑی میں داغ، جانگلوس، اپنا دیش مہان، رحیمن دھاگہ پریم کا، حرص سمندر اور مداوا ہیں جو یقیناً قاری سے غور وفکر کا مطالبہ کرتے ہیں۔یہاں اس بات کا تذکرہ کرتا چلوں کہ افسانہ نگار کو زبان و بیان پر کمال کی قدرت حاصل ہے اور فن افسانہ کے اسرار ورموز سے بخوبی آشنا ہیں۔ان کے افسانوں کے مطالعے سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ موصوف علامتی اور استعاراتی افسانے لکھنے کا شعور رکھتے ہیں اور ادب

Kashmir Treasures Collection, Srinagar

CC-0. In Public Domain. Digitized by eGangotri.

برائے مقصدیت نظریے کے قائل نظر آتے ہیں کیونکہ ان کے افسانوں کے پس پردہ تعمیری سوچ کی کارفرمائی نظر آتی ہے۔ علاوہ ازیں افسانہ نگار کی مادری زبان پنجابی ہے اس لیے ان کے افسانوں میں Mother Tongue Influence نمایاں ہے اور ان کے افسانوں میں اس خوبی یا کمی کو محسوس کیا جاسکتا ہے۔

اس مجموعہ کے ابتدا میں جہاں ایک طرف اردو کے معروف محقق اور ناقد ڈاکٹر سید تقی عابدی کا پیش لفظ بعنوان

''کہانی ہو تو ایسی'' میں خالد حسین کے فکر و فن کے امتیازات پر مفصل روشنی ڈالی ہے اور ان کے ڈکشن اور کہانیوں کی انفرادی خوبیوں اور محاسن کو معروضی انداز میں قلمبند کیا گیا ہے۔ وہیں دوسری طرف عصر حاضر میں اردو تنقید کی معتبر آواز پروفیسر قدوس جاوید نے ''خالد حسین: جنت گرہن اور اردو افسانہ کی نئی بوطیقا'' کے عنوان کے تحت خالد حسین کے افسانوی سفر کے پیچ و خم پر دلچسپ اور پر مغز گفتگو کی ہے۔ پروفیسر موصوف نے اس فسانوی مجموعہ کے بیشتر افسانوں پر اپنا تجزیاتی نکتہ نگاہ پیش کیا ہے اور ساتھ ہی معاصر فکشن تناظر اور فکشن شعریات میں خالد حسین کے ادبی قد و قامت کا تعین کرنے کی مستحسن کوشش کی ہے۔ بقول قدوس جاوید ''خالد حسین کے فن افسانہ نگاری کی ایک نمایاں اور شناختی قوت ان کا اپنا مخصوص اور منفرد لسانی نظام بھی ہے جو پنجابی زبان کے بے کنار دریائی بہاؤ اور اردو زبان کی کشادہ دلی کی آمیزش و آویزش کے سبب ''دو آتشہ'' ہو جاتا ہے خالد عام طور پر پیچیدہ بیانی سے پرہیز کرتے ہیں'' اس کے علاوہ پنجابی زبان کے نقاد اور ناول نگار ڈاکٹر منموہن بھی فن افسانہ نگاری میں خالد حسین کی فنی و تکنکی مہارت، اظہار زبان کی سلیقہ مندی کے معترف ہیں۔

آخر پر بہ حیثیت طالب علم میں یہ استفسار کرنا چاہونگا کہ آیا کہ ''جنت گرہن'' اصطلاح موقع و محل کے اعتبار سے گوارا تو ہے لیکن زبان اور قاعدے کی رو سے یہ اصطلاح یا دو لفظوں کا مرکب معنی چہ دارد کے مترادف ہے اور یہ مرکب کچھ عجیب بھی ہے۔ لغوی اعتبار سے لفظ جنت عربی زبان کا لفظ ہے اور اسم کے طور مستعمل ہے اردو میں عربی سے ماخوذ ہے۔ اور لفظ ''گرہن'' سنسکرت زبان کا لفظ ہے۔ اردو میں سنسکرت سے ماخوذ ہے۔ چونکہ دونوں لفظ دو مختلف زبانوں کے ہیں ،اس لیے کیا یہ عنوان اصطلاحی اور معنوی اعتبار سے موزون و مناسب ہے؟ عمومی طور پر کسی افسانوی مجموعہ کا نام متعلقہ کتاب کے مشمولات سے ہی اخذ کیا جاتا ہے، ایک تو اس مجموعہ میں اس نام کا کوئی افسانہ موجود نہیں ہے۔ اگر اس نام کا کوئی افسانہ شامل کتاب ہوتا تو شاید قاری کے لیے یہ نام قابل فہم ہوتا۔

مجموعی طور ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ خالد حسین کا یہ افسانوی مجموعہ ''جنت گرہن'' ان کے ادبی قد و قامت کو متعین کرنے میں سود مند ثابت ہوگا۔ یہ کتاب "A Group of Chetna Prakashan" پنجاب سے شائع ہوئی ہے۔ ۱۹۶ صفحات پر مشتمل یہ کتاب دیدہ زیب گیٹ اپ کے ساتھ آراستہ کی گئی ہے۔ اس خوبصورت سوغات کے لئے افسانہ نگار خالد حسین مبارک بادی کے مستحق ہیں۔

☆ ☆

Kashmir Treasures Collection, Srinagar

CC-0. In Public Domain. Digitized by eGangotri.

(۳)

زاہد ظفر
9906700711

وحشی سعید کی کتاب "شیشے کا سمندر"

وحشی سعید کی یہ کتاب ''شیشے کا سمندر'' تین حصوں پر مشتمل ہے۔ پہلا حصہ جو صفحہ نمبر ۹ سے ۴۷ تک کا ہے، اس حصے میں مختلف مصنفین کے پانچ مضامین شامل کئے گئے ہیں جن میں وحشی سعید صاحب کے تخلیقی سفر کو بڑے خوبصورت انداز میں بیان کیا گیا ہے۔ ان پانچ مضامین کی فہرست یوں ہے :

۱) وحشی سعید کی تخلیقات کا تجزیاتی مطالعہ ۔ ۔ دیپک بدکی
۲) وحشی سعید کے افسانوں میں زندگی کی تلاش ۔ ۔ سلیم انصاری
۳) وحشی سعید ؛ ایک مطالعہ ۔ ۔ زکی طارق
۴) وحشی سعید کے افسانے : مقامیت میں آفاقیت کی تلاش ۔ ۔ ڈاکٹر نعمان
۵) وحشی سعید کے افسانوں میں عصری معنویت ۔ ۔ ڈاکٹر مظفر احمد زرگر

اس کے علاوہ کتاب کے آخر پر سعید صاحب کی خوبصورت تصویر کے ساتھ ڈاکٹر شمع افروز زیدی کا مضمون بھی شامل ہے۔

اس کتاب کا دوسرا حصہ جو صفحہ نمبر ۴۸ سے شروع ہو کر ۸۱ پر ختم ہوتا ہے، اس حصے میں سات افسانے شامل کئے گئے ہیں، جن کی فہرست یوں ہے :

۱) وہ گھر کیسا ہوگا
۲) خضر کیا سوچتا ہے وُلر کے کنارے
۳) بڑی حویلی کا چھوٹا دروازہ
۴) ہمارے شہر کا اندھا کنواں
۵) انوکھے شہر کا سفید گھوڑا
۶) کیا زندہ رہوگے
۷) شیشے کا سمندر

اور تیسرے یعنی آخری حصے میں وحشی سعید صاحب نے ایک ناولٹ کو شامل کیا ہے جو ۶۲ صفحات پر مشتمل ہے۔ اس ناولٹ کی شمولیت نے اس کتاب کو دوسرے افسانوی مجموعوں سے قدرے مختلف کر دیا ہے۔

کتاب میں شامل افسانوں کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے بخوبی ہو جاتا ہے کہ یہ افسانے ہندوستان اور پاکستان کے معیاری اور شہرت یافتہ اُردو رسالوں میں چھپ چکے ہیں۔ افسانہ ''شیشے کا سمندر'' پاکستان کے ایک رسالے ''تخلیق'' لاہور سے چھپ چکا ہے۔ افسانہ ''وہ گھر کیسا ہوگا'' پچھلے سال دسمبر میں دہلی کے رسالے ''آج کل'' میں چھپ چکا ہے۔ افسانہ ''کیا زندہ رہوگے'' راولپنڈی سے نکلنے والے ایک رسالے ''چہارسو'' میں چھپ چکا ہے۔ افسانہ ''انوکھے شہر کا سفید گھوڑا'' رسالہ ''شاعر'' ممبئی کے ستمبر کے شمارے میں شامل ہے اور اس کے علاوہ افسانہ ''ہمارے شہر کا اندھا کنواں'' تریاق کے نومبر کے شمارے میں شامل اشاعت ہے۔

احساس انسان کا وہ بہترین سرمایہ ہوتا ہے جو کبھی اسے باوقار تو کبھی اس کی زندگی کو اجیرن کر دیتا ہے۔ قلم کار جو اس دنیا کا سب سے بڑا حساس فرد مانا جاتا ہے جب وہ کسی جان سوز حادثے سے گزرتا ہے تو اُس کا اندرون ایک عجیب سی کشمکش کا شکار ہو جاتا ہے، تو وہ اُس وقت

Kashmir Treasures Collection, Srinagar

CC-0. In Public Domain. Digitized by eGangotri.

تک قرب کے دریا میں غوطہ زن رہتا ہے جب تک اپنے درد کو قرطاس کے حوالے نہیں کر دیتا۔ ''بڑی حویلی کا چھوٹا دروازہ'' ہو یا پھر ''شیشے کا سمندر'' دونوں افسانے مابعد جدید عہد کے اُس بیان سے براہ راست جڑے ہوئے ہیں جس کے بغیر مابعد جدید عہد کا اسلوب ناقص سمجھا جاتا ہے۔ صارفیت زدہ زندگی ہر طرح مصروفیات اور بدلتی ہوئے اقدار رشتوں کے متغیر مفاہم کے اس عہد میں ایک سسکتا ہوا قلم کار اپنے احساسات کو لفظوں میں ڈھالنے کے لئے کتنے جتن کرتا ہے اس کے باوجود بھی اس کی یہی کوشش ہوتی ہے کیا وہ سب کچھ کہہ کر بھی خاموش رہ جائے۔

اگرچہ ان افسانوں میں مصنف نے زندگی کی اُن تلخ حقائق کو علامتوں کے پردوں میں ڈال کر پیش کرنے کی کوشش کی ہے لیکن حقیقت تو یہی ہے کہ اس اُلجھتے سلجھتے بیانیہ میں جو پوری طرح ڈوب جاتا ہے وہ قلم کار کے قرب سے صحیح معنوں میں واقف ہو جاتا ہے۔ اس لئے وحشی سعید کے ان علامتی انداز کے افسانوں کو سمجھنے کے لئے زندگی کی تلخ حقیقتوں کو سمجھنا اور ان میں ڈوب جانا ہوگا۔

افسانہ ''وہ گھر کیسا ہوگا'' میں مصنف نے قدرت کے فیصلے کے سامنے انسان کی بے بسی کو پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ چاہے انسان کتنا بھی دولت مند، شہرت یافتہ اور عزت والا ہو، اس کے باوجود دنیا سے خالی ہاتھ جاتا ہے۔ اس افسانے کا مرکزی کردار ایک بیانوے سال کا بوڑھا ہے جو اپنے بیٹے کی میت پر آنسو بہاتے بہاتے میت کو تابوت میں دیکھ کر کہتا ہے کہ میرا بیٹا جہاں جا رہا ہے وہ گھر کیسا ہوگا ۔ ۔ ؟

افسانہ ''ہمارے شہر کا اندھا کنواں'' بظاہر علامتی نوعیت کا ہے۔ اس میں مصنف نے یہ پیش کرنے کی کوشش کی ہے کہ یہ شہر جو کبھی امن وسکون کا مرکز تھا، اب مادیت پرستی کی دوڑ میں سب انسانی اور اخلاقی اقدار بھول بیٹھا ہے۔ اب ہر طرف لالچ، حسد، فتنے فساد نظر آ رہے ہیں۔

افسانہ ''خضر کیا سوچتا ہے ولر کے کنارے'' اور ''شیشے کا گھر'' وحشی سعید کے تخلیقی فن کی مثال ہیں۔ ان دونوں افسانوں میں ادبیت اور فن برقرار ہے۔ علامت سے بنے ہوئے دونوں افسانے انسانی فطرت کی زبردست عکاسی کرتے ہیں۔ افسانہ ''خضر کیا سوچتا ہے ولر کے کنارے'' اُن اُمیدوں کی خوبصورت عکاسی کرتا ہے جو انسان کے جینے کا سہارا ہیں لیکن کبھی پوری نہیں ہوتیں۔ افسانہ ''شیشے کا سمندر'' اس حقیقت کو ظاہر کرتا ہے کہ انسان دنیا داری میں اس قدر پھنس جاتا ہے کہ وہ چاہ کر بھی اپنی خواہشات اور مقاصد تک نہیں پہنچ سکتا۔

افسانہ ''کیا زندہ رہو گے'' جذبات اور احساسات کا ایک ایسا بیانیہ ہے جو آنکھوں سے ٹپکتے آنسو کی عکاسی کرتا نظر آ رہا ہے۔ اس افسانے میں تین ایسے واقعات بیان کئے گئے ہیں جو قاری کو آہوں اور سسکیوں کے علاوہ ایک گہری سوچ میں ڈبو دیتے ہیں، جو اسے اپنے ماضی اور حال کا آئینہ دکھاتے ہیں۔ کشمیر میں 2014ء کے سیلاب کی وہ یادیں ہماری تاریخ کا ایک بھیانک حصہ ہیں جسے یاد کر کے ہر ایک کشمیری سہم جاتا ہے اور اس کے علاوہ اس افسانے میں کرونا وائرس کا قہر پیش کیا گیا ہے جس نے ساری دنیا کو اپنی لپیٹ میں لے کر انسان کو روبورٹ میں تبدیل کر دیا ہے اور آخر میں اس افسانے میں کشمیر کی اس سچی حقیقت پر پردہ سرکانے کی کوشش کی گئی ہے جس کا شکار ہر ایک کشمیری ہے۔ اس افسانے میں اُس واقعے کو بیان کیا گیا ہے جب ایک پانچ سالہ کشمیری بچہ اپنے دادا کی گولیوں سے چھلنی لاش پر بیٹھ کر یہ جملے دہراتا ہے :

''دادا! اُٹھو گھر جانا ہے''

اُسی لمحہ وہاں سے ایک پولیس کی جیپ اعلان کرتے ہوئے گزرتی ہے:

''گھر میں رہو گے تو زندہ رہو گے''

Kashmir Treasures Collection, Srinagar

CC-0. In Public Domain. Digitized by eGangotri.

اس کتاب میں شامل ناولٹ میرے وقت کی کہانی ۶۲ صفحات پر مشتمل ہے جو حقیقت نگاری پر مبنی کہانی ہے۔ اس ناولٹ کی شروعات جاگیردارانہ نظام سے شروع ہوتی ہے۔ اس ناولٹ میں جاگیردارانہ نظام کی اتنے خوبصورت انداز میں تصویر کشی کی گئی ہے کہ قاری کو احساس ہوتا ہے کہ یہ اسی دور کا لکھا ہوا ناولٹ ہے۔ بقول عالم بنارسی:

''وحشی سعید جس عہد کی بات کرتے ہیں اور جس شہر جس گلی جس مقام کے حالات کو صفحہ قرطاس پر اُتارتے ہیں وہ مکالمے اور منظر کشی کے اعتبار سے اتنے مستحکم ہوتے ہیں کہ قاری اُسی شہر اور اُسی عہد میں پہنچ جاتا ہے''

مختصر میں اس ناول کے دو چار نکتے بیان کروں گا جس پر مصنف نے زور دیا ہے۔ ایک تو یہ کہ جاگیردارانہ نظام میں کس طرح کسانوں پر ظلم کیا جاتا تھا اور کس طرح اُن کے گھر اور خاندان تباہ و برباد کئے جاتے تھے۔ دوسرا اس ناول میں یہ دکھانے کی کوشش کی گئی ہے کہ کسی کا حق چاہے آپ کتنا بھی کھانے کی کوشش کریں لیکن آخر کار وہ حق دار کو ہی ملتا ہے۔ اور تیسری بات وعدہ خلافی کی جو سزا ہے وہ دنیا میں ہی مل جاتی ہے اور چوتھے یہ دکھانے کی کوشش کی گئی ہے کہ ہمیشہ آپ ایمانداری سے ہی ہر کام کریں تا کہ آپ کی دنیا اور آخرت دونوں بہتر ہوں۔ ☆

انتساب پبلی کیشنز کی پیشکش

''وحشی سعید ۔ ۔ ایک منفرد فکشن نگار''

مصنف : ڈاکٹر سیفی سرونجی

افسانچہ ۔ ۔

بے چہرہ

میں سوچ رہا تھا۔ شاید کسی کہانی کے خدوخال سنوار رہا تھا۔ لیکن جب کبھی کبھی اپنی ہی سوچ بے سوچ بن جاتی ہے اور کہانی خود ہی ذہن کے کینواس سے اُتر جاتی ہے، لیکن جو میرے سامنے تھا وہ شاید سوچ چکا تھا اور شاید اپنی کہانی کے خدوخال سنوار چکا تھا۔ اُس کی کہانی جاننے کے لئے جب میں نے اُس کی جانب دیکھا وہ دوسری جانب دیکھ رہا تھا ۔ ۔ ۔ وہ شاید بے چہرہ تھا ۔ ۔ کرونا کی طرح ۔ ۔ !!

(نور شاہ)

''نگینہ انٹرنیشنل''

کا واحد مقصد اُردو زبان و ادب کی ترقی و ترویج ہے۔ اس میں شامل تخلیقات کا بغور مطالعہ کر کے ہمیں اپنی گراں قدر رائے سے ضرور نوازتے رہیں۔

اُردو کتابی سلسلہ

''تحریک ادب'' بنارس

مدیر : جاوید انور

رابطہ کریں : ہوٹل شہنشاہ پیلس، بلیوارڈ، سرینگر

Kashmir Treasures Collection, Srinagar

CC-0. In Public Domain. Digitized by eGangotri.

(۴)

ہارون ریشی
7889730433

''تنکے''

ایک جائزہ

ڈاکٹر نذیر مشتاق وادیٔ کشمیر کا ایک جانا پہچانا نام ہے۔ گو کہ سرینگر سے تہران تک ان گنت لوگ انہیں جانتے اور پہچانتے ہیں لیکن وادیٔ کشمیر میں لوگوں کی ایک بڑی تعداد انہیں ایسے معروف معالج کی حیثیت سے جانتی ہے جو نہ صرف مریضوں کا علاج ومعالجہ کرتے ہیں بلکہ اپنے مہذبانہ لب ولہجے اور سادہ کشمیری اصطلاحات کا استعمال کرتے ہوئے اُنہیں لاحق بیماریوں سے لڑنے کا حوصلہ بھی فراہم کرتے ہیں۔ چند برس پہلے جب سوشل میڈیا اور نجی ٹیلی وژن کا ابھی بول بالا نہیں تھا، دوردرشن سرینگر پر اکثر وبیشتر نظر آنے والے نمایاں چہروں میں ڈاکٹر نذیر مشتاق بھی شامل تھے جو ہمیشہ اپنے پروگراموں اور انٹرویوز میں عام یا مہلک بیماریوں سے متعلق سادہ الفاظ میں لوگوں کو جانکاری فراہم کرتے نظر آتے تھے۔

لوگوں کا ایک اور طبقہ ڈاکٹر نذیر کو ایک ایسے ادیب کی حیثیت سے جانتا ہے جو اپنی پیشہ ورانہ مصروفیات کے باوجود سالہا سال سے اپنا قیمتی وقت ادب کے لئے بھی صرف کرتے رہے ہیں۔ وہ ایک ڈرامہ نویس بھی رہے ہیں، ایک افسانہ نگار اور ایک سکرپٹ رائٹر بھی رہے ہیں۔ اس کے علاوہ طب کے موضوعات پر اُن کے سینکڑوں اخباری شذرات تسلسل کے ساتھ شائع ہوتے رہتے ہیں۔ وہ ''صحت کامل'' کے عنوان سے شائع شدہ ایک ضخیم کتاب کے مصنف بھی ہیں۔

اُن کی زندگی سے منسوب متذکرہ دو پہلوؤں کے علاوہ اُن کی شخصیت کا ایک اور روپ بھی ہے۔ یہ روپ اُن کی ہشاشیت، بشاشیت اور زندہ دلی کا ہے، جو اُن لوگوں کو دیکھنے کو ملتا ہے جو ڈاکٹر صاحب کی نجی محفلوں میں اُٹھتے بیٹھتے ہیں۔ راقم السطور کو ان کی شخصیت کے ان تینوں پہلوؤں سے شناسائی حاصل رہی ہے۔ میں ایک مریض کی حیثیت سے اُن کے مطب پر بھی گیا ہوں، ایک قاری کی حیثیت سے اُن کے ادب پارے بھی پڑھ چکا ہوں اور نجی بیٹھکوں میں مختلف موضوعات پر اُن کے ساتھ گھنٹوں گپ شپ کرنے کی لطف اندوزی سے بھی محظوظ ہوتا رہا ہوں۔ تاہم فی الوقت میری اس تحریر کا مقصد اُن کی تازہ تصنیف ''تنکے'' کے بارے میں اپنے تاثرات بیان کرنا ہے۔ اگرچہ میں علم وادب سے جڑے کسی موضوع کا کوئی ماہر نہیں ہوں لیکن ایک قاری کی حیثیت سے اپنی آرا ضرور رکھتا ہوں۔

''تنکے'' ڈاکٹر نذیر مشتاق کے افسانچوں پر مشتمل دو سو صفحات پر مشتمل اُس کتاب کا عنوان ہے جس کے مشمولات میری دانست میں ہمارے معاشرے کے بعض پہلوؤں کی عکاسی کرتے ہیں۔ اس سے بہتر نام اس تصنیف کا نہیں ہوسکتا تھا کیونکہ اس میں معاشرتی زندگی سے جڑے وسیع معاملات اور واقعات کو مختصر افسانچوں میں قلم بند کیا گیا ہے۔ چند سطروں پر مشتمل ہر افسانچہ پڑھنے کے بعد اس کے کردار کچھ جانے پہچانے لگنے لگتے ہیں، شاید اس کی وجہ ہے کہ مصنف نے اپنے معمولات زندگی میں نظر آنے والے اصلی کرداروں سے جڑی کہانیوں کو افسانوی کرداروں میں پیش کیا ہے۔ یعنی یہ ساری کہانیاں اُن حقیقی واقعات کا عکس معلوم ہوتی ہیں جو ہمیں روزمرہ کی زندگی میں اپنے

Kashmir Treasures Collection, Srinagar

CC-0. In Public Domain. Digitized by eGangotri.

گردونواح میں دیکھنے کو ملتی ہیں۔اس سے صاف پتہ چلتا ہے کہ نذیر مشتاق محض ایک طبعی معالج نہیں ہیں بلکہ ایک ایسے حساس انسان بھی ہیں جو اپنے سماج اور معاشرے پر گہری نظر رکھے ہوئے ہیں۔وہ اپنی سوچ اور فکر کو الفاظ کا جامہ پہنا کر نہ صرف معاشرے میں موجود منفی روایات اور اس میں پنپ رہے ناپسندیدہ رجحانات کی نشاندہی کرتے نظر آتے ہیں بلکہ اس پر ماتم کناں بھی ہیں۔اس ضمن میں اُن کی زیر بحث تصنیف میں شامل پرائی، دیانت، بھکاری، ضرورت جیسے عنوانات کے تحت ضبط تحریر لائے گئے افسانچوں کی مثال دی جاسکتی ہے۔

''دیانت'' عنوان کے تحت شامل کتاب افسانچے میں یہ بات بھرپور انداز میں کہی گئی ہے کہ ایک باضمیر انسان انتہائی ناسازگار حالات میں اپنے جذبات سے مغلوب ہوکر بے بسی کے ساتھ اپنی مٹھیاں بھینچ تو سکتا ہے لیکن خیانت کا تصور بھی نہیں کرسکتا ہے۔اس کہانی کا مرکزی کردار محکمہ فوڈ اینڈ سپلائز میں کام کرنے والا ایک کلاس فورتھ ملازم ہے جس کے پاس چاول سے بھرے گودام کی چابی بطور امانت ہوتی ہے لیکن جب اس کی بیوی گھر میں چاول کا ایک دانہ بھی موجود نہ ہونے اور بچوں کے بھوکے ہونے کی خبر سناتی ہے تو وہ بے بسی کی حالت میں اپنی جیب میں ہاتھ ڈال کر گودام کی چابی کو زور سے اپنی مٹھی میں بھینچ لیتا ہے اور پھر اپنی آنکھیں بند کرتے ہوئے اپنی بیوی سے مخاطب ہوکر کہتا ہے :

آج رات کسی طرح گزار لو، کل مجھے تنخواہ ملے گی، میں چاول خرید کے لے آؤں گا''

یہ ڈاکٹر نذیر کا زور قلم ہی ہے کہ محض چند سطروں میں دیانت کی انتہا کی تشریح کرپاتے ہیں۔جہاں تک ''تنکے'' میں شامل افسانچوں کے فنی پہلوؤں کا تعلق ہے تو اس ضمن میں ممتاز افسانہ نگار نور شاہ کے وہ الفاظ بطور سند تصور کئے جانے چاہئیں جو اُنہوں نے اس کتاب کے پیش لفظ میں لکھے ہیں۔نور شاہ رقم طراز ہیں :

''نذیر مشتاق اپنے تجربات اور مشاہدات کی توسط سے انسانی نفسیات کی عکاسی کرنے میں کامیاب نظر آتے ہیں۔کثرت سے افسانچے لکھنے کے باوجود وہ اپنے معیار اور اپنے انداز کو برقرار رکھنے کی مہارت رکھتے ہیں''

دلچسپ بات یہ ہے کہ ڈاکٹر صاحب نے اپنے افسانچے سوشل میڈیا کی وساطت سے لوگوں تک پہنچانے کی ایک مہم شروع کر رکھی ہے جو بالکل نئی ہے، کیونکہ سوشل میڈیا ترسیل خیالات کا ایک جدید ذریعہ ہے۔ شاید وہ یہ بات سمجھ چکے ہیں کہ عوام کی غالب اکثریت کتب بینی سے کوسوں دور ہے اس لئے اُن تک سماجی پیغامات پہنچانے کا سوشل میڈیا سے زیادہ بہتر کوئی ذریعہ نہیں ہوسکتا ہے۔''تنکے'' کو اپنے فیس بک دوستوں کی نذر کرکے ڈاکٹر صاحب نے دراصل یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ وہ اپنی کتاب کو اصحاب علم کے گھروں میں موجود کتب خانوں میں دیکھنے سے زیادہ اس بات کے متمنی ہیں کہ لوگ اُن کے الفاظ کو پڑھیں اور پل بھر کے لئے ہی صحیح لیکن اُن پر غور کریں۔شاید بحیثیت ایک معالج وہ جانتے ہیں کہ سرسری انداز میں اور غیر ارادی طور پڑھی جانے والی تحریریں بھی انسانوں کے تحت الشعور میں منعکس ہوکر رہ جاتی ہیں اور اُنہیں متاثر کرتی ہیں۔

لگ بھگ ایک دہائی قبل جب عالمی سطح پر پڑھے جانے والے انگریزی جریدے ''نیوز ویک'' نے اپنے پرنٹ ایڈیشن کو بند کرکے جریدے کی تحریروں کو صرف آن لائن دستیاب رکھنے کا اعلان کیا تھا تو یہ گویا صحافیوں کے لئے ایک پیغام تھا کہ زمانے کی گردش نے ایک اور موڑ

Kashmir Treasures Collection, Srinagar

CC-0. In Public Domain. Digitized by eGangotri.

لیا ہے اور اب قارئین کے موبائل فونز تک کہانیاں پہنچانا ناگزیر بن گیا ہے۔

اس واقعہ کے پیش نظر کہا جاسکتا ہے کہ ڈاکٹر نذیر مشتاق نے ''تنکے'' کو کتابی صورت میں شائع کرنے کے ساتھ ساتھ اس میں شامل افسانچوں کو آن لائن سوشل میڈیا کی وساطت سے قارئین تک پہنچانے کا عمل شروع کر کے بتادیا ہے کہ وہ صرف اپنے ماضی سے ہی واقف نہیں ہیں بلکہ حال اور مستقبل کے تقاضوں کو سمجھنے کی بھرپور اہلیت بھی رکھتے ہیں۔ حالانکہ بعض دفعہ سوشل میڈیا پر اُن کے کئی افسانچوں پر اُنہیں عام تنقید کے وار بھی سہنے پڑتے ہیں۔ اس کی مثال حال ہی میں اُس وقت دیکھنے کو ملی جب ایک معروف قلم کار نے اُن کے ایک افسانچے کے موضوع اور کہانی پر اپنی مخالفانہ رائے کا اظہار کیا اور اس اختلاف رائے کی وجہ سے سوشل میڈیا پر ہی ایک ہلکی پھلکی علمی بحث بھی شروع ہوگئی۔ تاہم اس حوالے سے یہ خوش آئند بات بھی دیکھنے کو ملی کہ مذکورہ افسانچے کی حمایت اور اس کی مخالفت میں اپنے آرا کا اظہار کرنے والے شرکاء نے اخلاقیات کا دامن ہاتھ سے چھوٹنے نہیں دیا۔ البتہ ایک خاتون، جو غالباً پڑھی لکھی ہیں، نے چند بھدے الفاظ کا استعمال کر کے اس علمی بحث وتمحیص کو کرکرا ضرور کیا۔ لیکن بہرحال کسی بھی انسان کا لب ولہجہ اُس کی اپنی شخصیت کا آئینہ ہوتا ہے، جسے بدلا نہیں جاسکتا ہے۔

بحیثیت قاری راقم السطور کو ڈاکٹر نذیر مشتاق کے افسانچوں کا اختصار متاثر کن لگتا ہے۔ کم الفاظ میں بڑی باتیں اور جامع فلسفہ بیان کرنا ہی ایک ایسا فن ہے جو ایک منجھے ہوئے قلم کار ہونے کی گواہی دیتا ہے۔ وادیٔ کشمیر میں عصر حاضر میں اس فن پر ید طولیٰ رکھنے والے دیگر اصحاب میں نور شاہ، وحشی سعید، ڈاکٹر ریاض توحیدی، حسن ساہو، پرویز مانوس، مشتاق مہدی، شیخ بشیر احمد، عبدالرشید راہگیر، غلام نبی شاہد، طارق شبنم، زبیر قریشی اور ناصر ضمیر شامل ہیں، تاہم غالباً ڈاکٹر نذیر مشتاق کو یہ امتیاز حاصل ہے کہ وادی سے تعلق رکھنے والے پہلے افسانہ نگار ہیں جن کے افسانچوں پر مشتمل کتاب منظر عام پر آچکی ہے۔ کتاب صاحب کتاب کی طرح خوبصورت بھی ہے اور دیدہ زیب بھی۔ یہ توقع کرنا بے جا نہیں ہوگا کہ نہ صرف ادبی بلکہ عوامی حلقوں میں اس تصنیف کو پذیرائی حاصل ہوگی، کیونکہ یہ ایک ایسی کتاب ہے جو نہ صرف معاشرے کی عکاسی کرتی نظر آرہی ہے بلکہ اس میں پنپ رہے بعض منفی رجحانات اور روایات کی نشاندہی بھی دیکھنے کو ملتی ہے۔ اس کتاب میں بعض افسانچے پڑھ کر رہبر جونپوری کا یہ شعر بے ساختہ ذہن میں آجاتا ہے کہ ؎

قلم خاموش ہے الفاظ کی تاثیر بولے ہے
ہماری صفحۂ قرطاس پر تحریر بولے ہے

وحشی سعید پر تین تحقیقی مقالات

مقالہ نگار : روضیہ تبسم

زیر اہتمام : شعبہ اُردو، جموں یونیورسٹی

مقالہ نگار : اُویس احمد

زیر اہتمام : یونیورسٹی آف حیدرآباد

مقالہ نگار : کائنات

زیر اہتمام : برکت اللہ یونیورسٹی، بھوپال

(ان تینوں مقالات کو کتابی شکل میں شائع کیا گیا ہے)

Kashmir Treasures Collection, Srinagar

CC-0. In Public Domain. Digitized by eGangotri.

(۵)

معراج احمد معراج
8918960724

کرب زار

شاعر : شارق عدیل

صفحات: ۱۶۸ ؛ قیمت : ۱۵۰/روپے

شارق عدیل اُفق ادب پر ایک روشن ستارہ ہیں۔ یہ بیک وقت ایک اعلیٰ پایہ کے شاعر ہیں اور ایک بلند مرتبت نثر نگار ہیں۔ شعر و ادب پر ان کی بڑی باریک نظر ہوتی ہے۔ ان کی تخلیقات ایسی نہیں جن پر سرسری نظر ڈال کر چھوڑ دیا جائے۔ ان کی ہر تخلیق مطالعہ طلب اور معانی ومفاہیم کا ایک گنجینہ ہوتی ہے۔ زیر نظر شعری مجموعہ ''کرب زار'' ان کی چوتھی تصنیف ہے۔ شعری مجموعے کا نام ''کرب زار'' کیوں ہے؟ اس کی وضاحت انہوں نے ابتداء ہی میں ایک شعر سے کی ہے ۔

ہر لمحہ ٔ حیات میں مضمر ہے انتشار
یہ زندگی بھی کیا عجیب کرب زار ہے

شاعر محترم نے زندگی کو ایک کرب زار سے تعبیر کیا ہے اور اس کے معانی ومفاہیم کی ترسیل و وسعت کے لئے کئی اور بھی اشعار مجموعے میں شامل کئے ہیں۔ شارق عدیل ایک ایسے شاعر ہیں جنہیں کسی ایک صنف کی ڈور سے باندھا نہیں جاسکتا ہے۔ وہ غزل کے ہی نہیں بلکہ نظموں کے بھی ایک مایہ ناز شاعر ہیں۔ وہ ادب میں اختراع وانقلاب کے قائل ہیں۔ اس لئے انہوں نے جہاں کلاسیکی ادب کو اپنی فکر ونظر سے ایک نئی جہت عطا کی ہے وہیں نئی اصناف سخن کو بھی ایک نئی دِشا دی ہے۔ اس مجموعے کے آغاز میں ''حرف چند'' کے عنوان سے انہوں نے خود یہ اعتراف کیا ہے :

''کرب زار ۔ خاکسار کا چوتھا مجموعہ ہے جو مختلف قدیم وجدید اصناف پر مشتمل ہے یعنی رباعی، قطعہ، دوبیتی، تروینی، ثلاثی اور ماہیا۔ مختصر شعری اصناف میں رُباعی بہت ہی اہم اور باوقار شعری صنف ہے''

(کرب زار ؛ ص : ۱۸)

''کرب زار'' کی تقریظات کے طور پر تین مضامین اس کے صفحات پر بکھرے ہیں جن میں شارق عدیل کی شاعرانہ عظمت وصلاحیت کا بھرپور جائزہ لیا گیا ہے۔ پہلا مضمون ''پیچیدگی زیست کا مغنی ۔ شارق عدیل'' کے عنوان سے ڈاکٹر آفاق عالم صدیقی کا ہے جو موصوف کے فکر وفن کا حتی المقدور احاطہ کرتا ہے۔ دوسرا مضمون ڈاکٹر مقبول احمد مقبول کا ہے جس میں انہوں نے شارق عدیل کی رُباعی گوئی پر سیر حاصل بحث کی ہے۔ آخری مضمون شمس افتخاری کا ہے جس میں انہوں نے موصوف کی ماہیا نگاری کا جائزہ لیا ہے اور اس صنف کے افہام وتفہیم پر روشنی ڈالی ہے۔ اس مجموعے کی قرأت کے بعد رُباعی، دوبیتی اور قطعہ کے فرق کو بآسانی سمجھ پائیں گے۔ کیونکہ اکثر شعراء ان تینوں اصناف کے تعلق سے قاری کے دل میں بھرم پیدا کردیتے ہیں۔ شارق عدیل کی ان تینوں اصناف پر گرفت کتنی مضبوط ہے اس کی مثال پیش ہے ۔

سانسوں میں محبت کی حلاوت گھولے
جذبات میں ایماں کی حرارت گھولے

Kashmir Treasures Collection, Srinagar

CC-0. In Public Domain. Digitized by eGangotri.

۱۳؍دسمبر ۲۰۲۰ء

''نگینہ انٹرنیشنل'' (سال نامہ جون تا دسمبر ۲۰۲۰ء) کی رونمائی کے تعلق سے ہوٹل شہنشاہ پیلس کے دربارادب میں ایک پُر وقار مجلس کا اہتمام کیا گیا۔ اس بات سے انکار کی اب گنجائش نہیں ہے کہ شہنشاہ ہوٹل کا دربارِادب ادیبوں، قلم کاروں اور دانش وروں کے لئے ایک مشترکہ پلیٹ فارم کی شکل اختیار کر چکا ہے۔ حسب معمول آج کی اس محفل میں قلم کاروں کی ایک کہکشاں نظر آرہی تھی۔ اس ادبی مجلس کی نظامت کے فرائض محمد امین بٹ صاحب نے اپنے مخصوص انداز میں نبھائے۔ مجلس کا آغاز تلاوت کلام پاک اور نعت شریف سے ہوا۔ یہ فریضہ حسب معمول طارق عبداللہ خاور صاحب نے انجام دے کر حاضرین سے داد وتحسین حاصل کی۔ اس مجلس کی صدارت کرنے کی استدعا (ر) جسٹس بشیر احمد کرمانی صاحب سے کی گئی۔ اُن کے تشریف فرما ہونے کے فوراً بعد وحشی سعید صاحب، رفیق راز صاحب اور خالد حسین صاحب بھی ایوان صدارت میں تشریف فرما ہوئے۔ وحشی صاحب نے بطور مدیر اعلیٰ ''نگینہ انٹرنیشنل'' خطبہ استقبالیہ پیش کیا۔ استقبالیہ کے فوراً بعد گزشتہ کئی برسوں میں ماہ دسمبر کے دوران انتقال کرنے والے جموں وکشمیر کے قلم کاروں اور فنکاروں کے تئیں نذرانہ عقیدت پیش کیا گیا اور اُن کی ادبی خدمات کو اُجاگر کیا گیا۔ اس تعلق سے میزان پبلی شرز کے مالک اور اُردو زبان وادب کے ایک پُر خلوص خدمت گار شبیر احمد ماٹجی نے ایک خصوصی بینر بنوالیا تھا اور اُس پر مندرجہ ذیل قلم کاروں کے نام بخوبی دیکھے جاسکتے تھے جو گزشتہ کئی برسوں کے دوران ماہ دسمبر میں ہم سے جدا ہوئے تھے۔ اُن قلم کاروں کے اسمائے گرامی یوں ہیں :

پیر شمس الدین حسرت	رامانند ساگر	علی محمد لون
بشیر اختر	محی الدین شاہ	حکیم منظور
ارجن دیو مجبور	محمد احمد اندرابی	فرید پربتی
شفیع شیدا	محمد امین اندرابی	سجاد حسین
غلام نبی فراق	عمر مجید	غلام نبی ناظر
عباس تابش	عبدالغنی نمتہ ہالی	گلزار حضرت بلی
آنند لہر	حامدی کاشمیری	مقبول ویری
حنیف ترین		

''نگینہ انٹرنیشنل'' کے سالنامہ پر محمد عبداللہ طارق صاحب کا لکھا ہوا تبصرہ ناصر ضمیر نے اپنے مخصوص انداز میں پڑھ کر سنایا اور پھر اراکین ادارتی مجلس نور شاہ اور ڈاکٹر اشرف آثاری کو ڈائس پر آنے کی دعوت دی گئی اور پھر تالیوں کی گونج میں ''نگینہ انٹرنیشنل'' کی رونمائی کی تقریب انجام پائی۔ اس شمارے میں گوشہ حکیم منظور (مرحوم) بھی شامل ہے۔ اس دوران ''نگینہ'' کی کاپیاں اختر معراج اور نذیر احمد کی مدد سے حاضرین میں تقسیم کی گئیں۔ اس کے بعد وحشی سعید کے افسانوی مجموعے ''شیشے کا سمندر'' پر نوجوان قلم کار ظفر زاہد نے تبصرہ پیش کیا اور ''شیشے کا سمندر'' کی رسم رونمائی انجام پائی۔ وحشی سعید کے ناولٹوں پر مشتمل کتاب ''پتھر پتھر آئینہ'' کے کشمیری ترجمے کا کام رشید کانسپوری صاحب نے بڑی عرق ریزی سے انجام دیا ہے۔ اب یہ کتاب کشمیری روپ میں ''کنز کنز اُنہٕ'' کے عنوان سے منظر عام پر آچکی ہے۔ رشید کانسپوری کے ڈائس پر آنے کے بعد اس تخلیق کی رونمائی انجام دی گئی لیکن رونمائی سے پہلے عبدالخالق شمس نے اپنا تحریر کردہ تبصرہ پڑھ کر سنایا۔

اس کے بعد ''لفظ لفظ داستان'' کی باری آئی۔ یہ نور شاہ کا بارہواں

Kashmir Treasures Collection, Srinagar

CC-0. In Public Domain. Digitized by eGangotri.

افسانوی مجموعہ ہے اور میزان پبلی شرز نے شائع کیا ہے۔ نورشاہ صاحب کو ڈائس پر آنے کی دعوت دی گئی اور ڈاکٹر نیلوفر ناز نحوی نے اپنا تبصرہ حاضرین کی نذر کیا۔ اس کے بعد حاضرین ایستادہ ہوئے اور تالیوں کی گونج میں اس کتاب کی رونمائی عمل میں لائی گئی۔

''جنت گرہن'' خالد حسین کی تازہ ترین افسانوی تخلیق ہے۔ خالد حسین پہلے ہی ڈائس پر تشریف فرما تھے۔ ''جنت گرہن'' پر نوجوان قلم کار محمد اقبال لون صاحب نے اپنا تحریر کردہ تبصرہ پڑھا اور اس طرح ''جنت گرہن'' کو اجراء کیا گیا۔

کشمیر کے دو جانے پہچانے قلم کار ۔ شفیع احمد اور مشتاق برق نے چند اُردو اور کشمیری کہانیوں کا ترجمہ انگریزی میں کیا ہے۔ ان کہانیوں کو اب کتابی صورت مل چکی ہے۔ "The Eternal Insight of Kashmir" کے نام سے اس تخلیق میں کشمیر کے پس منظر میں لکھے گئے افسانے شامل کئے گئے ہیں۔ اس کتاب پر نوجوان قلم کار ڈاکٹر مشتاق الحق سکندر نے اپنا لکھا ہوا تبصرہ پڑھ کر سنایا۔ اس کے ساتھ ہی شفیع صاحب اور برق صاحب کو ڈائس پر آنے کی دعوت دی گئی اور کتاب کی رونمائی ہوئی۔ اس کتاب میں جن قلم کاروں کی کہانیاں شامل کی گئی ہیں اُن کی تفصیل یوں ہے :

۱۔ سعادت حسن منٹو
۲۔ عبدالغنی شیخ
۳۔ اختر محی الدین
۴۔ امر مالموہی
۵۔ اوتار کرشن رہبر
۶۔ بشیر عارف
۷۔ دیپک کنول
۸۔ فیاض دلبر
۹۔ جی ایم آزاد
۱۰۔ غلام نبی شاہد
۱۱۔ غلام نبی شاکر
۱۲۔ گلشن مجید
۱۳۔ ہردے کول بھارتی
۱۴۔ خالد حسین
۱۵۔ مجروح رشید
۱۶۔ مقبول ساحل
۱۷۔ محمد زماں آزردہ
۱۸۔ محی الدین ریشی
۱۹۔ مشتاق برق
۲۰۔ ناصر ضمیر
۲۱۔ نذیر مشتاق
۲۲۔ نورشاہ
۲۳۔ رافیہ ولی
۲۴۔ رتن لال شانت
۲۵۔ ریاض توحیدی
۲۶۔ رحیم رہبر
۲۷۔ ستیش ول
۲۸۔ شفیع احمد
۲۹۔ شہزادہ بسمل
۳۰۔ شکیل الرحمٰن
۳۱۔ شمس الدین شمیم
۳۲۔ ترنم ریاض
۳۳۔ عمر مجید
۳۴۔ وحشی سعید

کتابوں کی تقریب رونمائی کے بعد انعامات واعزازات دینے کا سلسلہ شروع ہوا۔ مندرجہ ذیل شخصیات کو ''نگینہ انٹرنیشنل'' کے اعزاز سے نوازا گیا۔

۱۔ جناب بشیر احمد بشیر — برائے ادبی صحافت
۲۔ ڈاکٹر نکہت نذر — برائے تحقیق وتنقید (مرحوم حکیم منظور کے تعلق سے)
۳۔ جناب رشید کانسپوری — برائے ترجمہ کاری
۴۔ جناب عبدالخالق شمس — برائے ترجمہ کاری
۵۔ جناب اختر معراج — ''نگینہ'' کی ادبی سرگرمیوں میں اپنا کردار نبھانے کے لئے

بشیر احمد بشیر صاحب کی غیر موجودگی میں اُن کا اعزاز ڈاکٹر صوفیہ (دختر مرحوم صوفی غلام محمد) نے حاصل کیا۔ اس موقع پر بشیر صاحب کی دختر نیک اختر اور اُن کے فرزند شاداب بشیر بھی موجود رہے۔

Kashmir Treasures Collection, Srinagar

CC-0. In Public Domain. Digitized by eGangotri.

رفیق راز صاحب نے کشمیر کی ادبی سرگرمیوں کے تعلق سے بات کی اور فرمایا کہ نامساعد حالات میں معمولات زندگی مفلوج ہو جاتے ہیں لیکن ان حالات کے دوران بھی تخلیقی ذہن اپنا کام جاری رکھتا ہے۔ اُنہوں نے مصنفین، ترجمہ اور تبصرہ نگاروں کو مبارک باد پیش کی اور وحشی سعید کے ادبی رول کو سراہا۔ خالد حسین نے اپنی ادبی زندگی کے تعلق سے بات کی اور کہا کہ اُن کے افسانہ نگار بننے میں نور شاہ کی صحبت کا بھی اثر رہا ہے۔ اُنہوں نے وحشی سعید کے اندر پوشیدہ ادبی شخصیت کی بھی داد دی اور کہا: ''مجھے یہ بات بتاتے ہوئے خوشی محسوس ہو رہی ہے کہ وحشی سعید کی منتخب اُردو کہانیوں کا پنجابی ترجمہ عنقریب کتابی صورت میں منظر عام پر آرہا ہے''۔ اس کے بعد جسٹس کرمانی نے اپنے خطبہ صدارت میں فرمایا کہ وحشی سعید نے ادب کی جو شمع فروزاں کی ہے وہ زبان وادب کی ترقی وترویج کے لئے ایک وسیلہ بن گیا ہے۔ انہوں نے کہا کہ کتابوں پر جو تبصرے پڑھے گئے وہ قابل تعریف اور قابل ستائش ہیں۔ ناقد تخلیق کار کو مستحکم بنانے میں اہم کردار ادا کرتا ہے۔ اُنہوں نے اُردو زبان کی اہمیت اور ضرورت کے تعلق سے کہا کہ اُردو کو ہماری نہیں بلکہ ہمیں اُردو کی ضرورت ہے۔ اس لئے اس زبان کو تحفظ دینا ہمارا فرض بنتا ہے۔

آخر پر ''نگینہ'' کے مینجنگ ایڈیٹر ظہور احمد ترنبو نے اپنا مخصوص انداز اپناتے ہوئے تحریک شکرانہ پیش کرنے کے بعد کہا کہ ہوٹل شہنشاہ کے شاہی دسترخوان پر ''وحشی بریانی'' آپ سب کی منتظر ہے۔

یہ مجلس صبح گیارہ بجے شروع ہوئی اور چار بجے بعد دوپہر اختتام پذیر ہوئی۔ کشمیر میں سرد موسم کے باوجود حاضرین نے جس دلچسپی کے ساتھ اپنائیت اور اُردو دوستی کا مظاہرہ کیا وہ واقعی قابل ستائش ہے اور قابل احترام بھی۔

۲۰ر دسمبر ۲۰۲۰ء

کشمیر کے معروف قلم کار اور معتبر اُستاد جناب جوہر قدوسی کی والدہ محترمہ کا مختصر علالت کے بعد انتقال ہو گیا۔ اراکین ''نگینہ'' قدوسی صاحب کے ساتھ اظہار تعزیت کرتے ہوئے مرحومہ کی جنت نشینی کے لئے دُعا کرتے ہیں۔

۲۳ر دسمبر ۲۰۲۰ء

افسانوی دنیا کے ایک کہنہ مشق کہانی کار جناب فاروق راہب صاحب انتقال کر گئے۔ وہ کئی کتابوں کے مصنف تھے اور اُردو کے افسانوی ادب میں اُن کا اپنا ایک اعلیٰ مقام تھا۔ اُن کی کہانیاں ''نگینہ انٹرنیشنل'' میں باقاعدگی کے ساتھ شائع ہوتی تھیں۔ ادارہ ''نگینہ'' کو اُن کے انتقال پر ملال ہے۔ اس تعلق سے ایک تعزیتی نشست منعقد ہوئی جس میں مرحوم کی ''نگینہ'' کے ساتھ دیرینہ وابستگی کو یاد کیا گیا اور مرحوم کے لواحقین کے ساتھ ہمدردی کا اظہار کیا گیا۔

۲۶ر دسمبر ۲۰۲۰ء

اُردو زبان وادب کے ممتاز، منفرد اور قد آور قلم کار جناب شمس الرحمٰن فاروقی انتقال کر گئے۔ اُن کی رحلت اُردو زبان وادب کے لئے ایک ایسا نقصان ہے جس کی تلافی نہیں ہو سکتی۔ وہ دو درجن سے زائد علمی اور ادبی کتابوں کے تخلیق کار تھے اور اُن کی تخلیقات ہمیشہ سے ہی قدر کی نگاہوں سے دیکھی جاتی رہی ہیں۔ ادبی اور علمی دنیا میں اُن کا ایک معتبر مقام تھا۔ اُن کی وفات کے تعلق سے آج ''نگینہ انٹرنیشنل'' کے دفتر میں ایک تعزیتی نشست منعقد کی گئی جس میں مرحوم کی مغفرت اور جنت نشینی کے لئے دُعا کی گئی۔

Kashmir Treasures Collection, Srinagar

CC-0. In Public Domain. Digitized by eGangotri.

آج ہی صبح ساڑھے گیارہ بجے ''دبستان داغ'' کے قادرالکلام بزرگ شاعر جناب عرش صہبائی اس جہان فانی سے کوچ کر گئے۔ عرش صہبائی کی جدائی سے پیدا شدہ خلا پُر نہیں کیا جاسکتا۔ آپ ایک اچھے اور شریف النفس انسان تھے۔ ''نگینہ انٹرنیشنل'' کو باقاعدگی کے ساتھ اپنی تخلیقات سے نوازتے تھے۔ اُن کے کئی شعری مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ ''نگینہ انٹرنیشنل'' کے دفتر میں ایک تعزیتی نشست میں اُن کی ادبی خدمات کو یاد کیا گیا۔ حال ہی میں انہوں نے تین سو پچاس اشعار پر مشتمل ایک طویل غزل قلم بند کی تھی۔ یہ طویل غزل وہ ''نگینہ'' میں شائع کرنے کے خواہش مند تھے۔ کاش یہ غزل اب بھی نگینہ کو مل جاتی۔

۲۷ر دسمبر ۲۰۲۰ء

آج ہوٹل شہنشاہ کے ایوان ادب میں کشمیر بک پرموشن ٹرسٹ اور اسلامک ریلیف ٹرسٹ کے باہمی اشتراک سے گذشتہ کئی برسوں کے دوران ماہ دسمبر میں فوت شدہ اُردو اور کشمیری زبان وادب کی سرکردہ شخصیات کے تئیں خراج عقیدت ادا کرنے کے تعلق سے ایک یادگاری تقریب منعقد ہوئی۔ اس پُر وقار مجلس کی صدارت جسٹس بشیر احمد کرمانی نے کی جب کہ ڈاکٹر مشتاق احمد گنائی، ڈاکٹر سید ظہور گیلانی، عبدالرشید ہانجورہ اور ''نگینہ انٹرنیشنل'' کے مدیر وحشی سعید بھی ایوان صدارت میں تشریف فرما تھے۔ میزان پبلی شرز کے روح رواں شبیر احمد ماٹجی کے مختصر تعارف کے بعد جاوید کرمانی نے نظامت کی ذمہ داریاں سنبھال لیں۔ تقریب کا آغاز تلاوت قرآن پاک اور نعت رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے ہوا۔ یہ سعادت عابد حسین نے حاصل کی۔ خطبہ استقبالیہ اسلامک ریلیف ٹرسٹ کے صدر جناب ایڈوکیٹ عبدالرشید ہانجورہ نے پیش کیا۔ اُنہوں نے مختلف حالات وواقعات پر روشنی ڈالی اور مرحومین کو شاندار الفاظ میں خراج عقیدت پیش کیا۔ ڈاکٹر مشتاق حیدر نے مرحومین کے تعلق سے ایک شاندار اور جان دار مقالہ پیش کیا۔ یہ ایک بے حد معلوماتی مقالہ تھا اور اس کے طرز تحریر میں بھی ایک نیا پن جھلک رہا تھا۔ اس مقالہ میں مرحومین کی علمی اور ادبی خدمات پر بھرپور روشنی ڈالی گئی تھی۔ نور شاہ کی تحریر کردہ ''ایک مختصر سی تحریر'' نوجوان قلم کار سہیل سالم نے پڑھ کر سنائی۔ اُردو کونسل کے سیکریٹری جاوید ماٹجی نے مرحومین کی ادبی خدمات کے علاوہ اُردو کی موجودہ صورتحال پر بات کی۔ اس تقریب میں ایک محفل مشاعرہ کا بھی اہتمام کیا گیا تھا جس میں نوجوان شعراء اور شاعرات نے حصہ لیا اور وہ تھے :

اسرار عباسی	مرتضیٰ بسمل	حمزہ مظہر
خدیجہ قادری	اعجاز بحری	سہیل سالم

ان کے علاوہ منظور احمد کنٹھ نے دو نظمیں پیش کیں۔

اس کے بعد ڈاکٹر شبیر احمد مجروح کی کشمیری تخلیق ''تارکھ مال'' کی رونمائی انجام دی گئی۔ ڈاکٹر سعید ظہور گیلانی اور ڈاکٹر مشتاق احمد گنائی نے اپنے زرّیں خیالات سے حاضرین کو محظوظ کیا اور فوت ہوئے علمی شخصیات کو خراج عقیدت پیش کیا۔ وحشی سعید نے مرحومین کے تئیں عقیدت کے پھول نچھاور کئے اور کہا کہ اُنہیں یہ اعزاز حاصل ہے کہ مرحوم پروفیسر حامدی کاشمیری اور مرحوم پروفیسر غلام نبی فراق اُن کے اساتذہ میں رہے ہیں۔ انہوں نے مرحوم شمس الرحمٰن فاروقی اور جناب عرش صہبائی کی ادبی خدمات کا بھی ذکر کیا۔ وحشی صاحب نے کہا کہ ''نگینہ'' کے آنے والے شمارے میں گوشہ مرحوم عمر مجید بھی شامل ہوگا۔ جسٹس کرمانی صاحب نے اپنے منفرد انداز میں ان اہم شخصیات کو خراج عقیدت پیش کیا اور کہا کہ ان شخصیات کا ہم پر احسان ہے کہ

Kashmir Treasures Collection, Srinagar

CC-0. In Public Domain. Digitized by eGangotri.

انہوں نے اپنے اپنے ادبی میدان میں کارہائے نمایاں انجام دئے کہ آج ان کی عقیدت میں اس محفل کا اہتمام کررہے ہیں۔ انہوں نے کہا کہ سماج میں یکجہتی قائم کرنے کے لئے قلم کار مرکزی نکتہ فراہم کرسکتے ہیں۔ تحریک شکرانہ شبیر احمد ماٹجی نے پیش کی۔ قلم کاروں اور طالب علموں کی ایک بڑی تعداد نے شرکت کرکے اس محفل کو باوقار بنادیا۔

۴؍جنوری ۲۰۲۱ء

کشمیری زبان کے معروف قلم کار ڈاکٹر جی ایم آجر اسی سال کی عمر میں انتقال کرگئے۔ وادی کی مختلف ادبی تنظیموں نے اُن کی وفات پر گہرے رنج وغم کا اظہار کیا۔ اراکین ''نگینہ انٹرنیشنل'' اس رنج وغم کی گھڑی میں اُن کے لواحقین کے ساتھ ہیں اور دُعا کرتے ہیں کہ مرحوم کو کروٹ کروٹ جنت نصیب ہو۔

۱۸؍جنوری ۲۰۲۱ء

اقبال انسٹی چیوٹ آف فلاسفی اور کلچرل یونیورسٹی آف کشمیر کے کوآڈنیٹر ڈاکٹر مشتاق احمد گنائی کی والدہ محترمہ انتقال کرگئیں۔ ادھر کشمیر کے ایک معروف شاعر مشتاق کشمیری صاحب کی دختر نیک اختر چند روز قبل پاکستان میں داعی اجل کو لبیک کہہ گئیں۔ اُنہیں اسلام آباد میں سپرد خاک کیا گیا۔ آل انڈیا ریڈیو کشمیر (سرینگر) کے شہر بین سیکشن کے انچارج اور معروف براڈ کاسٹر مقصود احمد کے چاچا مختصر علالت کے بعد انتقال کرگئے۔ انہیں اپنے آبائی گاؤں میں سپرد خاک کیا گیا۔ اراکین ''نگینہ انٹرنیشنل'' نے غم زدہ خاندانوں کے ساتھ اپنے دُکھ کا اظہار کیا اور مرحومین کے حق میں دُعائے مغفرت کی۔

۱۹؍جنوری ۲۰۲۱ء

ادبی مرکز کمراز کے حالیہ انتخابات میں معروف فنکار اور قلم کار محمد امین بٹ صاحب کو صدر منتخب ہونے پر اراکین نگینہ مبارک باد پیش کرتے ہیں اور اُمید کرتے ہیں کہ اُن کی سربراہی میں نئی ٹیم کے اراکین مرکز کی بہتری اور بہبودی کے لئے ایک نئے جوش اور ولولے سے اپنے فرائض انجام دیتے رہیں گے۔ امین صاحب ابتداء سے ہی ''نگینہ انٹرنیشنل'' کی سرگرمیوں کا ایک اہم حصہ رہے ہیں۔ اُمید ہے کہ وہ آئندہ بھی ہمیشہ کی طرح اپنی صلاحیتوں کا بھرپور مظاہرہ کریں گے۔

۲۰؍جنوری ۲۰۲۱ء

کشمیر کے ایک معتبر صحافی اور روزنامہ ''وادی کی آواز'' کے مدیر اعلیٰ جناب غلام نبی شیدا صاحب انتقال کرگئے۔ وہ ۸۰ برس کے تھے۔ صحافتی اور ادبی حلقوں میں مرحوم کافی مقبول تھے۔ وہ شرافت کے پیکر تھے۔ اراکین ''نگینہ'' اُن کی وفات پر گہرے دُکھ کا اظہار کرتے ہیں اور اُن کی جنت نشینی کے لئے دُعا کرتے ہیں۔ ادھر پروفیسر شادر مضان صاحب کی والدہ بھی انتقال کرچکیں۔ اراکین ''نگینہ'' سوگوار کنبے کے ساتھ تعزیت کا اظہار کرتے ہیں اور مرحومہ کی جنت نشینی کے لئے دُعا کرتے ہیں۔

☆ ☆

Kashmir Treasures Collection, Srinagar

CC-0. In Public Domain. Digitized by eGangotri.

مکتوبات

مکرمی

آداب ۔ ۔

معبود حقیقی آپ کو افراد خانہ کے ہمراہ اپنی محافظت میں رکھے، آمین۔

''نگینہ'' کے تازہ شمارے (جولائی تا دسمبر) میں بنگلہ سے اُردو میں ترجمہ کردہ کہانی ''عورت کا دل'' (افسانہ نگار: بن پھول) شائع کرنے کا شکریہ۔ غور فرمائیں کہ یہ افسانہ طبع زاد نہیں ہے، لہٰذا آئندہ شمارے میں اس کی وضاحت فرمائیں، نوازش ہوگی۔ اُمید ہے کہ آپ عافیت سے ہوں گے۔

اخلاص کیش

نسیم عزیزی

☆

محترم وحشی سعید صاحب

سلام مسنون

گو میں رہا رہین ستم ہائے روزگار
لیکن ترے خیال سے غافل نہیں رہا

آپ کی جانب خاص نمبر موصول ہوتے رہے ہیں، لیکن رسید اور تاثرات ارسال کرنے کے بجائے فون سے ہی اطلاع دیتا رہا۔ دراصل خطوط لکھنے کی روایت ہی ختم ہوگئی۔ گذشتہ چند ماہ سے میں احباب کو خط لکھنے لگا ہوں۔ اگرچہ پوسٹ کارڈ تو اب مفقود ہی ہوگئے، سادہ لفافے بھی منزل مقصود تک نہیں پہنچ رہے ہیں۔ ہر ڈاک رجسٹر سے ارسال کرنے کی ہمت بھی نہیں ہوتی۔ اب چند کتب اور اسباق کے دو شمارے ارسال کر رہا ہوں، تو یہ خط بھی لکھ رہا ہوں۔ اس طرح میں نے خط لکھنے کا جو منصوبہ بنایا ہے اُس پر دھیرے دھیرے عمل کر رہا ہوں۔ قلم، کاغذ اور روشنائی کا تحفظ بھی ضروری ہے۔ آپ کی تحریر بھی دیکھنا چاہتا ہوں۔ دیکھئے کب دیدار ہوتا ہے ۔ ۔ !

''نگینہ'' اس بار موصول نہیں ہوا۔ شاید لاک ڈاؤن کی وجہ سے شائع نہ ہوا ہو، لیکن آپ جیسے باحوصلہ شخص سے یہی اُمید کی جاسکتی ہے کہ ہر حال میں شمارہ شائع کر کے ہی دم لیتے ہوں گے۔ ہمارے سامنے تو بہت سی مجبوریاں ہیں۔ رسالے کا چالیسواں سال شروع ہوگیا ہے۔ سالانہ رقم دینا تو اُردو والے بھول ہی گئے ہیں۔ اب گوشوں کی اشاعت پر ہی رسالے کا انحصار ہے۔

دُعا اور محبتوں کا منتظر

نذیر فتح پوری

☆

محترم وحشی سعید صاحب

السلام علیکم

اُمید ہے آں جناب کے مزاج بخیر ہوں گے۔ لاک ڈاؤن نے ذہن کو بھی ماؤف کر دیا ہے۔ ادھر کچھ راحت ہوئی تو کچھ غزلیں بھی ذہن سے برآمد ہوگئیں۔ ان ہی میں سے دو غزلیں ''نگینہ'' کے قارئین کے لئے ارسال کر رہا ہوں، اُمید ہے ''نگینہ'' میں جگہ پائیں گی۔ احباب کو سلام و پیام پہنچا دیں۔ اُمید ہے سبھی احباب شگفتہ ہوں گے۔

آپ کا اپنا

ذکی طارق

☆

Kashmir Treasures Collection, Srinagar

CC-0. In Public Domain. Digitized by eGangotri.

برادرِ گرامی محترم وحشی سعید صاحب

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

''نگینہ انٹرنیشنل'' نے اپنی مشمولات کے باعث اُردو جرائد کی صف میں ایک نمایاں حیثیت حاصل کرلی ہے۔ ''نگینہ'' کو یہ مقام وحشی سعید صاحب کی بے لوث خدمتِ ادب کی وجہ سے حاصل ہوا ہے۔ ''Covid - 19 اور ادب'' کے عنوان سے اس کا اداریہ انتہائی تاثر انگیز اور معلوماتی ہے۔ یہ شمارہ گوشہ مظفر ایرج پر مشتمل ہے۔ مظفر ایرج کشمیر کے ایک اہم غزل گو ممتاز شاعر ہیں جنہوں نے اپنی فکری صلاحیتوں کی بنا پر اپنی شناخت بنائی ہے۔ ان کے کئی شعری مجموعے منظر عام پر آکر مقبول ہوچکے ہیں۔ اس شمارے میں ان کی شاعری وشخصیت پر اُردو کے اہم دانشوروں کے مضامین شامل ہیں جو ان کی شاعرانہ شخصیت کو اُجاگر کرتے ہیں۔ ڈاکٹر اشرف آثاری کا مضمون ''مظفر ایرج عصر حاضر کی بصیرتوں کا شاعر'' خاصی اہمیت کا حامل ہے جس سے مظفر ایرج کی شعری بصیرتوں کی آگہی ہوتی ہے۔ ڈاکٹر کوثر رسول اور مشتاق عالم کے مضامین لائق مطالعہ ہیں جو ان کے شعری امکانات کو روشن کرتے ہیں۔ ''نگینہ'' کا یہ گوشہ ایک قابل قدر گوشہ ہے۔ یہ شمارہ اپنے مشمولات کے تحت ایک اہم شمارہ کی حیثیت رکھتا ہے جن میں مرزا محمد زماں آزردہ، سعید رحمانی، شارق عدیل، ڈاکٹر منصور خوشتر، عرفان عارف، ڈاکٹر شاہ، توصیف احمد ڈار اپنے متنوع موضوع اور اسالیب کے باعث اہمیت کے حامل ہیں۔ افسانوی حصہ بھی متوجہ کرتا ہے۔ نور شاہ، وحشی سعید، فاروق راہب، احمد رشید، شوبی زہرا نقوی، ڈاکٹر صفیہ بانو کے افسانے موضوع کی انفرادیت کے باعث متاثر کرتے ہیں۔ شعری حصہ میں عرش صہبائی، سیفی سرونجی، ڈاکٹر آفاق فاخری وغیرہ کی غزلیں توجہ مبذول کراتی ہیں۔ نظموں کا حصہ بھی پُرکشش ہے اور قابل مطالعہ ہے۔ تبصرے کا باب بھی بھرپور ہے، ڈاکٹر اشرف آثاری صاحب کی فنی بصیرت کا اظہار ہے۔ غرض کہ یہ شمارہ مجموعی اعتبار سے ادبی تازگی سے عبارت ہے۔

تازہ شمارے کے لئے ایک نعت اور ایک غزل ارسال کررہا ہوں۔ اُمید ہے کہ توجہ سے نوازیں گے۔ کانپور کے ایک افسانہ نگار اشفاق برادر نے عرصہ ہوا اپنا افسانوی مجموعہ ''مٹی کی مہک'' برائے تبصرہ ارسال کیا تھا، اس پر تبصرہ شامل نہیں ہے، اُمید ہے کہ توجہ فرمائیں گے۔

محترم حامدی کاشمیری صاحب نے اپنی سوانح حیات پر مشتمل ایک کتاب تصنیف کی تھی۔ اس سلسلے میں آپ سے کئی بار فون پر بات ہوئی۔ آپ نے کتاب ارسال کرنے کے لئے کہا، لیکن آپ کی مصروفیت کے باعث مجھے موصول نہ ہوسکی، ممکن ہو تو توجہ فرما کر ممنون فرمائیں۔ خدا کرے آپ معہ متعلقین بخیر ہوں گے۔ محترم ڈاکٹر اشرف آثاری اور مظفر ایرج صاحب کو سلام عرض کریں۔

خیر طلب

ظفر اقبال ظفر

☆

مدیر اعلیٰ جناب وحشی سعید

''بصد احترام آداب قبول فرمائیں۔ آپ نے ان نازک و نامساعد حالات میں بھی بلند پایہ واعلیٰ وارفع جریدے 'نگینہ' کو متواتر شائع کرنے اور مستزاد ادبی محفل کا انعقاد کرنے کی بابت صحیح واقعات کو نہ فقط رقم کیا ہے بلکہ اس کے علاوہ جناب نور شاہ کی پیش کردہ ''ادبی جھلکیاں'' وغیرہ کا اضافہ، ادارے کی بیشتر کارگزاریاں اور اس سے

Kashmir Treasures Collection, Srinagar

CC-0. In Public Domain. Digitized by eGangotri.

منسلک کارکنان، بالخصوص سربراہوں کے تئیں تمام قارئین شکر گزار ہیں اور مرزا غالبؔ کے اس ایک شعر کے یہ الفاظ اسی کے مصداق ٹھہرتے ہیں کہ ؎

آئینہ کیوں نہ دوں کہ تماشا کہیں جسے
ایسا کہاں سے لاؤں کہ تجھ سا کہیں جسے

اداریے میں مستعمل معدودے ان الفاظ کی بابت اس ناچیز کے یہ خیالات منقوشِ خاطر ہیں کہ اردو قواعد کے بموجب دو الفاظ کا مرکب کرتے وقت فقط اُسی ایک لفظ کو الگ یا پہلے نمبر پر درج کیا جاتا ہے، جس کا الگ سے کوئی معنی یا مطلب ہوا کرتا ہے۔ چونکہ 'کون' لفظ کا معنی بجائے خود صاف ہے، اس لیے اس کا تصرف الگ سے کر کے 'کون سا' لکھنا زیادہ صحیح تھا، نہ کہ صفحہ 3 پر 'کونسا' درج کرنا۔

اگلے صفحہ 4 پر دوسرا لفظ 'لوازمات' کا غلط استعمال بھی ملحوظِ خاطر ہے۔ جناب محمد مصطفیٰ خاں مدحؔ کیپے بہا معیاری لغت 'اردو ہندی شبد کوش' میں واضح طور پر یہ کہا گیا ہے کہ۔ ''لوازم' لفظ غلط ہے، لیکن اردو میں بولتے ہیں، بلکہ اسکا جمع لفظ 'لوازمات' بھی بنا لیتے ہیں، جو بالکل غلط ہے'' (صفحہ 593، اُتر پردیش ہندی سنستھان، لکھنؤ)

جموں کشمیر کے بلند پایہ ادیب جناب نور شاہ کا افسانہ زیرِ عنوان 'تب دوپہر تھی' مختصر ہونے کے باوصف ایک اعلیٰ تخلیق ثابت ہوئی ہے۔ یہ افسانہ نفسیاتی و فنتاسی ہیئت میں تخلیق ہوا ہے۔ یہ پے در پے مختلف احساسات کا ایک جاندار و شاندار مرقع ٹھہرتا ہے۔ اس کے تحت معدودے الفاظ کا اعادہ موسیقی کی لے سے آراستہ پیراستہ موضوع کے شانہ بشانہ چلتا رہتا ہے۔ ماضی کے تناظر میں چند تاثرات کسی شاعر کے اس شعر کی یاددہانی کرا جاتے ہیں کہ

یادِ ماضی عذاب ہے یارب ÷ چھین لے مجھ سے حافظہ میرا

مدیر اعلیٰ جناب وحشی سعید کا افسانہ 'وہ گھر کیسا ہوگا' دراصل والدین کی اپنی سنتانوں کی بابت بے پناہ محبت وانسیت کی ایک دل پذیر داستان ہے جو کہ ہمارے دل و ذہن کو از حد متاثر کرنے والی ہے۔ مستزاد، اس کا اختتام ہمیں اپنی موادی گہرائی و گیرائی کے ہی موجب بھی غور و خوض کرنے کی دعوت دیتا ہے۔ اس طرح ہم اس نتیجے کو اخذ کرتے ہیں کہ ہر ایک اعلیٰ وارفع تخلیق یا مجموعی طور پر ادب بھی وہی بہترین ہوا کرتا ہے، جو اپنے اختتام سے قارئین کو غور و خوض کرنے پر آمادہ کیا کرتا ہے۔

بطور استثنا افسانے میں معدودے چند اغلاط عجلت میں ہی چلے گئے ہیں، مثلاً اول سطر میں ہی ''پارینہ' لفظ کا غلط املا 'پارنیہ' منقوشِ خاطر ہے۔ اسی طرح صفحہ 87 پر 'جکڑا' لفظ کے بجائے 'جھگڑا' شائع ہو گیا ہے۔ اس سے آگے دو سطور کے بعد ہی 'بجھتے' فعل لفظ کے صحیح املا کی بجائے 'بھجتے' غلط املا درج ہو گیا ہے۔ اگرچہ عنوان بہت واجب یا موزوں نہیں ہے، تاہم 'گھر' اسم لفظ کا اعادہ ضرور معنی خیز ہوتا ہے۔

مشہور و معروف افسانہ نگار جناب محمد قمر سلیم کے افسانے 'رِشوَ ابھی جاگ رہی ہے' میں بابا کا اپنی ہی پوتی کے ساتھ زنا بالجبر کرنے کا راز کلائمیکس پر یکلخت وا ہوتا ہے اور یہ از حد اذیت ناک و شرمناک ہے۔ افسانے کا عنوان بھی غیر مناسب و غیر موزوں ٹھہرتا ہے۔ افسانے میں معدودے چند اغلاط چلے گئے ہیں مثلاً ص 102 پر ''فرآئے'' اور ''تو'' کی بجائے 'میں تو' الفاظ درکار تھے۔

صفحہ 9 پر مظفر ایرجؔ کی غزلوں سے وابستہ تبصرے کے آخر میں تبصرہ کار کے نام میں 'ترائین' کی بجائے 'نرائین' لفظ درکار تھا۔

آپ کا مرہونِ منت
ڈاکٹر کرشن بھاؤک

Kashmir Treasures Collection, Srinagar

CC-0. In Public Domain. Digitized by eGangotri.

محترم و معظم وحشی سعید صاحب

السلام علیکم ۔ ۔

آپ کے لئے ہزاروں نیک تمنائیں۔ اُمید ہے کہ آپ بخیر ہوں گے۔ ''نگینہ'' کا تازہ شمارہ دسمبر ۲۰۲۰ء موصول ہوا۔ مرحوم حکیم منظور صاحب کو آپ نے یاد کیا اور اُن کا گوشہ شائع کر کے عقیدت کے پھول نچھاور کردئے۔ بقول شاعر ۔

سب کو درکار ہے اِک روشنی شمع خلوص
صبح کبھی کی ہو یا شام صنم خانوں میں

نئے شمارے کے لئے تازہ ترین غزلیں حاضر خدمت ہیں۔

ضرر وصفی

☆

گرامی قدر وحشی سعید بھائی

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

''نگینہ'' کا تازہ شمارہ چند دن قبل موصول ہوا، انتہائی شکر گزار ہوں اس کرم فرمائی کے لئے۔ آپ نے میرے افسانچوں کو اخیر وقت یعنی جب رسالہ کو چھپنے کے لئے جانا تھا، شامل کرلیا۔ اس کے لئے بھی آپ کا بے حد ممنون ہوں۔ مجھ پر شائع کتاب پر تبصرہ بھی شامل کرلیا۔ گویا یہ شمارہ میرے لئے بہت وقیع ہوگیا۔ یوں تو ''نگینہ'' کا ہر شمارہ وقیع ہوتا ہے لیکن اس بار کا شمارہ میرے لئے خاص الخاص ہوگیا۔ اللہ آپ کو، نور شاہ بھائی اور ڈاکٹر اشرف آثاری بھائی کو اور ادارے کے سبھی ارکان کو سلامت رکھے۔ آپ لوگ جس خلوص، لگن اور محنت سے رسالہ کو زندہ رکھے ہوئے ہیں، اُردو ادب کی تاریخ آپ لوگوں کی خدمات کو فراموش نہیں کرسکتی۔

مرحوم حکیم منظور پر گوشہ، مظفر ایرج کے گوشے کی طرح تشنہ رہا۔ کچھ اور مضامین کی شمولیت ہونا چاہئے تھی۔ کشمیر کے باہر کے لوگ توجہ نہیں دیتے تو کیا ہوا، کشمیر میں لکھنے والوں کی کمی تو نہیں ہے۔ افسانوں میں سب سے جاندار افسانہ بشیر مالیر کوٹلوی کا ''گہری سازش'' رہا۔ بہت متاثر کیا اس افسانے نے۔ چونکا دینے والا کلائمکس ہے۔ میری طرف سے بشیر صاحب کو مبارک باد! آپ کے دوست اور مداح ڈاکٹر شاہد جمیل (پٹنہ) کے افسانوں کے مجموعے ''ابابیل کی ہجرت'' پر ایک مضمون آپ کی خدمت میں ارسال ہے، مناسب سمجھیں تو کسی قریبی شمارے میں شامل فرمالیں۔

''نگینہ'' فیملی کے سبھی ارکان کو سلام عرض ہے، خصوصاً نور شاہ، مظفر ایرج اور اشرف آثاری صاحبان کو۔ اللہ کرے آپ سبھی مع الخیر ہوں۔ جواب کا منتظر رہوں گا۔

خیر اندیش

رومانی

☆

قابل قدر و احترام

محترم وحشی سعید صاحب

السلام علیکم

خدا کرے آپ اپنی سوچوں کی طرح ہی اچھے ہوں۔ اللہ کا شکر ہے کہ آپ کے ساتھ جو کتاب لکھنے کا وعدہ کیا تھا، وہ آج پورا ہوگیا۔ یہ کتاب میں نے جس طرح ترتیب دی ہے، اگر اسی طرح شائع کرائیں گے تو آپ کی شخصیت اور فکشن کے حوالے سے یہ کتاب بڑی اہمیت کی حامل ہوگی۔ اس میں پانچ افسانوں کے تجزیات پرانے ہیں، جب وہ نغمہ

Kashmir Treasures Collection, Srinagar

CC-0. In Public Domain. Digitized by eGangotri.

چھیڑتی ہے، شہنشاہ قاتل تلوار، چور پولیس، سستا لہو۔ افسانے چور پولیس اور سستا لہو کے تجزیات میں کچھ لفظی تبدیلی کی گئی ہے اور سستا لہو کے تجزیے کو تو دوبارہ ہی لکھا ہے۔ جب مذکورہ پانچوں تجزیات میں نے لکھے تھے، تبھی کتاب لکھنے کا ارادہ کر لیا تھا۔ دو مضامین ۔ ۔ وحشی سعید ایک منفرد فکشن نگار، وحشی سعید اور نگینہ کے چند اداریے، یہ دونوں مضامین بھی کتاب میں شامل ہونا ضروری ہیں، باقی چھ افسانوں کے تجزیات تازہ ترین ہیں یعنی مجرم، کالا، وہ گھر کیسا ہوگا، سب غلط ہے سب ٹھیک ہے، دھن نہ دے، یہ تہذیب یافتہ لوگ۔ افسانوی مضامین میں ۔ ۔ کنوارے الفاظ کا جزیرہ'' کا تجزیاتی مطالعہ پیش کیا ہے۔ ناول پتھر پتھر آئینہ پر گفتگو کی ہے۔ ان تمام مضامین اور تجزیات کا آپ معالعہ کر لیجئے، انشاء اللہ کتاب آپ کو مایوس نہیں کرے گی۔ اس میں تنقید کا رنگ بھی ہے۔ اور کیا لکھوں، سب بہتر ہے۔ کتاب ملنے پر رسید سے نوازئے گا۔ خاکسار نے ایک مضمون روانہ کیا تھا جسے آپ نے پڑھ بھی لیا تھا، اس کو آنے والے شمارے میں شامل کر لیں تو کرم ہوگا۔

''نگینہ'' کا تازہ شمارہ مل گیا ہے،

شکریہ!

شارق عدیل

☆

جناب وحشی سعید صاحب!

''نگینہ'' کے لئے آپ نے ناچیز کو یاد رکھا، تو دل سے ممنون ہوں۔ واقعہ یہ ہے کہ آپ نے مشاہیر قلم کاروں کی ایک کہکشاں سجا رکھی ہے۔ صرف وادی کے ستارے ہی نہیں بلکہ باہر کی قوس قزح بھی ''نگینہ'' کے ادبی شبستان میں اپنا رنگ بکھیر رہی ہے۔ بلاشبہ آپ کے خلوص اور ''نگینہ'' ٹیم کی محنت و لگن نے رسالے کے معیار کو بلندی عطا کی ہے۔ اس خدمت کے لئے دل سے دُعا۔

مخلص ۔ ۔ !

احمد کلیم فیض پوری

8208111109

☆

محترمی و مکرمی

السلام علیکم

اُمید ہے آپ بخیر و عافیت ہوں گے۔ ''نگینہ انٹرنیشنل'' کا تازہ شمارہ موصول ہوا، دل کی گہرائیوں سے شکر گزار ہوں۔ اداریہ ''افسانے کی تنقید میں'' پسند آیا۔ ڈاکٹر اشرف آثاری کی نعتیں بہت خوب ہیں۔ قند مکرر کے تحت حکیم منظور صاحب کی تحریر کیا خوب ہے۔ ''مرحوم حکیم منظور کی یاد میں'' مضمون بقلم ڈاکٹر اشرف آثاری بہت اچھا لگا۔ اس مضمون میں قدرت اللہ شہاب کی خودنوشت کا نام حیات نامہ تحریر کیا ہے۔ یہ دراصل ''شہاب نامہ'' ہے۔ ڈاکٹر نکہت نذر کا ''حکیم منظور بحیثیت صحافی'' پسند آیا۔ اس میں بشیر بدر کا مشہور شعر اس طرح ہونا چاہئے ۔

دشمنی جم کر کرو لیکن یہ گنجائش رہے
جب بھی ہم دوست ہو جائیں تو شرمندہ نہ ہوں

میرا مضمون ''احمد فراز۔ شخص اور شاعر'' میں تاریخ ۱۶/اگست ۱۹۴۸ء شائع ہو گیا ہے، اسے ۱۹۸۴ء ہونا چاہئے۔ سلیمہ ہاشمی نے اپنے والد فیض احمد فیض کے تعلق سے جو تاثرات قلم بند کئے ہیں وہ اچھے اور سچے ہیں۔ ''نگینہ ادب نمبر ایک نظر میں'' سہیل سالم کی تحریر خوب پسند آئی۔

Kashmir Treasures Collection, Srinagar

CC-0. In Public Domain. Digitized by eGangotri.

انشائیہ کے تحت پروفیسر محمد زماں آزردہ کی تحریر ''واپسی'' اچھی لگی۔ موصوف سے ''ایوان غالب'' دلی کے مشاعرہ میں دو ایک بار شرف نیاز حاصل ہوا ہے۔ افسانہ ''بدن'' نہایت معیاری اور دلچسپ ہے۔ آپ کا افسانہ ''انوکھے شہر کا سفید گھوڑا'' کیا خوب ہے۔ دیگر افسانے پُرکشش اور وقیع ہیں۔

غزلیات کا جواب نہیں۔ ''ادبی جھلکیاں'' کی تحریر میں رنگا رنگی ہے۔ ڈاکٹر اشرف آثاری کے تبصرے بہت اچھے ہوتے ہیں۔

ڈاکٹر آفاق فاخری

☆

آپ کی کہانی ''یہ کیسے رشتے ۔ ۔ ؟'' ابھی ابھی پڑھی۔ اپنے یہاں تو یہ ہر گھر کا المیہ ہے۔ خود غرض اولاد اور بے بس، مجبور مگر شفقت اور محبت سے بھرے والدین ۔ ۔ درد بھری کہانی ہے۔ دل اُداس کر گئی۔ میری جانب سے مبارک باد قبول کریں۔

رینو بہل

اپنے بچوں کو اُردو سیکھنے کی ترغیب دیں۔
اُنہیں اُردو اخبارات کا مطالعہ کرنے اور مختلف
رسائل پڑھنے کی عادت ڈالیں۔
کیونکہ ۔ ۔
اُردو ایک ایسی زبان ہے
جس سے ادب ٹپکتا ہے۔

فارم نمبر 4 کے تحت ضابطہ نمبر 8

مقام اشاعت : سرینگر، کشمیر

نوعیت اشاعت : چھ ماہی

نام پرنٹر، پبلشر : وحشی سعید

قومیت : ہندوستانی

پتہ : پوش، کرن نگر، سرینگر

190010

نام مدیر : وحشی سعید

قومیت : ہندوستانی

پتہ : پوش، کرن نگر، سرینگر

190010

میں تصدیق کرتا ہوں کہ جو معلومات اوپر دی گئی ہیں، وہ میرے علم و یقین کے تحت درست ہیں۔

۔ ۔ ایڈیٹر

☆ ☆

Kashmir Treasures Collection, Srinagar

CC-0. In Public Domain. Digitized by eGangotri.

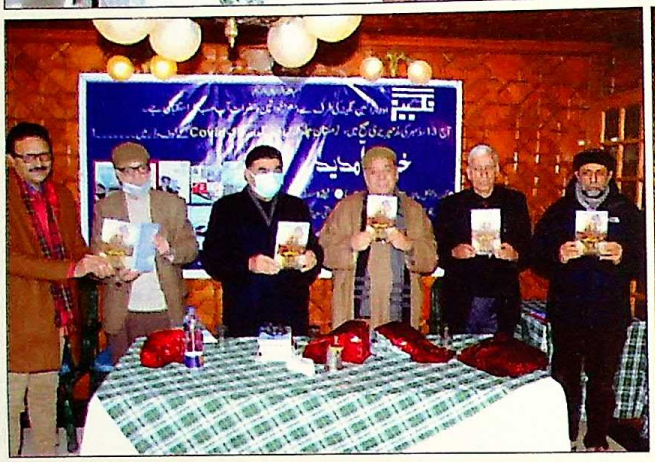

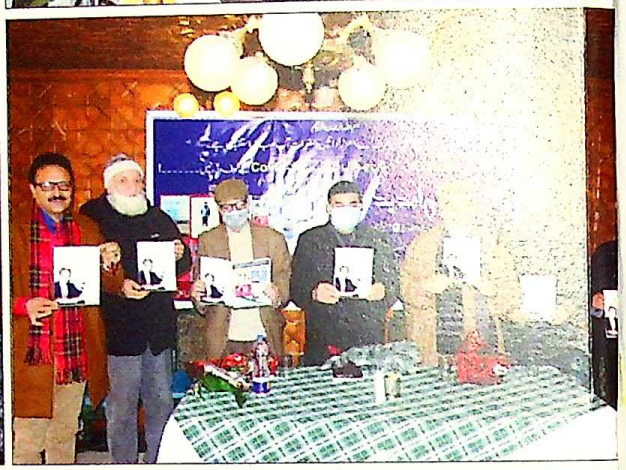

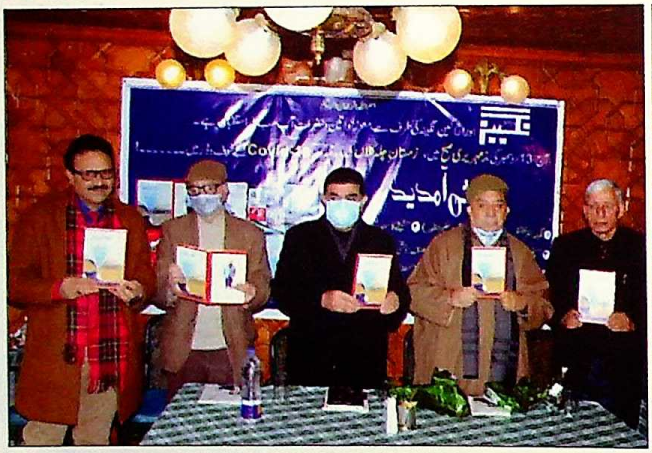

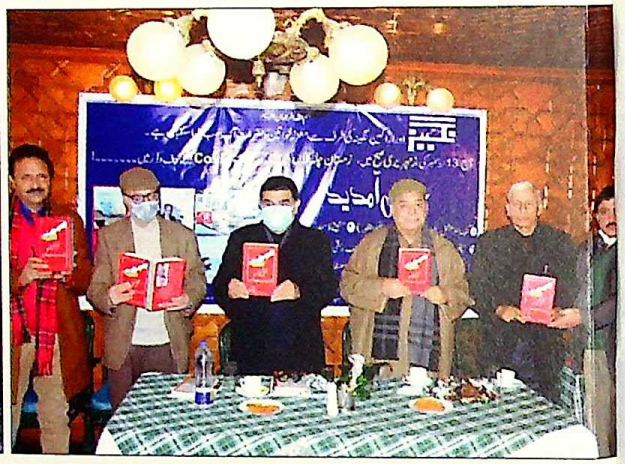

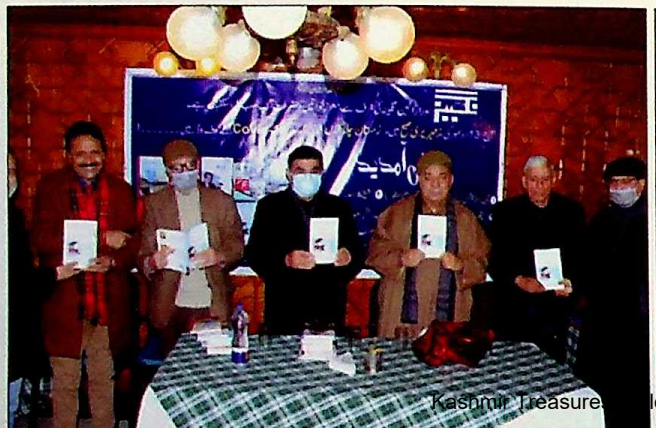

Kashmir Treasures Collection Srinagar

CC-0. In Public Domain. Digitized by eGangotri.

The NAGINA urdu magazine HO: Karan Nagar, Srinagar, Kashmir 190010
Subscription and correspondence office: C/O Hotel Shahenshah Palace, Boulevard, Srinagar Kashmir -190001
JAN-JUNE 2021
R.N.NO.16253/68

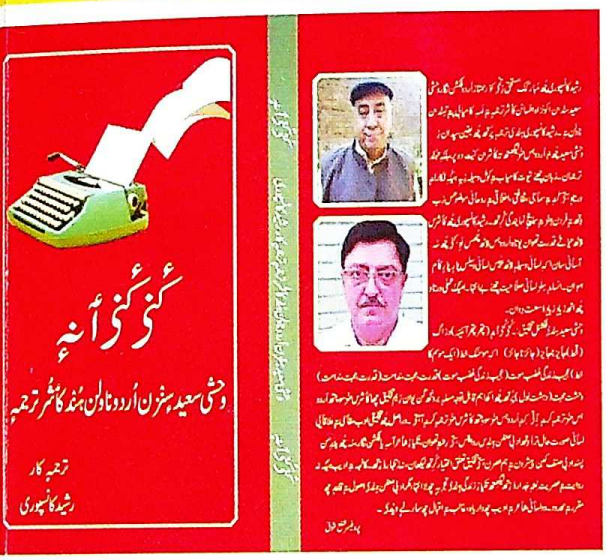

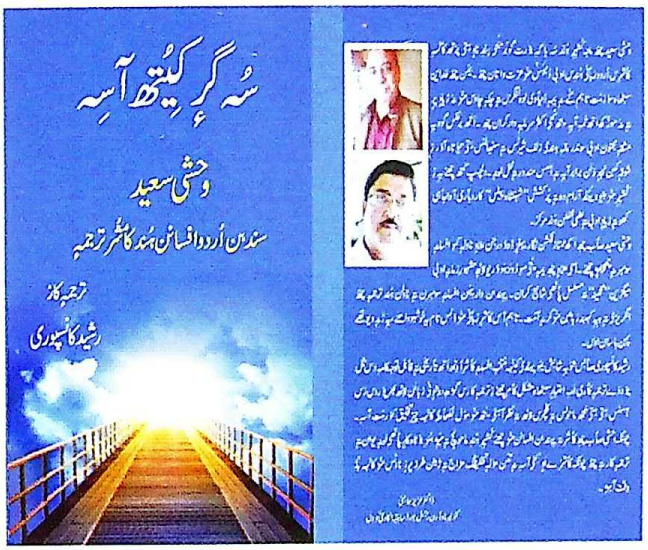

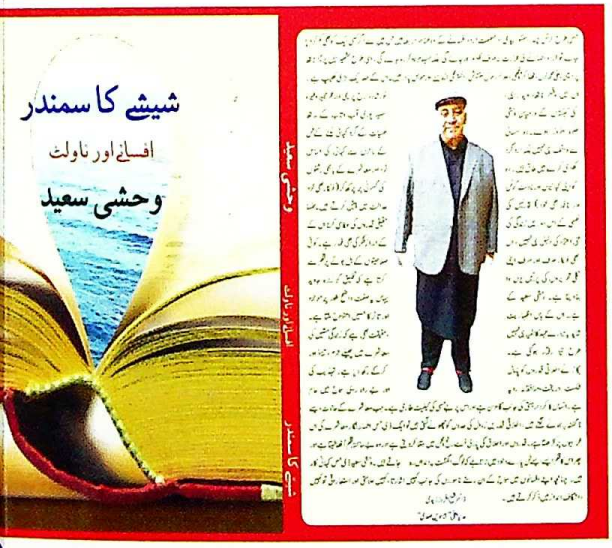

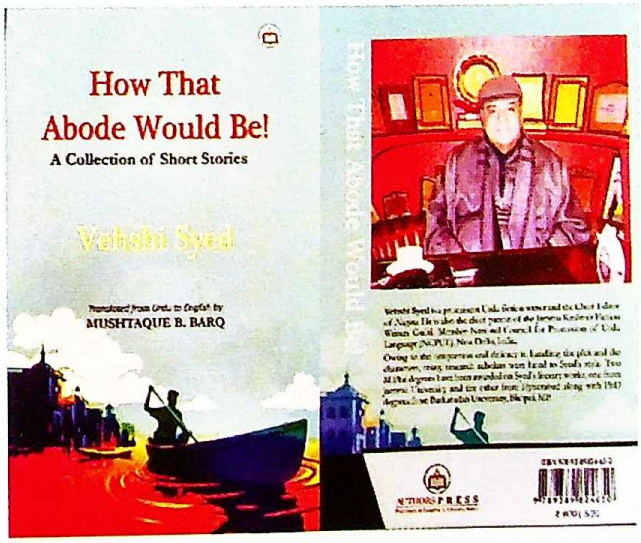

میزان پبلی شرز اینڈ ڈسٹری بیوٹرس بالمقابل فائر اینڈ ایمرجنسی
سروسز ہیڈ کوارٹرز بٹہ مالو، سرینگر ۱۹۰۰۰۹ (کشمیر)

Kashmir Treasures Collection, Srinagar